اُردو شیرازہ

گوشۂ رحمان راہیؔ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

شیرازہ

گوشۂ رحمٰن راہیؔ

Volume: 61 Number: 9 - 10

ISSN: 22779833

Urdu Sheeraza

Volume: 61 Number: 9 - 10

Gosha - e - Rehman Rahi

Jammu & Kashmir
Academy of Art, Culture and Languages

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

نگراں : بھرت سنگھ منہاس

مدیر : محمد سلیم سالکؔ

معاون مدیر : سلیم ساغرؔ

معاون : ڈاکٹر محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
کمپیوٹر کمپوزنگ/سرورق : امتیاز شرقی، انور لولابی
سال اشاعت : جلد: 61، شمارہ: 10-9 (ستمبر/اکتوبر 2023)
قیمت : 100 روپے
ISSN نمبر : 2277-9833

"شیرازہ" میں جو مشمولات شامل ہوتی ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی کا کُلاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔ (ادارہ)

●...... خط و کتابت کا پتہ:
مدیر "شیرازہ" اردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سرینگر / جموں
ای میل: sherazaurdu@gmail.com

فہرست

۱	گفتگو بند نہ ہو!	محمد سلیم سالک	۵
●	گوشۂ رحمان راہی (**مضامین**)		
۲	رحمان راہی: ماہ وسال کے آئینے میں	فاروق شاہین	۹
۳	رحمان راہی: کشمیری شاعری کا وستورون	محمد یوسف ٹینگ	۱۳
۴	رحمان راہی: شاعرِ کائنات	غلام نبی خیال	۲۲
۵	رحمان راہی: ایسا کہاں سے لاؤں!!	پروفیسر شفیع شوق	۲۹
۶	رحمان راہی: کشمیری شعری روایات کا علم بردار	پروفیسر قدوس جاوید	۳۹
۷	رحمان راہی: بلند قامت شاعر وشخصیت	پروفیسر شاد رمضان	۴۹
۸	رحمان راہی کی نظمیں: کچھ بنیادی باتیں	پروفیسر مجروح رشید	۶۴
۹	رحمان راہی اور جدید مغربی شعریات	ڈاکٹر مفتی مدثر فاروقی	۷۲
۱۰	رحمان راہی: میرے مشفق استاد	پروفیسر رتن لال تلاشی	۸۷
۱۱	رحمان راہی: منفرد اسلوب کا شاعر	پروفیسر شاد رمضان	۹۷
۱۲	رحمان راہی کی تنقیدی بصیرت	ڈاکٹر آفاق عزیز	۱۰۹
۱۳	کہوٹ: کشمیری تنقید کا منفرد کارنامہ	ڈاکٹر شفقت الطاف	۱۱۷
۱۴	رحمان راہی: تخیل وتفکر کا شاعر	ڈاکٹر عابد احمد	۱۳۲
۱۵	رحمان راہی: کاروان ادب کے سرخیل	محی الدین ریشی	۱۴۵
۱۶	اپنے ہم عصروں میں یوں ممتاز تھے بے قیل وقال	سید سعد الدین سعدی	۱۵۱
۱۷	رحمان راہی کی مٹھی بھر کشمیری نظموں کا ترجمہ	ڈاکٹر ستیش ول	۱۵۳

۱۸ **سفرنامہ**

داستانِ گلستان (قسط3)	ڈاکٹر عرفان عالم	۷۷

۱۹ **غزلیات** ۲۵۵

رفیق رازؔ، شہپر رسولؔ، احمد رئیسؔ، راہی گُلؔ، عادل حیاتؔ،
شیخ الطاف عیابؔ، مصروفہ قادرؔ، ممتاز احمد ممتازؔ

۲۰ **نظمیں** ۲۶۸

قیصر زماںؔ، غضنفر علیؔ، سدرہ سحر عمرانؔ، اخلاق آہنؔ،
طارق علی رضاؔ، سلیم فگار

افسانے

۲۱	میرے لہو کی کہانی	نور شاہ	۲۸۱
۲۲	زندگی افسانہ نہیں	سلام بن رزاق	۲۸۵
۲۳	حریف	سلیم سرفراز	۳۰۳
۲۴	ممکناتِ دشتِ حیراں	ناصر ضمیر	۳۱۳

● **تبصرۂ کتب**

۲۵	اکیسویں صدی میں اردو ناول	مبصر: ڈاکٹر ریاض توحیدی	۳۲۶
۲۶	ادبی مطالعے	مبصر: ڈاکٹر اشرف لون	۳۳۱
۲۷	نئی سحر (ناول)	مبصر: ڈاکٹر محمد یاسین گنائی	۳۳۶

☆☆☆

گفتگو بند نہ ہو!

کشمیری زبان کی ادبی تاریخ لل دید (1320-1392) سے رحمٰن رہی (1925-2023) تک سات صدیوں کومحیط ہے۔ان سات صدیوں میں کشمیری ادب ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے کئی اہم مراحل سے گزرتا رہا۔ یہ کشمیری زبان کی خوش بختی رہی ہے کہ آغاز ہی میں لل دیداور شیخ العالم جیسی عبقری شخصیات ملیں جن کے کلام سے اندازہ ہوتاہے کہ اس زمانے میں کشمیری شاعری کوعروج حاصل رہا ہوگا، کیونکہ لل دید کے واکھ اور شیخ العالم کے شروکھ اتنے معیاری ہیں کہ کسی بھی طرح سے یہ کلام کشمیری شاعری کے ابتدائی زمانہ کانہیں لگتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان سے پہلے بھی کشمیر میں شعروشاعری کی روایت یقیناً موجود رہی ہوگی جس کی تحقیقی نقطہ نگاہ سے دریافت کرنا ابھی باقی ہے۔اتنے شاندار پڑاؤ تک آنے کے بعد اچانک ایک صدی سے زائد عرصہ تک کشمیری شاعری منصۂ شہود سے غائب رہتی ہے اوراس کا دور دور تک کوئی تذکرہ نہیں ملتا اور پھر سولہویں صدی کے نصف کے بعد کشمیری شاعرہ حبہ خاتون (1554-1609) کی شاعری کا ڈنکا بجنے لگتا ہے۔ یہاں سے کشمیری شاعری کا دوسرا پڑاؤ شروع ہوتا ہے، جس میں موضوعاتی طور پر ہجر و وصال کے معاملے نظر آتے ہیں اور صنفی طور پر ''وژن'' کا چلن عام ہوتا ہے۔کشمیری شاعری کا تیسرا پڑاؤ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔جس میں فارسی زبان وادب کا براہ راست اثر ونفوذ ملتا ہے۔اس دور میں فارسی مثنوی نگاروں کی تقلید کرتے ہوئے کئی مثنوی گوسامنے آئے جن میں محمود

گامی، میر محی الدین مسکینؔ، مقبولؔ شاہ کرالہ واری اور ولی اللہ متو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہاں یہ تذکرہ بھی قابل غور ہے کہ اسی دور میں کشمیری شاعری کا ایک نیا عہد شروع ہوتا ہے جسے ہم ''صوفی شاعری'' کے عہد سے موسوم کرتے ہیں۔اس دور میں شاہ قلندر، مومن صاحب، سوچھ کرال، مقبول امرتسری، رحمٰن ڈار، شمس فقیر، وہاب کھار، وازہ محمود، صمد میر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔صوفی شاعری کا یہ زریں دور شاہ قلندر سے احد زرگر تک بڑی آب وتاب کے ساتھ جاری رہتا ہے اور ادبی تاریخ کا ایک سنہری باب قرار پاتا ہے جس کی اثر پذیری کا یہ عالم ہے کہ ابھی بھی صوفی شاعری کا مزاج مقامی شعرا کی تخلیقات میں پایا جاتا ہے اور عوام میں اس کو حد درجہ مقبولیت حاصل ہے۔

پوری دنیا میں بیسویں صدی کے آغاز ہی سے بہت تبدیلیاں معرض وجود میں آئیں جن کے پس پردہ فکر وفلسفہ کے مختلف نظریات نے اہم کردار ادا کیا۔ ہمارے یہاں بھی ان فلسفی نظریات کے اثرات زندگی کے تمام شعبہ جات کے ساتھ ساتھ علم و ادب پر بھی پڑا۔ یہاں تک کہ ہمارے دانشور اور تخلیق کار بھی مغربی نظریات سے متاثر ہوکر شعر وسخن کی زلفیں سنوارنے میں منہمک ہوگئے، جس کو ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔۔اس طرح کشمیری شاعری میں ایک نئے پڑاؤ کا آغاز ہوا جس کی ابتداء مہجورؔ اور آزادؔ نے کی اور بعد ازاں اس کارواں میں میر غلام رسول نازکی، مرزا عارفؔ، دینا ناتھ نادمؔ، امین کاملؔ، غلام نبی خیالؔ، غلام نبی فراقؔ اور پروفیسر رحمٰن راہیؔ بھی شامل ہوگئے۔متذکرہ بالا شعراء نے انگریزی ادب کا خوب مطالعہ کیا تھا اس لئے ان میں فلسفی نظریات کو تخلیقی جامہ پہنانے کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔اس دور میں جو نمایاں شعرا کشمیری شاعری کے حوالے سے عروج کی منزلیں طے کرنے میں پیش پیش رہے، ان میں پروفیسر رحمٰن راہیؔ سرفہرست ہیں۔

پروفیسر رحمان راہی نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز اردو شاعری سے کیا لیکن ان کو

بہت جلد اس بات کا احساس ہوگیا کہ ایک تخلیق کار اپنی مادری زبان میں ہی اپنے مافی ضمیر کا بھر پور اظہار کر سکتا ہے۔ کشمیری شعری روایت کی پاسداری کرتے ہوئے انہوں نے مشرقی و مغربی شعریات کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا، جس سے ان کی شاعری میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی۔ راہیؔ مرحوم کی 'نوروزِ صبا'' سے ''سیاہ رود جرین منز'' تک کی شاعری پڑھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے لئے ایک منفرد راہ اختیار کی ہے۔ راہیؔ مرحوم کشمیر کے واحد ایسے شاعر ہیں جن کو زندگی ہی میں بہت پذیرائی ملی۔ انہیں ملک کے سب سے بڑے ایوارڈ ''گیان پیٹھ'' سے نوازا گیا، ساتھ ہی پدم شری اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی دیئے گئے اور مقامی سطح پر کلچرل اکادمی ایوارڈ اور ''شرفِ ثقافت'' جیسے موقر اعزازات سے بھی سرفراز کیا گیا۔

جنوری 2023 میں پروفیسر رحمٰن راہی کی وفات کے بعد اکادمی کے سیکریٹری جناب بھرت سنگھ منہاس صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ شیرازہ اردو میں پروفیسر رحمان راہی کے متعلق ایک یادگاری گوشہ شامل کیا جائے۔ ہم شکرگزار ہیں ان تمام قلم کاروں کے جنھوں نے پروفیسر راہیؔ کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے ہمیں اپنے مضامین سے نوازا اور ساتھ ہی ہم ان ترجمہ نگاروں کے بھی شکرگزار جنھوں نے دیگر زبانوں میں لکھے مضامین کا شستہ اور سلیس انداز میں ترجمہ کرکے اردو قارئین تک راہیؔ مرحوم کا کلام پہچانے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا۔ شمارہ میں ''گوشۂ رحمان راہیؔ'' کے علاوہ دیگر مشمولات بھی ہیں جن میں سفرنامہ، منظومات، افسانے اور تبصرے قابلِ ذکر ہیں۔

اس شمارے کی ترتیب و تہذیب میں جناب سلیم ساغرؔ (اسسٹنٹ ایڈیٹر، شیرازہ)، ڈاکٹر محمد اقبال لون (ریسرچ اسسٹنٹ)، محمد انور لولابی اور امتیاز احمد شرقی نے بڑی محنت سے مواد جمع کیا اور اسے سلیقہ سے ترتیب دینے میں معاونت کی، جس کے لئے

یہ سب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ قارئین حسب سابق شمارے کی مشمولات پسند فرما کر اپنے تاثرات سے ضرور نوازیں گی۔

محمد سلیم سالکؔ
مدیر ''شیرازہ اردو''

☆☆☆

فاروق شاہین......

پروفیسر رحمان راہی: ماہ وسال کے آئینے میں

نام　:　عبدالرحمان میر

قلمی نام　:　رحمان راہی

والد کا نام　:　غلام محمد میر

والدہ کا نام:　راحت بیگم

تاریخ پیدائش:　6 مئی 1025ء

مقامِ پیدائش:　مہاراج گنج، محلّہ وازہ پورہ، سرینگر

تعلیم　:

- ...... میٹرک اسلامیہ ہائی سکول، راجوری کدل
- ...... ایف اے (دوسال) سری پرتاپ کالج، سرینگر
- ...... بی اے (تین سال) امر سنگھ کالج، سرینگر
- ...... ایم اے فارسی　یونیورسٹی آف کشمیر
- ...... ایم اے انگلش　یونیورسٹی آف کشمیر

ملازمت:

- ...... استاد (اسلامیہ ہائی سکول راجوری کدل زیر اہتمام انجمن)

- ...... استاد(نصرت الاسلام جموں وکشمیر)1951-1953
- ...... کلرک پبلک ورکس ڈپاٹمنٹ (بارہ مولہ میں تعینات ہوئے)
- ...... لیکچرر فارسی اور اردو (جموں، سرینگر، سوپور (1950ء سے قبل)
- ...... لیکچرر فارسی، شعبہ فارسی کشمیر یونیورسٹی (1962)
- ...... سینئر فیلوشپ (ریسرچ سیل فار کشمیری لینگوئج)
- ...... سربراہ شعبۂ کشمیری یونیورسٹی آف کشمیر (1976-1985)
- ...... سبکدوشی بحیثیت پروفیسر 1984ء

شادی : گھر جنت زرینہ بیگم

اولادیں :

- ...... ڈاکٹر جاوید میر
- ...... ڈاکٹر فرہاد میر
- ...... ڈاکٹر دلدار میر
- ...... نگہت نوشین

علمی اداروں سے وابستگی:

- ...... ممبر کمنسٹ پارٹی آف کشمیر (کلچرل ونگ) طالب علمی کے وقت
- ...... ممبر ترقی پسند مصنفین ایسوسیشن
- ...... ممبر کلچرل فرنٹ
- ...... ممبر کلچرل کانگریس
- ...... ممبر کلچرل کانفرنس
- ...... ممبر حلقہ علم وادب خانیار
- ...... فنکار کلچرل آرگنائزیشن (صدر 1984-2023)

ادارت :

- ...... کونگ پوش
- ...... روزنامہ خدمت (اخبار)
- ...... روزنامہ آج کل (ایڈیٹوریل بورڈ) 1953-1955

انعامات واعزازات:

- ...... ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ (نوروزِ صبا) 1961
- ...... بیسٹ بک ایوارڈ (کہوٹ)
- ...... پدم شری 2000
- ...... ساہتیہ اکاڈمی فیلوشپ 2000
- ...... سنٹر آف ہیومن رسورس ڈیولپمنٹ (امتیازی وظیفہ)
- ...... آل انڈیا رایٹرس کانفرنس
- ...... ہندی ورلڈ سمیلن ایوارڈ
- ...... راشٹریا کبیر سمان ایوارڈ 2003
- ...... بین الاقوامی امریکی کاٹھواری فونڈیشن ایوارڈ
- ...... اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (ڈاکٹر آف لیٹرس Phd)
- ...... اعزازی ڈگری 2008
- ...... گیان پیٹھ ایوارڈ 2004، جو 2007 میں انھیں دیا گیا۔
- ...... پروفیسر آف ایمرٹس... یونیورسٹی آف کشمیر
- ...... شرف کمراز: ادبی مرکز کمراز جموں وکشمیر 8 اگست 2004
- ...... شرف ثقافت: جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آرٹ، کلچر اینڈ لینگوئجز۔

تصانیف :

- ...... سنہٕ وُنی ساز (شاعری)1952
- ...... صبحک سودا (شاعری)1954
- ...... کلامِ راہی (شاعری)
- ...... نوروزِ صبا (شاعری)1958
- ...... کہوٹ (تنقید)1979
- ...... أزچ کأشرشاعری (انہار): ترتیب رحمان راہیؔ، شفیع شوق 1987
- ...... یمہ سانی آلو۔ ترتیب: غلام نبی فراقؔ، رحمان راہیؔ
- ...... سنگلاب : ترتیب: غلام نبی فراقؔ، رحمان راہیؔ 1983
- ...... بابافرید (ترجمہ)
- ...... سبع معلقات
- ...... شہہ رگ وأیتھ (شاعری)1972
- ...... سیاہ رۄد جرین منز (شاعری)1997
- ...... شارشنأسی (تنقید)2004
- ...... کٔدلہٕ ٹھٔٹھِس پیٹھ (شاعری)2013
- ...... کأشروزنک صورتحال (تنقید)

تاریخ وفات: 9 جنوری 2023

مدفن : ویڑارناگ نوشہرہ سرینگر

☆☆☆

......محمد یوسف ٹینگ

رحمٰن راہیؔ......کشمیری شاعری کا وُستورَن

(چند یادیں، چند باتیں)

مجنوں نہ دشت میں ہے نہ فرہاد کوہ میں
تھا جن سے لُطفِ زندگی وے یار مر گئے

پروفیسر رحمٰن راہیؔ کشمیر میں ادب و ثقافت کے میدان میں سب سے زیادہ اعزازات اورانعامات سے پیراستہ بالا قامت ادیب ہیں اور یہ صرف عصری زمانے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ کشمیر کی طویل تاریخ کے متعلق بھی دُرست ہے۔ساہتیہ اکادمی ایوارڈ تو اُنہیں بہت پہلے 1959ء میں ملا تھا اور اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا ہے تو یہ کشمیری ادب کی کسی کتاب کے لئے ماسٹر زندہ کول اور اختر محی الدین کے بعد ایسا تیسرا ایوارڈ تھا جو اُن کے ایک ابتدائی مجموعہ کلام ''نوروز صبا'' کو ملا تھا۔اُن کی قریب قریب ہر شائع ہونے والی کتاب کے لئے مقامی کلچرل اکادمی نے اُنہیں متعدد اِنعامات سے نوازا۔اُنہیں جموں وکشمیر سرکار نے اپنے سٹیٹ ایوارڈ سے بھی نوازا۔بعد میں اُنہیں ہندوستان کا سب سے گراں قدر اور ادبی انعام گیان پیٹھ بھی عطا کیا گیا، جس کو دیسی نوبل پرائز قرار دیا جاتا ہے اور وہ صرف اب تک اِس ایوارڈ سے سرفراز ہونے والے واحد کشمیری ادیب ہیں۔حالانکہ کنڑ زبان کو اب تک ایسے نو سے زائد ایوارڈ کی متاع حاصل ہوئی جبکہ ملیالم کو پانچ۔

راہیؔ صاحب کی وجاہت کشمیری زبان تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ وہ بہت عرصے تک ہندوستان کے واحد مرکزی سرکار کے رسالے ''آج کل'' کے بھی اعزازی مدیر نامزد کئے گئے اور اِس پراُن کا نام اس حیثیت سے چھپتا رہا۔ اس کے علاوہ وہ اب تک واحد کشمیری ادیب ہیں، جنہیں مرکزی ساہتیہ اکادمی کی فیلوشپ کا تمغۂ امتیاز حاصل ہوا۔ انہیں پنجاب کی ادبی انجمنوں کے بھی اعزاز حاصل ہوئے۔ مدھیہ پردیش کے ادب نواز دارالخلافہ بھوپال میں بھی اُن کی قدرافزائی کی گئی اور وہاں اُن کو جن طغرات سے سنوارا گیا اُن کی آگہی بہت کم لوگوں کو ہے مگر وہ اُن کی اکلوتی بیٹی نوشین کی تحویل میں ہیں۔ اُمید ہے کہ جب کبھی وہ ان کی نمائش کریں گی، تو راہیؔ کے قدردانوں کی آنکھیں خیرہ ہوجائیں گی۔ کشمیر کی کوئی ایسی قابلِ ذکرادبی تنظیم نہیں ہے جس نے اُن کی تعظیم میں اُنہیں ایوارڈ نہیں دیئے۔

اعزازات کی بات پہلے آئی کہ ان کی اپنی عطا کے لئے اُن کی کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں، جن پر اب تک تھوڑا بہت لکھا گیا ہے لیکن میرے خیال میں برسوں آگے تک ان پر بہت کچھ اور لکھا جائے گا۔ اعزازات تو ٹھیک ہیں لیکن اُن کا اصل امتیاز اور حاصل اُن کا تخلیقی اور تحقیقی سرمایہ ہے جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ انہوں نے کشمیری شاعری کو بلا شبہ ایک نئی جہت اور ہئیت عطا کی۔ لیکن اُنہوں نے تنقید و تحقیق کو بھی ہمہ رنگ جامعیت بخشی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے زمانے میں کشمیری زبان کے سب سے اعلیٰ مُدرّس تھے اور اُنہیں کشمیر یونیورسٹی کے شعبے کی ابتدا کرنے کی نہ سہی مگر اِسے اُستوار کرنے اور نِکھارنے کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے اس کو کشمیری ادب کی نشر واشاعت کا بھی ایک قابلِ لحاظ مرکز بنایا۔ وہ خود کشمیری زبان کو اِس کا اصل حق اور مرتبہ دِلانے کی جدوجہد میں بھی پیش پیش رہے۔

عبد الرحمٰن میر جو بعد میں راہیؔ کے تخلص سے جانے پہچانے گئے، 6 مئی 1925ء میں ڈاون ٹاون سرینگر کے وازہ پورہ میں ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے اور اُن کے مطابق اُن کا بچپن ناز و تعظیم میں گُزرا۔ اُنہیں ابتدا ہی سے سُخن سرائی کا چسکہ تھا اور وہ گانے بجانے اور صوفیانہ کلام کی محفلوں میں اکثر موجود رہے۔ اُنہوں نے اسلامیہ کالج سرینگر سے گریجویشن کی اور کچھ عرصہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی محکمہ میں ایک کلرک کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اِدھر اُدھر کے پاپڑ بیلنے کے بعد کشمیر یونیورسٹی میں فارسی میں ایم۔اے پاس کیا۔ لیکن بعد میں پرائیوٹ حیثیت میں انگریزی میں ماسٹرس کی ڈگری حاصل کی۔ وہ پہلے جموں کشمیر سرکار کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار مقرر ہوئے اور اس حیثیت سے اُن کا بیشتر وقت امرسنگھ کالج میں گزرا، وہیں سے اُنہوں نے کشمیر یونیورسٹی کا رُخ کیا اور فارسی زبان کے لیکچرر بنے۔ بہت عرصہ گُزرنے کے بعد وہ پروفیسر بنے اور جب یونیورسٹی میں کشمیری شعبہ قائم ہوا تو کُچھ عرصہ کے بعد اس کے سربراہ بنائے گئے۔ اُنہیں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ جب وہ پروفیسر شپ سے ریٹائر ہوئے تو اُنہیں یونیورسٹی میں پروفیسر ایمیرٹس (EMERITUS) کی حیثیت سے نامزد کیا گیا۔ وہ مارکسی فکر سے متاثر تھے اور 1950ء میں کلچرل کانگریس سے وابستہ ہونے کے بعد کشمیری میں شعر گوئی کرنے لگے۔ وہ اس تنظیم کے رسالے ''کونگ پوش'' کی ادارت سے بھی مُنسلک رہے۔ ترقی پسند تحریک کا ان پر گہرا اثر رہا جس کی گواہ اُن کی ابتدائی نظمیں ہیں۔ اُنہوں نے بعد میں راقم کو (جس نے کبھی مارکسی خیالات کے فنون میں اطلاق کو تسلیم نہیں کیا) بتایا کہ میں جب کچھ لکھتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اس میں مارکسی افکار کا کوئی ذکر نہ آئے۔

اُن کا شاہکار مجموعۂ کلام ''سیاہ رۄدِ جرِیٚن منٛز'' 1997 میں شائع ہوا۔ اس کا انگریزی عنوان اُنہوں نے خود کتاب میں (Under the Dark Down

(Prose) رکھا ہے اور اس کتاب پر اُنہیں گیان پیٹھ ایوارڈ ملا۔ اس کتاب کو اُسی سال ۲۲ ستمبر کو وزیر تعلیم عبدالقیوم نے گورنمنٹ ٹیچرس کالج میں ریلز کیا جہاں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد یٰسین قادری محفل کے مہمانِ خصوصی تھے۔ پروفیسر نسیم شفائی (جو شاید اُس وقت ابھی زیرِ تعلیم تھیں) اِس کی پیش کار یعنی (Anchor) تھیں۔ راہی صاحب اِس سے قبل لگ بھگ نصف ماہ پہلے میرے غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ اُنہوں نے مجھے یہ کتاب دیتے ہوئے اِرشاد کیا کہ کتاب ریلیز کرنے کی تقریب پر اپنے تحریری تاثرات پیش کریں۔ مجھ جیسا اُن کا شیدائی اِس احساس کے باوجود کہ میں اِس اعزاز کے لائق نہیں ہوں، اُن کی فرمائش کو کیسے ٹال سکتا تھا۔ میں نے مقالہ پڑھا جو چھپ تو چُکا ہے مگر اِس وقت میری دسترس سے باہر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے لکھا تھا کہ یہ کتاب ایسی ہے جو کشمیری زبان کو نوبل پرائز کے قریب لاسکتی ہے۔ میں نے یہاں تک لکھا تھا کہ نوبل پرائز دینے والے چونکہ کشمیری زبان نہیں سمجھ سکتے، لہٰذا اس کو دُنیا کا یہ سب سے بڑا ایوارڈ نہیں ملے گا۔ لیکن میں نے نوبل پرائز حاصل کرنے والی جتنی کتابوں کو پڑھا ہے اُس کے پیشِ نظر میں اِسے اُسی سطح کی دستاویز سمجھتا ہوں۔ ایسا ہوا نہیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب اِس کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تو مجھے اطمینان ہوا کہ میرا تجربہ نہ تو غلط تھا نہ ہی مبالغہ۔ بہر حال میرے بعد پروفیسر غلام رسول ملک اور پروفیسر شفیع شوق نے کتاب پر اپنے تاثرات پیش کر کے اس مجموعے کے مختلف گوشے روشن کیئے اور اس کو خوب سراہا۔

راہیؔ صاحب کے زمانے میں کشمیری شاعری کو کم از کم تین اور بڑی صدائیں مہکا اور لہکا رہیں تھیں۔ پنڈت دینا ناتھ نادمؔ، پروفیسر غلام نبی فراقؔ اور محمد امین کاملؔ، جن کے اپنے الگ رنگ، خاص اُسلوب اور اچھی خوبیاں تھیں اور ظاہر ہے کہ شاعری کی فطرت میں باہمی چشمک کا ہونا قدرتی ہوتا ہے۔ نادم صاحب نے کشمیری شعر گوئی

پہلے شروع کی تھی اور اُن کے زبان پر عبور و اظہار کی روانی اور تخیّل کی جولانی نے بہت جلد اپنا لوہا منوالیا تھا۔ یہاں تک کہ مہجور کشمیری نے اُن میں اپنی جانشینی کے آثار پائے۔ مجھے یاد ہے کہ 1972ء میں جب میں کلچرل اکادمی کا ڈپٹی سکریٹری تھا اور میرا دفتر شہید گنج میں واقع تھا، ہم نے رسالہ شیرازہ کا نادؔم نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نادؔم سے ابتدا کر کے بعد میں فراقؔ اور راہیؔ وغیرہ پر بھی ایسے نمبر شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ نادؔم کا پہلے اس لئے کہ وہ اِن میں سب سے زیادہ سینئر تھے، عمر میں بھی اور شاعر کی حیثیت سے بھی۔ ہم نے اس کا اعلان کیا تو کچھ دِنوں بعد راہیؔ صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ اُن کا دوسرے قلم کاروں کی طرح اِس دفتر میں آنا جانا رہتا تھا۔ لیکن آج وہ بڑے خشم آلودہ حالت میں تھے اور اُنہوں نے نادؔم نمبر نکالنے کی ہماری سعی پر زبردست احتجاج کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی رائے پر اس طرح ڈٹے رہے کہ میری اُن کو قائل کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم نے اِس منصوبے کو ترک نہ کیا تو میں اس کے خلاف دستخطی مہم چلاؤں گا۔ مجھے راہیؔ صاحب کی طرح ان کی خاطر بھی عزیز تھی۔ اس لئے میں شش و پنج میں پڑ گیا اور میرے خلاف مخالفوں کا لشکرِ جرّار بھی سرگرم تھا۔ اس لئے میرا ارادہ کمزور بھی پڑنے لگا۔ کیونکہ میں ایک اور فتنے کے برپا ہونے سے گھبراتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں موتی لال ساقی، چمن لال چمن، اور بشیر اختر سے مشاورت کی اور اکٹھے طے پایا کہ منصوبے کو فی الحال ٹال دیا جائے۔ جب میں 1990ء کے حالات کی مجبوریوں میں کچھ مُستقل طور جموں ہجرت کر گیا، وہاں اِس قسم کے احتجاج کا اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اِس سے بڑی عجیب بات یہ ہے کہ راہیؔ صاحب نے خود اپنے بارے میں نمبر نکالنے کی ہامی نہیں بھری اور نہ اِس کیلئے کوئی آمادگی دِکھائی۔ حالانکہ اِس کے لئے اِن کی اجازت بار بار طلب کی جاتی رہی۔ یہی وجہ ہے کی جہاں کلچرل اکادمی نے

بہت سے صغیر وکبیر کے بارے میں شیرازہ کے خاص نمبر شامل کئے ہیں وہیں اکادمی کے مخزن میں ابھی تک کسی راہیؔ نمبر کا توشہ نہیں ہے اور یہ کمی کھٹکتی ہے۔

راہیؔ صاحب کے کلام کا تنقیدی جائزہ اِس وقت مقصود نہیں ہے کہ یہ عرق ریزی اور طوالت دونوں کا تقاضا کرتا ہے۔لیکن بات جو اندھیارے میں جُگنو کی طرح چمکتی ہے یہ ہے کہ راہیؔ نے کشمیری شاعری کو رسول میر سے آگے لے کر دُنیا بھر کی سیر کرائی۔رسول میر نے کشمیری شاعری کو عجم یعنی (Orient) کی فضاؤں ،صداؤں، تشبیہات،استعارات اور مناظر سے سجایا۔لیکن راہیؔ نے کشمیری شاعری کا مغربی اور مشرقی تقریباً سب چھوٹی بڑی زبانوں سے مصافحہ کرادیا۔اُس کے یہاں پہلی بار ہمارا شمس فقیر اِنگلو امریکن ایزراپاونڈ سے ہاتھ ملاتا ہے اور ہماری ہیؔ مال یونان کی ھیلین (آف ٹرائے) سے گلے ملتی ہے۔راہیؔ نے اپنے بڑے ہم عصر نادمؔ کی طرح بہت سی نئی اور تازہ اصناف میں طبع آزمائی نہیں کی،لیکن اُس کے یہاں نئی ترکیبات کی سحر کاریوں اور معنی خیزیوں کے پرندے چہچہاتے ہیں۔نادمؔ نے ہماری شاعری میں سچی اور ادبی کشمیریت کُوٹ کُوٹ کر بھردی اس کو مناسب اور ٹیٹھ زبان کی رعنائیوں سے شرابور کردیا۔

میرے خیال میں راہیؔ اور نادمؔ کے درمیان یہ فرق ہے کہ راہیؔ کا تخیّل عمودی سمت میں ہوتا ہے اور نادم کا اُفق کے متوازی میں۔نادم اس لئے زمین سے جڑا رہتا ہے کہ اُس کے کلام میں کشمیر کی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک موجود رہے۔اسی لئے راقم اُن کو دوسرے ہم عصروں سے زیادہ کشمیر نواز،کشمیری پسند اور خالص کشمیری سمجھتا ہے۔ اُس نے کشمیری زبان میں پہلی بار اوپیرا (Opera) لکھے۔سانیٹ لکھے اور دوسری اصناف کے طاؤس رقص آمادہ کئے۔لیکن وہ بھی راہیؔ کی سلیقہ مندی اور اُسلوب نوازی کا قدر شناس تھا۔وہ خود اپنی ایک نظم میں کہتا ہے: مےٚ چھم راہیؔن شار ٹاٹھ (مجھے راہیؔ

کے اشعار دل کو لگتے ہیں) لیکن افسوس وہ راہؔی کی سب سے زیادہ بلیغ شعری کتاب ''سیاہ رودِ جریٚن منز'' کو دیکھ نہ سکا کہ وہ اِس کی اشاعت سے سات آٹھ سال قبل 73 سال کی عمر میں انتقال کر چُکا تھا۔ جو کچھ بھی ہو وہ اپنی گوناں گوں خوبیوں کی وجہ سے راہؔی، کاملؔ اور فراقؔ کے ساتھ کشمیری زبان کے اگر سرکردہ نہیں تو سب سے قدآور سخنوروں میں شمار کئے جاتے رہیں گے۔

راہؔی صاحب کی نقادانہ بصیرت کے مجھے چند واقعات یاد آ رہے ہیں۔ کشمیری سامعین ہمارے شاندار سخن گو رحمٰن ڈار کا ''شش رنگ'' صدی بھر سے سُنتے آئے ہیں اور جب تک کشمیری زبان رہے گی اِس کو سُنتے رہیں گے۔ اِس کو عام طور دوسرے کشمیری گیتوں کی طرح ایک میٹھا نغمہ سمجھا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں مشہور کشمیری گلوکار غلام احمد صوفی نے جب اسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک خاص طرز میں گایا تو سب سے پہلے راہؔی صاحب نے اس پر ایک پُر مغز مقالہ لکھ کر شائع کرایا جس میں اس کی نغمگی اور رسیلے پن کے ساتھ اس کی فنی پختگی، اس کی معنوی تہہ داری، اِس کے جنسی (Erotic) تلازمون اور اِس کی خاص لفظی فصاحت کو دریافت کیا تو اُس کے نتیجے میں اِس کو کشمیری ادب کے چند ممیّز اور بے مثال شاہکاروں میں لگ بھگ سرفہرست قرار دیا گیا تو یہ ایک ایسی مثال بن گیا جیسے انگریزی ادب میں کولرج کی کچھ نظمیں قرار دی جاتی ہیں۔ اِس کا ایسا اثر ہوا کہ بہت سے ادیبوں نے جن میں یہ فقیر حقیر بھی شامل ہے، اِس پر مضامین لکھے اور اپنے اپنے انداز سے اس کے رنگارنگ پہلوؤں کو آشکارا کیا اور اس طرح راہؔی صاحب کا نورِ بصیرت عام ہو گیا۔ اسی طرح انہوں نے کشمیری ادب کی چاسر یعنی لل دید کے بعض واکھوں کی عام نظر سے ہٹ کر تشریح و تفسیر کی اور اِس کے بعض انوکھے اور نرالے مفاہیم اور طرزِ ادا کی کھوج کی۔

راہیؔ کو علم عروض کا بھی گہرا عرفان تھا۔ وہ نادمؔ اور کاملؔ جیسے بڑے شُعرا کے کچھ چیدہ اشعار کی اس طرح تقطیع کرتے کہ واقعی اُن کا سُقم اور غلطی سامنے آ جاتی۔ اس سلسلے میں اُن کی ایک کتاب اُن کی اِس نکتہ شناسی کا ماجرا بیان کرتی ہے، جو کشمیری شاعری کے خاص عروضی منظر کو بھی اُبھارتی ہے۔ راہیؔ نے کشمیری میں نظم کی پرداخت کی اور اِس کو عالمی سطح پر لانے کی سعی کی۔ یہ کشمیری مزاج کو کتنا راس آیا اس پر بڑی طویل بحث کی جاسکتی ہے۔ اگر چہ کسی قدر مُبہم شاعری کے نمونے یہاں دوسرے شاعروں کے علاوہ سوچھ کرال کی ''دپیٚوٗمَے بالہٕ یارس یٲرِ لاگوٗ'' کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ لیکن ابہام کو شعری جز یا ذریعہ اظہار بنانے کا کام راہیؔ نے ہی مکمل کیا۔ اُس کی اکثر نظمیں عام قاری اور کچھ سلجھے ہوئے پڑھنے والوں کیلئے اب بھی مُبہم ہیں اور شاید بہت مُدت تک اِس زُمرے میں رہیں گی۔ ان میں مشرقی اور مغربی طرز کلام کو اِس طرح گوندھا گیا کہ قاری بڑی حد تک Confuse ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ راہیؔ اپنے وقت سے ذرا پہلے کا شاعر تھا اور ہمارے آنے والے قاری اُس سے زیادہ محظوظ ہوں گے۔

راہیؔ کی ایک اور خصوصیت متعدد اصنافِ سخن پر اُن کی گرفت تھی۔ اُنہوں نے کشمیر یونیورسٹی کا ترانہ لکھا۔ وہ ایک ایسا جمالیاتی اور تواریخی بیانیہ ہے کی اُس کو سُن کر کشمیر کے قدرتی روپ سرُوپ کے علاوہ اس کے مشاہیر کا ذِکر کُچھ اس برجستہ انداز سے کیا گیا کہ سُننے والے کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی جیسی قدیم اور عظیم یونیورسٹی کا ترانہ لکھنو کے شاعر اسرار الحق مجازؔ نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے اور اِس کی اہلِ نظر نے توصیف بھی کی ہے۔ لیکن میں اپنی کم مایگی کا احساس کرنے کے باوجود وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ راہیؔ کا ترانہ مجازؔ کے ترانے پر بازی لے جاتا ہے، کہ میں نے دونوں ترانے بار بار سُنے ہیں۔ اِسی طرح راہیؔ صاحب نے کشمیری زبان کا

بھی ایک پیارا سا نغمہ لکھا ہے جس میں ہمارے عظیم فاتح للتادت اور رسول میر کی برجستگی سے ذکر موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسے ترانے لکھنے کی استعداد کسی دوسرے کشمیری شاعر میں نہیں تھی۔ اِن میں نغمگی بھی ہے، تسکین بھی اور حب وطن کی گہرائی بھی۔

جیسا کہ راقم پہلے لکھ چکا ہے کہ راؔہی اپنے وقت سے بہت آگے تھا گو اُس کی کچھ غزلیں عوام پسندی کی سند بھی حاصل کر چکی ہیں۔ لیکن مجموعی طور وہ اُردو کے مرزا غالبؔ کی طرح طبقہ خواص میں رہتا ہے اور اُس کے متعلق میر تقی میر کا یہ شعر اعتماد و اعتبار کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

☆☆☆

لے وستؤ رون ترال کے راستے میں کشمیر کا ایک ایسا بلند پہاڑی ٹیلہ جو کسی پہاڑی سلسلے کا حصہ نہیں ہے۔ یہ ایک الگ تھلگ پہاڑ ہے، جس میں جنگل بھی ہے، نادر و نایاب جڑی بوٹیاں بھی ہیں اور خاص قسم کے چرند و پرند بھی۔ کشمیری شاعری میں راؔہی کی شاعری کا کچھ ایسا ہی ماجرا ہے۔

غلام نبی خیالؔ......

رحمان راہیؔ: شاعرِ کائنات

انسانی سرشت کے صد ہزار سے زیادہ ادوار نے قدیم داستان گوئی سے لے کر حکایات کو ابدلآباد بنایا ہے۔ اس طویل ترین ازمنہ تاریخ کے دوران لاتعداد نابغہ روزگار شخصیات نے دنیا کے چہرے کو روشنی بخش کر نکھارا اور اسے خوب سے خوب تر بنادیا۔

یہاں پر ایسے لاتعداد اساتذہ ادب اور سخن گوئی کے اکابرین کا سرسری ذکر بھی ایک طویل عمل کا متقاضی ہوگا لیکن کشمیر کے دُرِیکتا اور سخن گوئی کے غالبؔ ثانی رحمان راہیؔ کا تذکرہ باتفصیل کرنا ایک خوش آیند عمل ہوگا۔

راہیؔ کے ساتھ میرے قریبی تعلق کا سلسلہ ساٹھ سال تک قائم رہا ہے۔ان تعلقات کا آغاز اُس وقت ہوا جب وہ سری نگر کے قدیم علاقے وازہ پورہ میں رہائش پذیر تھا اور میں وہاں سے کوئی آدھ گھنٹے کے فاصلے پر حول کے علاقے میں رہتا تھا۔

انہی دنوں راہی کا گھر چند گنے چنے کشمیری ادیبوں اور سخن وروں کی آماجگاہ بن گیا جہاں ہم لوگ گھنٹوں تک ادب کے ساتھ ساتھ ایک آزادانہ ماحول میں بے ادبی کی باتیں بھی کرتے تھے۔ان مستقل ادبا میں امین کامل، اختر محی الدین، غلام نبی فراق اور مظفر عازم کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔عازم کا ذہنی تعلق چونکہ ایک خاص جماعت کے ساتھ تھا لہٰذا وہ ترقی پسندوں کی اس ٹولی میں اپنے بند ذہن کو وا نہیں کرسکا اور رفتہ رفتہ کھسک گیا۔ ہماری بتیاں اس کی سمجھ سے بالاتر ہی تھیں اور وہ بجا طور پر کہہ سکتا تھا کہ:

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

اُن دنوں شہر میں ایک نوزائیدہ ثقافتی تنظیم اہل دانش وبینش کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رہی تھی جس نے کئی نام بدلے اور بالآخر اس کی مستقل شناخت کلچرل کانفرنس کے نام سے ہوئی۔

ایک دن راہی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گاؤ کدل علاقے کے پاس ایک چھوٹی سی تجارتی بستی ''کوکر بازار'' میں لے گیا جہاں کانفرنس کا دفتر ایک سہ منزلہ پرانی عمارت میں قائم کیا گیا تھا جس کی نچلی منزل میں کوہِ نور پریس تھا۔اسی محفل میں مجھے سب سے پہلے دینا ناتھ نادم، بنسی نردوش، سوم ناتھ زتشی، دینا ناتھ المست اور اس کے بڑے بھائی امر چند ولی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

ابھی اس ہفت روزہ نشست کا آغاز ہوا ہی چاہتا تھا کہ بنسی نردوش ترنگ میں کھڑا ہوا اور نو آمد محی الدین کی طرف متوجہ ہو کر چلانے لگا۔ یہ کیا نام رکھا ہے اس نے؟ بھلا محی الدین بھی کوئی ادبی نام ہے؟ آج سے اس کا ادبی نام اختر محی الدین ہوگا۔اختر بظاہر خوش ہی ہوا ہوگا کہ اسے شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عدد تخلص نصیب ہوا۔

کلچرل کانفرنس میں دینا ناتھ نادم، امین کامل اور رحمان راہی خاص توجہ کا مرکز بنے رہے کیونکہ ان کی شاعری میں نئی باتیں سننے کو ملی۔نادم کی سخن گوئی گھن گرج سے بھری پڑی تھی اور اس رواروی میں وہ اپنی ایک مشہور نظم ''میہ چھم آش پگہہ'' میں اُس خاتون کا مذہبی عقیدہ قائم رکھنا بھول گیا۔ یہ خاتون گھر پر تنِ تنہا ہے اور وہ اپنے شوہر سے اگلے ہی دن لوٹنے کی التجا کرتی ہے کیونکہ ایک افواہ یہ ہے کہ اگلے دن جنگ چھڑ جائے گی۔اس نظم میں شاعر نے یہ غلطی کی ہے اس نے ایک جگہ اسی خاتون کو ہندو اور دوسری جگہ مسلم کہا ہے ورنہ وہ اس کی زبانی دسہرہ کے ساتھ عید منانے کی بات نہیں کرتا۔راہی نے بھی اسی طرح ترنگ میں آکر اور یونانی اسطور سے اپنی آگاہی جتلا کر ایک فاش غلطی کی ہے۔قدیم یونان کی ایک حکایاتی جنگ کا، جو ٹرائے اور یونان کے

درمیان ہوئی اور جس میں محض ایک عورت ہیلن کی خاطر دس لاکھ لوگ تہہ تیغ ہوئے، راہی نے اپنی ایک نظم میں تذکرہ کیا ہے لیکن اس سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ ہیلن کو ایگامیمنن کی بیوی جتلایا ہے جبکہ وہ ایگامیمنن کے بھائی منیلاس کی زوجہ تھی اور وہ ٹرائے کے شہزادے پیرس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ ایگامیمنن جب جنگ میں فاتح بن کر واپس یونان لوٹا تو اسے اپنی بیوی کلے ٹیم نیسٹرا اور اس کے عاشق ایجستھس نے مل کر قتل کیا کیونکہ ایگامیمنن نے ٹرائے پر فوج کشی کرنے سے پہلے ایک دیوتا کی ہدایت پر اپنی بیٹی کو مار ڈالا تھا:

بہژ ہ منز فاتح ایگامیمنن بے سوکھ
دَہہ وہری آشنٕز پٕنژ لولاہ بژیم

نادم اور کامل کے یہاں موسیقیت اور تغزل سے زیادہ معنویت، گہرائی اور گیرائی کا امتزاج ہے ان دونوں کے برعکس راہی کی سخن گوئی احساس کی شدت، تغزل کی دل نشین رونمائی اور معنی کی سرشاری کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔

راہی کے ساتھ میری طویل قرابت داری کے دوران وہ بارہا مجھ پر یہ باور کرتا رہا کہ بالخصوص ایک قلم کار کو ایمان دار اور نیک نیت ہونا چاہئے لیکن زمانے کے ناموافق حالات کے تھپیڑے اسے اس ضابطے سے دست کش ہونے پر مجبور بھی کرتے ہیں۔ راہی کو اپنا یہ اصول مکرر طور پر رد کرنا پڑا۔

8 ستمبر 1982 بدھوار کو جب شیخ عبداللہ کا انتقال ہوا تو اس کے چار دن بعد اس کی یاد میں سری نگر کی اقبال پارک میں ایک تعزیتی اجتماع ہوا جس کی صدارت شیخ عبداللہ کے بیٹے فاروق عبداللہ نے کی۔ اس اجلاس میں راہیؔ نے مرحوم کو ایک طویل نظم میں زبردست نذرانۂ عقیدت پیش کیا جس نے ہزاروں حاضرین کو آبدیدہ کیا:

ببیں کہ تفاوتِ راہ کجاست تا بہ کجا

راہی کو اگرچہ زبان و بیان پر خاصا عبور حاصل تھا مگر اس نے اپنے کلام میں بے جا طور پر ایسے غیر کشمیری الفاظ استعمال کئے ہیں جو ایک خوبصورت زیور پر بدصورتی کی آلائش ہیں۔ ان میں قدغن، شہریار، بوتراب، شتاب، آنند، انتہا، آبشار، سراب، عقاب، شاخِ نبات، مدح خواں، اعتقاد، انضمام، ساحل، زہراب وغیرہ شامل ہیں۔ حالانکہ ان کے بامعنی کشمیری متبادل موجود ہیں۔

ادبی تنقید کی پہلی کتاب ''بوطیقا'' میں ادب بالخصوص شاعری کو تین اصناف میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں طربیہ، المیہ اور فکاہیہ شامل ہیں۔ اس تنقیدی تجزیے میں یونان کے سرکردہ فلسفہ دان نے المیہ ہی کو فوقیت بخشی ہے جس کے سرتاج ڈرامانگاروں میں ایسکائیلس، سوفوکلیز اور یوریپیڈیز کے نام سرِفہرست ہیں۔ ارسطو کے بقول المیہ کا مطالعہ انسان کے فکر و ذہن کو ایک تراوت اور شیرینی بخشتا ہے۔ اس کی توضیح اس نے اس طرح کی ہے کہ اگر کسی کے جسم میں پھوڑا نکل آئے تو اس میں ایک فتیلہ بھر کر اس کے جلد از جلد پکنے کا عمل کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس سے سارا فاسد مادہ نکالا جاتا ہے اس عمل کو یونانی زبان میں Catharsis کہا جاتا ہے۔ اردو میں اس کا متبادل پاکیزگی یا صفائی اور کشمیری میں شۆژ‌ئے کہا جا سکتا ہے۔ راہی کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی المیہ کی جزیات سے مالامال ہے۔ صرف ایک شعر مثال کے طور پر پیش ہے :

متہٕ ونتہٕ رأیس کینہہ سہ چھہٕ از تہٕ پرأنی پاٹھین
گٹہٕ منز پڑگاش ژھاران ژھٹہٕ منز شکأری تراوان

راہی کی عام شعریات کے ساتھ ساتھ اس کے لاشعور میں وطنِ مالوف کشمیر سے والہانہ محبت اور اپنی مادری زبان کشمیری کی چاہت کو شاعر کے معشوقوں میں گنا جا سکتا ہے:

فدا یہ میون بے سوکھ روح کاشرین لوکن
یہنْدی امار کنٔین منز گلالہٕ پھٔلراوان

یُہند جمال چھُ بخشان آبروے عشقس
یہنز ہونر چھ کرامات قدرتس ہاوان
حلیم زنتہٕ ونن ژھایہ پھاپٕھ لیمتی مور
لطیف زنتہٕ صبح دم تھرٛین پیٛوان شبنم
صبور زنتہ ہمالہ کوہکی قد آور تھنگی
دِوان چھ واوِ گلیٛن تن ذہین نہ ہاران دم

راہی کی سخن گوئی میں کشمیری زبان کا جنوں بھی ایک والہانہ رنگ کا حامل ہے :

ہے کاشرِ زیوٚ ! مےٚ چھےٚ چأنی دِژے
ژٕے میأنی خبر ژٕے میأنی نظر
ژٕے میانہ شعورچ سوٗژٕلی زٕژ
ژٕے میانہِ ضمیرٕچ مژ سارنگ

البتہ راہی کی شاعری کا غالب حصہ عشق کی اس حدت وحرارت سے مسحور ومخمور ہے جس کا بیان قاری کو الف لیلوی اور حکایاتی دنیا کے طلسم میں لے جا کر اس کے لئے نشہ آور شئے بن جاتا ہے :

سہٕ گلاب روئے ڈیوٗٹھم ییٚمہِ از گلاب چھاوان
مےٚ چھہ ووٚنی مثالہٕ منزرنبہ وِنی خیال راوان
لوٗہ چھا پیٛوان گلاس رِنہٕ لہر ٔتھی ہواوس
نتہٕ ژاو باغ گُس تاں مدٕ مأتی پوٚری تراوان
ژٕے روٗس ییتھ زندگی کانٛہہ آش روزیا
ژٕ نے روزکھ تہٕ ژانگیٛن گاش روزیا

یہاں پر بے ساختہ میر کی یاد آتی ہے۔

پھراس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

متیو کپأرؠ سو لوٕ ہٕژ نظر گیی آوٗر

مےٚ وو˘ تھ گلالہٕ دلس سوٚنتہٕ واوٕ نار ووٚلو

راہی نے کشمیری شاعری میں فکر وخیال اور معنی آفرینی کی ایسی جولانیاں بکھیری ہیں کہ ان کی مثال اردو شاعری میں ہر جگہ نظر نہیں آتی۔ میر، غالب اور فیض کے علاوہ اگرچہ حافظ اور ناظم حکمت کا اثر راہی پر نمایاں ہے لیکن اس نے ان کی اس اثر پذیری کو اپنے طبع زاد کلام پر حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔شاعری الہام ہے اگر چہ وحی نہیں۔سخن گوئی کا براہ راست رشتہ الہام سے ہے کیونکہ وحی کے ذریعہ صرف الہامی صحیفے قرآن، تورات، زبور اور انجیل نازل ہوئے ہیں اور اللہ تعالی نے اس کے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے اختتام کو پہنچا کر محمد ﷺ کو خاتم النبیین مقرر فرمایا۔مگر شاعروں کی سرشت میں الہام کی ودیعت ان کے لاشعور کے ساتھ پیوست رہی۔کامل نے کہا :

کأملہٕ الہاچ کتھ کر اکھا کھ مصرٕ چھہٗ اکھا کھ آیہٕ

گزشتہ کئی سالہا سال کے دوران برصغیر نے ادبیات کی دنیا میں روشنی کے جو مینار بلند کئے اور جن کے ذریعے شعر وسخن کی شمعوں کو جاودانی نور عطا کیا ان میں میر، غالب اور اب فیض کے نام سر فہرست گنے جاتے ہیں۔ مقامی طور پر کشمیری دنیا میں لفظوں کے جادوگر رحمان راہی کو بھی کو ایک مقام حاصل ہے۔کشمیری زبان کی ہم عصر شاعری میں وہ معنویت اور شعریت کہیں نظر نہیں آتی جو حبہ خاتون، رسول میر، محمود گامی، مہجور اور آزاد کے یہاں جلوہ افروز ہے۔

راہی کے یہاں ہندو دیومالا، قدیم یونانی ادب، حافظ شیرازی، غالب اور فیض کے اثرات نمایاں طور پر واضح ہیں البتہ اس کی غزلیات میں غالب کا سرودِ رفتہ واضح ہے:

رأہی ین لوٚچ شرافت پھاپٕھ لأو غألبس نی تو غزل نذرانہٕ تے

ہم عصر شاعری زمانے کے ابلہوں اور ناخواندگان کی تک بندی اور بے معنی اور بے ہنگم تجربات کی بھینٹ چڑھ چکی ہے اور اس ابتلا سے نجات پانے کی ان نام نہاد صوفی شاعروں سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی جو لفظ صوفی کے معنی تک نہیں جانتے۔ اس دور کو کشمیری کی شاندار دنیائے سخن کے لئے ابتلا اور تنزل کا دور ہی کہا جائے گا۔

ہم عصر کشمیری شاعروں میں 97 سال کی طویل ترین عمر پانے والا راہی تقریباً دس سال تک صاحب ِ فراش ہونے کے بعد بالآخر 9 جنوری 2023 کو زندگی کی بازی ہار گیا۔ گزشتہ کم از کم ایک صدی میں کشمیر نے کسی دوسرے راہیؔ کو پیدا نہیں کیا اور قیاس بھی یہی کیا جاسکتا ہے کہ ایسا ہوگا بھی نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

......پروفیسر شفیع شوقؔ

رحمان راہی: ایسا کہاں سے لاؤں......!!

پروفیسر رحمان راہی کے ساتھ میری شناسائی کی کہانی اس وقت شروع ہوئی ہے جب میرے ہوش نے مجھ سے شناسائی شروع کی۔ وہ یوں کہ گاؤں کے جس چھوٹے سے کچّے چھپّڑ والے مکان میں، میں نے جنم لیا اور ہوش سنبھالا، اس میں ایک چھوٹا کمرہ تھا جس کی کھڑکی جنوب کی جانب دن بھر دھوپ سے روشن رہتی تھی۔ یہ کمرہ میرے بڑے بھائی صاحب ناجی منوّر کا کمرہ تھا، جس میں ہر کسی کو جانے سے ڈر سا لگا رہتا تھا کیونکہ اس کا ہر ایک چپّہ کتابوں سے بھرا پڑا رہتا تھا۔ اس کی مٹی سے لپی دیوار پر چند لوگوں کی تصوریں تھیں جن میں کارل مارکس، اینجلز، غالب، اقبال، غلام احمد مہجور اور عبدالاحد آزاد، دینا ناتھ نادم اور رحمان راہی کی تصویریں تھیں۔ وہ تصاویر اب تک محفوظ ہیں، نہ صرف ہمارے نجی کتب خانے میں بلکہ اس سے زیادہ میرے طاقِ حفظ میں بھی۔ بڑے بھائی صاحب ''کاکا لالہ'' میٹرک اور ادیب فاضل پاس کرتے ہی لیہہ لدّاخ میں بحیثیت استاد تعینات ہوئے۔ ان دنوں لداخ جانا، وہ بھی ہوائی جہاز میں، سات سمندر پار جانے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ وہ وہاں 1955ء سے لے کر 1957ء تک رہے۔ ان کے لدّاخ جانے کا صدمہ ماں برداشت نہ کر سکی اور انتقال کر گئی۔ میں ''کاکا لالہ'' کی غیر حاضری میں چوری چھپے کتب خانے میں گھستا اور کتابوں کے ورق پلٹتا اور دیوار پر لٹکی تصویروں کو سہمی سہمی نظروں سے تکتا رہتا تھا۔ چونکہ میں نے انہی دنوں حروف تہجی سیکھے تھے، اس لئے رحمان راہی کا نام بھی پڑھ پایا۔

میری پہلی کشمیری غزل جب کلچرل اکیڈمی کے سالنامہ ''سون ادب'' میں شائع ہوئی، میری عمر صرف چودہ سال تھی۔ مجھے حیرت اور خوشی جنون کی حد تک بہا لے گئی جب میں نے گاؤں کے پنچایت ریڈیو سے اپنا نام سنا اور میری غزل کے چند اشعار پیش کئے گئے۔ ریڈیو کے ادبی پروگرام میں خود رحمان راہی عصری غزل پر اپنا مقالہ پیش کر رہے تھے۔ میں ارخمیدس (Archimedes:287-212 BC) کی طرح دیوانہ وار گھر سے نکل بھاگا۔ !!Eureka! Eureka چلانے کے بدلے میں گاؤں کے ناخواندہ دوستوں سے کہنے لگا: ''میرا نام ریڈیو پر......رحمان راہی......'' راہی صاحب مجھے نہیں جانتے تھے اور شاید مجھے کوئی بزرگ شاعر سمجھ رہے تھے۔ میں نے اس واقعہ کے بعد ''نوروزِ صبا'' (1957ء) کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور ان کی شاعری سے بہت حد تک متاثر ہوا۔ لیکن میں کچھ اپنے ڈھنگ سے لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

میں نے ڈگری کالج اننت ناگ میں (B.Sc(Medical میں داخلہ لیا مگر سائنس کم اور ادب زیادہ پڑھتا تھا۔ مجھے ڈگری کالج کے میگزین ''ویری ناگ'' کے کشمیری سیکشن کا سٹوڈنٹ ایڈیٹر بنایا گیا۔ مرحوم پروفیسر غلام محمد شاد کالج ہوسٹل میں میرے کمرے میں گھنٹوں بیٹھ کر سگریٹ پر سگریٹ پیتے اور ترقی پسند شاعروں کے خلاف بولتے رہتے تھے۔ انہیں میری سیاسی آوارہ گردی کا علم تھا کیونکہ پولیس مجھے اکثر تھانے میں بند کرکے طرح طرح کی اذیتیں دیتی تھی۔ شاد صاحب جب بھی رحمان راہی اور باقی ترقی پسند شاعروں کے خلاف بولتے، میں مشکل سے اپنے غصّے پر قابو پالیتا تھا۔ لیکن جب میں اپنی بے سُری آواز میں راہی کی مشہور غزل ''سُہ گلاب روئے ڈیوٹھم......'' سناتا اور کالج کے کچھ دوست میرے ساتھ گاتے، شاد صاحب چُپ ہو جاتے۔ یہ سلسلہ دو سال تک چلا اور میں ''ویری ناگ'' رسالہ کے کشمیری اور اردو سیکشن میں چھپتا رہا۔ شاید غلام محمد شاد مجھے روز یاد کرتے تھے جب مجھے

PDA(Preventive Detention Act) کے تحت پورے دو سال کیلئے نظر بند کر دیا گیا۔1972ء میں مجھے اُسی دِن رہا کیا گیا جس دِن غلام محمد صادق کا انتقال ہوا۔جیل سے باہر آ کر میرے پاس صرف B.Sc کی ڈگری اور انگریزی ادب میں ایڈیشنل سبجیکٹ پاس کرنے کی سند تھی۔روزگار کی تلاش میں دردر کی ٹھوکریں کھاتا رہا، مگر اپنے عشق کے لئے سب دوستوں میں مشہور تھا اور نوکری نہ ہونے کے باوجود میں 1974ء میں شادی کر بیٹھا۔

بی۔ایس۔سی کی ڈگری کو خیر باد کہہ کر میں نے کشمیر یونیورسٹی کے انگریزی شعبے میں داخلہ لیا۔ راہی صاحب انہی دنوں فارسی شعبہ میں لیکچرار کی حیثیت سے آ گئے۔میرا ذوق دیدار مجھے ان سے ملاقات کے لئے بیقرار کرتا تھا۔شعبہ انگریزی ان دنوں آرٹس بلاک کی دوسری منزل میں تھا۔ نچلی منزل میں اردو، سنسکرت، ہندی کے شعبے تھے۔ان سب شعبوں کے اساتذہ بلاک کے لان میں کرسیاں لگا کر بیٹھتے تھے۔ بہار اور خزان کے دوران دھوپ کیلئے اور گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا کا مزہ لینے کے لئے۔اس محفل میں آل احمد سرور، شکیل الرحمان،، حامدی کاشمیری، شمس الدین احمد، رحمان راہی، قاضی غلام محمد وغیرہ جیسے بارعب لوگ شامل تھے۔کسی طالب علم کیلئے ان صاحبان کے نزدیک جانا بہت مشکل کام تھا۔ 1973ء میں، میں نے اپنے بھائی صاحب ناجی منوّر کی رہبری میں ''کاشر گرامر'' نام کی کتاب چھاپی تھی۔ میں نے اسی کتاب کی چند کاپیاں لے کر اس محفلِ دانشوراں کے نزدیک جانے کی جسارت کی تاکہ میں راہی صاحب سے متعارف ہوسکوں۔اس سے پہلے کہ میں راہی صاحب سے مخاطب ہو جاتا، مرحوم شمس الدین احمد صاحب نے کتاب کے سرورق کو دیکھا جس پر میرا نام ''شفی شوق'' چھپا تھا۔شفیع کے بدلے ''شفی'' لکھنا مجھے امین کامل کے رسالہ ''نیب'' سے ملا تھا۔اس نے مجھے اشارے سے بلایا۔جوں ہی ان کے نزدیک پہنچا تو

انہوں نے غصّے میں آ کر میرے چہرے پر ہلکا سا تھپڑ مارا۔ میں ابھی اپنے بکھرے حواس کو یکجا ہی کر رہا تھا کی راہی صاحب میرا سرخ چہرہ دیکھ کر میری گھبراہٹ بھانپ گئے۔ مجھے ایک طرف لیا اور کہا ’تم ہی شفیع شوق ہو؟ میں تو تمہیں بزرگوں میں شمار کرتا تھا۔ پریشان مت ہو جاؤ۔ میرے پاس آیا کرو۔ یہ اچھی بات ہے کہ تُم انگریزی میں ایم۔اے کیلئے آئے ہو۔‘‘

اس واقعہ کے بعد راہی صاحب سے روز ملاقات کرنا میری عادت بن گیا۔ اس حد تک شعبۂ انگریزی کے سربراہ پروفیسر محمد سلطان وانٹ مجھے ’’راہی کا چمچہ‘‘ کہنے لگے، جس پر میں دل ہی دل میں خوش ہو جاتا تھا۔ میں نے راہی صاحب کو اپنی باقی کتابیں خاص کر ’’عرشہ پیٹھ فرشس تام‘‘ اور اپنے ’’آش‘‘ رسالے کی چند کاپیاں پیش کی۔

1975 تک کشمیر یونیورسٹی میں کشمیری ڈپارٹمنٹ نہیں تھا۔ میں نے جی۔ایم۔ زاہد، اے۔آر۔ وانی جیسے چند دوستوں کے ساتھ صلاح ومشورہ کیا اور ایک تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے مل کر یونیورسٹی کے حکام کو کشمیری زبان کی اہمیت اور اس میں موجود ادبی اور علمی سرمایہ کو دیکھ کر ’’کشمیری ڈپارٹمنٹ‘‘ قائم کرنے کا مطالبہ کیا۔ کئی دن تک ہم نے یونیورسٹی کے تمام طلبا اور طالبات کو اس معاملے میں شامل کیا۔ اس کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر رئیس احمد نے ہم سے اس جانب پیش رفت کرنے کا وعدہ کیا۔ گاندھی بھون میں ایک محفل کا اہتمام کیا اور وائس چانسلر، مختلف شعبوں کے سربراہوں اور سرکردہ دانشوروں کو مدعو کیا۔ سٹیج کی نظامت میں سنبھال رہا تھا۔ پورا ہال سامعین سے بھر گیا کیونکہ یہ اس زمانے میں یہ ایک عجیب مطالبہ تھا اور سامعین تفریح کی توقع لئے آئے تھے۔ ہم نے ریڈیو کشمیر کے ڈائریکٹر کو موسیقار اور گلوکاروں کی ایک ٹیم بھیجنے کی درخواست کی تھی جس کو انہوں نے تسلیم کیا

تھا۔موسیقار تو پہنچ گئے پر گلوکار نہیں آئے۔اس پریشان کُن صورت حال میں ،اپنے دوستوں کے اصرار پر میں نے خود ہی موسیقی کے ساتھ گانا شروع کیا۔گانا اس زمانے میں سب کی زبان پر تھا، یعنی مرحوم غلام محمد راہ، راج بیگم، نسیم اختر کی مقبول آوازوں میں راہی صاحب کی غزل :''سُہ گلاب روے ڈیوڈھُم بییہ از گلاب چھاوان......'' راہی صاحب بھی سامعین میں موجود تھے۔گانے کی زبردست پذیرائی ہوئی اور اس کے بعد کئی طالب علم لیڈران کی تقریریں ہوئیں اور آخر پر وائس چانسلر نے ہمیں ڈیپارٹمنٹ چالو کرنے وعدہ کیا۔

1976 میں ایم۔اے انگریزی مکمل کر کے ایک سائنس ٹیچر کی حیثیت سے ماہانہ دوسو روپے کی تنخواہ پر تعینات ہوا۔مجھے B. Sc ہونے کی بنیاد پر تعینات کیا گیا تھا۔1974 میں طالب علمی کے دوران ہی میری ضد پر میری شادی ہوئی تھی۔سکول میں پوری لگن کے ساتھ سائنس اور انگریزی پڑھاتا تھا۔سکول میں ڈیڑھ سال پڑھانے کے وہ دن میری زندگی کے حسین ترین دن تھے۔اس دوران سرینگر آنا جانا رہا کیونکہ میری بیگم نوا کدل سے تھیں۔

1976ء میں جناب محمد یوسف ٹینگ نے مجھے کسی درخواست کے بغیر ڈکشنری پروجیکٹ میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے نوکری دے دی۔وہ شاید میرے کام سے خوش تھے۔اس دوران میں بٹہ مالو کے ایک تنگ کوچے میں ایک گھر میں کرایہ دار بن کر رہتا تھا۔میری بیوی B.Sc کرتی تھی اور میرے بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔اپنی کامیابی پر زبردست خوش تھا اور روشن مستقبل کے خواب دیکھتا تھا۔یونیورسٹی میں ریسرچ سیل کی جگہ کشمیری ڈپارٹمنٹ قائم ہو چکا تھا اور مرحوم راہی صاحب کو شعبے کا سربراہ منتخب کیا گیا۔مجھے اس شعبے کو دیکھنے کی زبردست خواہش تھی ،مگر فرصت نہیں ملتی تھی۔

1987ء کے مارچ کی ایک صبح میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ گزرا جسے میں

ایک معجزہ سمجھ کر یاد کرتا ہوں۔ ہم میاں بیوی بٹہ مالو کے چھوٹے سے کمرے میں صبح کی چائے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ مالک مکان کی بیٹی تھی جو کہہ رہی تھی کہ کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔ ہم نے فوراً بکھری چیزوں کو سنبھالا اور میں دروازے تک آ گیا۔ میرے ہوش وحواس گم ہوئے جب میں نے ایک اونچے قد کے شخص کو دیکھا۔ یہ کوئی اور نہیں بلکہ پروفیسر رحمان راہی تھے۔ میں حیران ہوا کہ محلے کے کوچوں کی بھول بھلیوں سے چل کر راہی صاحب کس طرح میرا پتہ ڈھونڈ کے مجھ تک آ پہنچے۔ وچارناگ نوشہرہ سے بٹہ مالو بس سٹینڈ تک آنا بہت مشکل تھا اور میری سمجھ سے باہر بھی تھا۔ میں اپنے ہوش سنبھال کر انہیں اپنے کمرے میں لے آیا۔ ایک صاف چٹائی بچھائی اور ایک چھوٹا سا تکیہ لا کر ان کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی۔ راہی صاحب نے سگریٹ پی کر بسکٹ اور چائے لی۔ اس کے بعد ہنسی مذاق کی باتیں ہوئیں۔ میں ان کی آمد کی وجہ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک فارم نکالا اور کہنے لگے کہ یہ لیکچرر پوسٹ کیلئے عرضی کا فارم ہے۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسا ممکن ہے۔ انہوں نے مجھے بھرپور مدد کرنے کا یقین دلایا اور کہا: ''فارم دو چار دنوں میں بھر کر یونیورسٹی میں داخل کرالو۔ انٹرویو اچھا کرنا۔ یہ میرے لئے عزّت کا معاملہ ہے۔ مقابلہ سخت ہوگا۔ میرے گھر آ کر مجھ سے ملنا۔''

راہی صاحب نے مجھے حضرت شیخ نورالدینؒ کی زندگی اور شاعری پر کوئی چھوٹی، بڑی کتاب لکھنے کو کہا کیونکہ اس سال حضرت شیخؒ کی برسی منانے کی تقریبات منعقد ہو رہی تھیں۔

راہی صاحب نے رخصت لی۔ میں بس اڈّے تک ان کے ساتھ گیا اور ان کو رخصت کر کے لوٹ آیا۔ وہ دن میری زندگی کا سب سے اہم دن تھا کہ میری زندگی کیا سے کیا ہوگئی۔

میں نے راہی صاحب کی ہدایات پر عمل کیا اور اپنے قلم سے ایک نئی کتاب کی کتابت کی اور اسے لال چوک کے ایک پریس سے چھپوایا جہاں سے میں ''آش'' رسالہ چھپواتا تھا۔ ''فرشہ پیٹھ عرشس تام'' اور ''کشمیری گرامر'' بھی اسی پریس سے چھپوایا تھا۔

انٹرویو ہوا۔ راہی صاحب خود حیران ہوئے کہ میں کس طرح اتنے کم وقت میں کتاب لکھ کر شایع کر پایا۔ کتاب کی پہلی کاپی میں نے پورے انٹرویو بورڈ میں راہی صاحب کو پیش کی۔ باقی ممبران کو بھی کتاب کی کاپیاں پیش کی۔ میری یہ کتاب ''شیخ العالمؒ تہٕ تمی سُند زمانہ'' (1978ء) تھی۔

انٹرویو میں محترم محمد یوسف ٹینگ اور پروفیسر حامدی کاشمیری ایکسپرٹ تھے۔ ٹینگ صاحب نے میری مدد کی غرض سے میری تقرری کی مخالفت عجیب ڈھنگ سے کی جب انہوں نے کہا ''شفیع شوق کو میں نے خود گاؤں سے ڈھونڈھ نکالا ہے۔ اگر وہ یونیورسٹی لیکچرر ہو جاتا ہے تو اکادمی کا زبردست نقصان ہوگا۔''

راہی صاحب نے مجھے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نظریہ Correletive Objective کے بارے میں سوال کیا اور میں تواتر کے ساتھ جواب دیتا گیا۔ بہر حال میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ کشمیری کا پہلا استاد بن گیا۔

ڈپارٹمنٹ میں تعینات ہونے سے پہلے ہی ڈپارٹمنٹ کی طرف سے میری کتابیں ''کأشراد بک تواریخ'' اور ''تہذیب تواریخ'' شائع ہو چکی تھیں۔ ان دونوں کتابوں کی تصنیف میں میرے برادر اکبر مرحوم ناجی منوّر میرے معاون تھے۔ ہم نے راہی صاحب کے ارشاد پر ان دونوں کتابوں کو چند مہینوں ہی میں مکمل کیا۔ راہی صاحب نے کتابوں کی کتابت کروائی اور، ان کے سرورق اس وقت کے ایک مشہور آرٹسٹ سے بنوائے اور دلّی سے چھپوایا۔

ہمارا چھوٹا سا ڈپارٹمنٹ آرٹس فیکلٹی کی عمارت کے مینار کی تیسری اور چوتھی منزل میں تھا۔ راہی صاحب کا کمرہ تیسری منزل میں اور میرا چوتھی منزل تھا۔ ہم کلاس اقبال لائبریری کے گراؤنڈ فلور میں لیتے تھے۔

راہی صاحب اور میرے علاوہ اس شعبے میں سوم ناتھ پنڈت بحیثیت ریسرچ اسسٹنٹ کام کرتے تھے۔ انہیں بھی راہی صاحب نے اشاعتی پروگرام میں شریک رکھا۔

راہی صاحب نے باقی ڈپارٹمنٹ کے سنیئر طلبا اور طالبات کو کشمیری ڈپلوما میں ایڈمشن لینے کیلئے ان سے ذاتی سطح پر رابطہ قائم کیا۔ پہلے سیشن کے کئی طالب علم تقریباً میری عمر کے تھے، ایک دو سال کم یا زیادہ۔ چند ایک پہلے ہی دیگر شعبوں سے ایم۔اے کر چکے تھے۔ ان طلباء اور طالبات کے ساتھ میری خوب دوستی تھی۔ راہی صاحب مجھے روز یہ درس دیتے تھے کہ طلباء سے کسی حد تک دوری بنائے رکھنا ضروری ہے۔ مگر میں اس صلاح پر پوری طرح عمل نہیں کر پاتا تھا۔

راہی صاحب ڈپارٹمنٹ کو ایک علمی شعبہ بنانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے کشمیری شعبے میں ایک انوکھا اشاعتی پروگرام شروع کیا جس میں اس زمانے کے کئی ذہین دانشوروں اور باقی شعبوں کے اساتذہ نے پُر جوش دلچسپی دکھائی۔ مجھ سے رات دن محنت کروائی۔ ہم ان انوکھے خوابوں کو حقیقت کی شکل میں دیکھنے کیلئے دن رات محنت کرتے تھے۔ اکثر ہم دیر شام تک لالٹین روشن کئے وہاں نصاب اور کتابیں تیار کرنے کیلئے کام کرتے رہتے تھے۔ اپنی تفریح کیلئے ہفتے میں دو ایک بار شام کو ریزیڈنسی روڈ کا رخ کرتے تھے۔ ریگل چوک یا پولو ویو سے کھا پی کر اپنے اپنے گھر جاتے تھے۔

ہم نے ڈپلوما کا ایک سیشن پورا ہونے کے بعد شعبۂ کشمیری کو پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ بنانے کا پرپوزل یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو بھیجا تھا۔ اس تجویز پر عمل شروع

کرنے سے پہلے وفد کے ممبران کو جایزہ لینا تھا کہ کیا واقعی کشمیری زبان میں اتنا ادب موجود ہے کہ اسے پوسٹ گریجویشن کی سطح پر پڑھایا جا سکے۔ وفد کے ممبران کو متاثر کرنے کیلئے ہم نے ڈپارٹمنٹ کو کلچرل اکادمی کی کتابوں اور ادیبوں کی تمام میسر کتابوں سے سجایا۔ کتابوں کی اس نمائش سے وفد کے ممبران متاثر ہوئے اور دورے کے فوراً بعد کشمیری ریسرچ سیل کو پوسٹ گریجویشن ڈپارٹمنٹ کا درجہ ملا۔ اس مقصد کیلئے راہی صاحب نے رات دن کوشش کی۔

8 ستمبر 1982ء کی شام آج بھی یاد کر کے میں لرز اٹھتا ہوں۔ ہم ریزیڈنسی روڈ کی ایک دوکان میں اندھیرا ہونے کے بعد تک بیٹھے تھے کہ اچانک ہر طرف سے چیخ و پکار سنائی دی۔ کھڑکی سے دیکھا تو چند منٹوں ہی میں پُر رونق بازار سنسان ہو گیا تھا۔ ہر طرف بھاگم دوڑ تھی۔ دکانداروں نے تیزی سے دکانوں کو بند کیا۔ شیخ محمد عبداللہ کے انتقال کی خبر ہر طرف پھیل چکی تھی۔ ہجوم سینہ کوبی کرتے ہوئے گلی کوچوں سے باہر آ رہے تھے۔ ہمیں بھی نکلنا پڑا۔ کہیں کوئی گاڑی نظر نہیں آتی تھی۔ ہم ہجوم میں سے گزرتے ہوئے بہ مشکل ڈل گیٹ تک پہنچ سکے۔ مجھے حضرت بل یونیورسٹی کیمپس پہنچنا تھا اور راہی صاحب کو وچارناگ۔ ہم بھی لوگوں کی طرح سینہ کوبی کرنے لگے۔ ڈل گیٹ کے پاس انہیں اپنا کوئی پرانا جان پہچان والا ملا جس کے پاس سکوٹر تھی۔ راہی صاحب سکوٹر والے ساتھی کے ساتھ چلے گئے اور میں اپنے دوست گلشن مجید کے ہمراہ ہجوم کے ہم راہ حضرت بل کی طرف چلتا رہا۔

1978ء سے 1985ء تک راہی مجھے رفیق کار سے زیادہ ایک دوست سمجھتے رہے اور عمر کا فرق ہونے کے باوجود میرے ساتھ دوستی نبھاتے رہے۔ ان آٹھ برسوں میں سینکڑوں واقعات ایسے گزرے جو میری یاداشت کا اہم ترین حصّہ ہیں۔ بے شمار محفلیں، سمینار، پکنک، نجی محفلیں اور ہنسی مذاق کے لمحے اب میرا نجی سرمایہ ہیں،

کسی اور کیلئے شاید بے مطلب۔

راہی صاحب کے ساتھ تقریباً آٹھ برسوں کی لطیف یادوں کے ساتھ ساتھ کئی تلخ واقعات اب مجھے لوگوں کی عداوت اور خواہ مخواہ کی دشمنی اور مضحکہ خیز رسّہ کشی کے سوا کچھ نہیں لگتی۔ یونیورسٹی میں جونہی راہی صاحب کی مدد سے میں انگریزی ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے باوجود کشمیری زبان وادب کا استاد بنا، اس زمانے کے اکثر بزرگ ادیب، شاعر، صحافی (میں ان کے نام نہیں لینا چاہتا) میرے خلاف نہ صرف یونیورسٹی حکّام کو لکھتے رہے بلکہ مقامی اخباروں میں بھی میرے خلاف نوشتے شائع کراتے رہے۔ ان نگارشات اور اخباری مراسلوں کی کاپیاں اب تک میرے پاس کچرے کی طرح موجود ہیں حالانکہ یہ سب پچھلے چالیس سال کی مقتدِر شخصیات کی تحریریں ہیں۔ افسوس! اب وہ سب لوگ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

1985ء میں راہی صاحب یونیورسٹی سے پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ بدقسمتی سے چند مہربانوں کی بدولت ہمارے بیچ رنجشیں پیدا ہوئیں تھیں، یہاں تک کہ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ رابطے بھی منقطع کئے۔

اب جبکہ راہی صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں اور میں بھی عہدِ پیری میں ہوں، سب رقابتیں اور رفاقتیں طفلانہ کھیل یا مسخروں کا ناٹک لگتی ہیں۔ ان کو یاد کروں یا بھول جاؤں، یہ سوال بھی بے معنی لگتا ہے۔ اب آخر یہ سب کس لئے اور کس کے لئے؟

☆☆☆

......پروفیسر قدوس جاوید

رحمٰن راہی: کشمیری شعریات کا علمبردار

کشمیر- محض حسن و جمال کا مظہر ہی نہیں، علم و آگہی کا زندہ اور متحرک استعارہ بھی رہا ہے۔سنسکرت اور فارسی شعریات کی آمیزش و آویزش سے جدید کشمیری زبان اور شاعری میں نِت نئے سنگِ میل قائم ہوئے ہیں، ان کی نشاندہی کرنے والوں میں پیر غلام احمد مہجور، عبدالاحد آزاد کے بعد پروفیسر رحمٰن راہی کا اسم گرامی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔رحمٰن راہی کی سب سے نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کشمیری زبان، شاعری اور ثقافت کی نادیدہ بنیادوں کی بازیافت اور امکانات کی تلاش وجستجو کی مضبوط و مستحکم روایت قائم کی۔نئی نسلوں میں اپنی زبان کے تئیں ذوق وشوق کی جتنی اور جیسی بھی لہریں رواں دواں نظر آتی ہیں، عصر حاضر میں ان کا منبع و مخرج ،مرغوب بانہالی، محمد یوسف ٹینگ، غلام نبی خیال اور شفیع شوق کے ساتھ ہی بطور خاص رحمٰن راہی کے افکار و خیالات ہی ہیں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ رحمٰن راہی نے 'پانؔنی کے ''اشٹ ادھیائے''، قُدامہ بن جعفر کے''نقد الشعر'، نظامی عروضی سمرقندی کے''چہار مقالہ'' حالؔی کے مقدمہ شعر و شاعری یا پھر خود عبدالاحد آزؔاد کی ''کشمیری زبان اور شاعری'' جیسا کوئی تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا ہے۔لیکن پھر بھی کشمیری زبان اور شاعری، شعریات، قدیم و جدید رجحانات اور امکانات کے حوالے سے ان کی تحریریں انہیں ایک ''لجنڈ'' ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔اگر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ رحمٰن راہی نے کشمیر کی بلند و بانگ چوٹیوں سے لے کر دور دراز میدانی خطوں تک کی

تصنیفات وملفوظات کے علاوہ کشمیری بولیوں ٹھولیوں ،محاورات ،مترادفات ،ضرب الامثال اور کشمیری رسم الخط ، اِملا اور لفظیات اور لب ولہجہ پر غیر کشمیری زبانوں کے اثرات وغیرہ سے متعلق جو تحقیقی وتنقیدی نظریات ،حتیٰ کہ مفروضات پیش کئے ہیں وہ نئی نسلوں کے لئے چشم کشا بھی ہیں اور راہنما بھی۔

رحمٰن راہی نے ، بقولِ خود، نو جوانی کے ایام میں ہی مہجور،عبدالاحد آزاد،صمد میر، پریم ناتھ بزاز اور غلام رسول نازکی جیسی شخصیات کے فکروفن سے شناسائی پیدا کر چکے تھے ۔ انگریزی اور فارسی میں ایم ۔اے کرنے کے بعد کلرکی بھی کی اور روزنامہ ’’خدمت‘‘ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے ۔ کچھ عرصہ امر سنگھ کالج میں لیکچرر رہے پھر کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی سے وابستہ ہو گئے ، جہاں پروفیسر پنڈِتا اور مرغوب بانہالی کی بھی ہم سفری رہی ۔ بعدازاں جب کشمیر یونیورسٹی میں ’کشمیری زبان وادب کا شعبہ‘ قائم ہوا تو اس کی سربراہی کی ذمہ داری رحمٰن راہی کو دی گئی ۔ اردو اور انگریزی کے شعبے پہلے سے موجود تھے ۔ انگریزی میں پروفیسر وانٹ اور پروفیسر جے رمن ، اردو میں شکیل الرحمٰن اور حامدی کاشمیری جیسی شخصیات کے سبب یونیورسٹی میں ادبی سرگرمیوں کی بہار رہتی تھی اور پھر جب شیخ محمد عبداللہ کی ذاتی دلچسپی کی بنا پر ’’اقبال انسٹی ٹیوٹ‘‘ پروفیسر آل احمد سرور کی سربراہی میں قائم ہوا تو گویا کشمیر یونیورسٹی ادبی سرگرمیوں کا ایک مثالی مرکز بن گئی ۔ پروفیسر مسعود حسین خاں، عالم خوندمیری ، رفیع الدین ہاشمی اور اناِمری شِمل (جرمنی) جیسے عالمی شہرت کے حامل دانشوروں کی آمد سے یونیورسٹی میں ادبی جشن کا سا ماحول پیدا ہو جاتا تھا ۔ سیمینار ، لیکچر اور بحث و مباحثہ کے حوالے سے اساتذہ ، ریسرچ اسکالرس اور عام طلبا و طالبات کو ایسی معلومات حاصل ہوتیں جو کتابی نہیں ، معتبر اساتذہ کے برسوں کے مطالعہ کا نچوڑ ہوتیں ۔ اساتذہ میں رحمٰن راہی بھی ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے ۔ رحمٰن راہی کے ہمہ

جہت مطالعے کی گہرائی کا اندازہ اس وقت ہوتا جب خاص طور پر کسی ادبی موضوع پر پروفیسر جئے رمن کے ساتھ ان کا مکالمہ ہوتا۔ معقولیت کے ساتھ اپنے خیالات کے مدلل اظہار کی قوت، جیسی رحمٰن راہی میں تھی، کسی اور میں کم ہی نظر آتی تھی۔ رحمٰن راہی اردو میں بے تکان تقریر کرتے تھے۔ سلیس اور بامحاورہ اردو خطابت کے معاملے میں ان کا قد اکثر شکیل الرحمٰن اور حامدی کاشمیری کے ہم سر محسوس ہوتا تھا۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، گیان پیٹھ ایوارڈ، کلچرل اکیڈمی ایوارڈ اور دیگر انعامات رحمٰن راہی کی عظمت کے اعتراف نامے تو ہیں لیکن ان کا صحیح انعام یہ ہوگا کہ رحمٰن راہی نے کشمیری زبان کے جن متعلقات کی تحقیق و تنقید کی شروعات کی تھی، نئی نسل کے محققین اور ناقدین انہیں آگے بڑھائیں۔ دراصل رحمٰن راہی جیسے نابغۂ روزگار کے مقام و مرتبہ کو سمجھنے کے لئے صرف ان کی تحریر و تقریر ہی نہیں، ان کے ماحول معاشرہ کی سماجی و ثقافتی اور ادبی روایات و اقدار کی آگہی بھی لازم ہے۔ کشمیری میں رحمٰن راہی کے تین شعری مجموعے دستیاب ہیں۔ ا۔ نوروزِ صبا۔ ۲۔ سیاہ رود جرین منزل۔ ۳۔ کدلہ ٹھس پیٹھ‘‘۔ تنقیدی و تحقیقی تصنیفات درج ذیل ہیں۔ ا۔ کہوٹ۔ ۲۔ شعر شناسی۔ ۳۔ کاشُر شاعری تہ وزنک صورت حال۔ ۴۔ بابا فرید کی شاعری‘ (ترجمہ)۔

رحمٰن راہی کی شاعری تو بہر حال توفیق خداوندی ہے۔ لیکن ان کی تنقیدی کاوشوں میں سنسکرت اور فارسی کے علاوہ انگریزی اور اردو کے دانشوروں اور ناقدین سے کسبِ فیض کی بھی خوشبو آتی ہے اور اسے رحمٰن راہی کا عیب نہیں ہُنر جاننا، ماننا چاہئے، کیونکہ اثر و تاثر یا اخذ و استفادہ کے باوجود رحمٰن راہی کی تخلیقیت اور فکریات کے پاؤں اپنی زبان اور زمین میں ہی جمے رہتے تھے۔

رحمٰن راہی جانتے تھے کہ کشمیر محض حسن و جمال کا مظہر ہی نہیں علم و آگہی کا زندہ اور متحرک گہوارہ بھی ہے۔ ہمالہ کی بلند و بالا چوٹیوں میں براجمان کشمیری برہمن علما

’آنندوردھن، ابھنوگپت، اورممٹ، نیز بودھ مفکرین ناگ ارجن، دِنناگ، بھامہ اور دَنڈِن وغیرہ نے، عالمی پیمانے پر ’’سنسکرت شعریات‘‘ کی تشکیل میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان سے مشرق ہی نہیں مغرب کے دانشوروں نے بھی استفادہ کیا ہے۔ عصرِ حاضر میں عالمی پیمانے پر کم وبیش تمام اہم زبانوں میں، زبان کے جامع نظام، لفظ ومعنی، متن، مصنف، قرأت اور قاری اور خصوصاً ادب میں فن پارے کی ’ساخت‘ کے حوالے سے جتنے بھی نظریات (Theories) اور فن پارے کی تفہیم وتعبیر کے جو اصول اپنائے جارہے ہیں ان سب کا سلسلہ سُوئیس ماہر لسانیات سوسئیر (Ferdinand De Saussure.(1857...1913 کے لسانی نظریات (لیکچرس) سے ملایا جاتا ہے اور اب یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ سوسئیر سنسکرت جانتا تھا۔ بلکہ پانِنی (اشٹ ادھیائے) اور دیگر برہمن اور بودھ سنسکرت علما کے تصورات سے استفادہ بھی کیا ہے۔ خاص طور پر کاویہ شاستر (شعریات) ’النکار شاستر (بدیعیات) اور ’صوتیات‘ سے متعلق سنسکرت نظریات کے سائے سوسئیر کی کتاب ’’عام لسانیات‘‘ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

1888 کے آس پاس اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے سے قبل تک کشمیر میں فارسی کی حکمرانی رہی۔ امیر کبیر میر سید علی ہمدانی، حضرت شیخ یعقوب صرفی، محسن فانی کاشمیری اور مُلا طاہر غنی کاشمیری وغیرہ کی فارسی شاعری کے سبب کشمیر کو ایران صغیر کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ کشمیر کے کئی فارسی شعرا مثلاً میر کمال الدین حسینی رُسواؔ، شہنشاہ اورنگزیب عالم گیر (وفات ۔۱۷۰۷ء) کے فرزند شہزادہ محمد اکبر کے حلقۂ مقربین میں شامل تھے۔ مرزا محسن فانی، مرزا داراب اور مرزا عبدالغنی قبول بھی مغل دربار سے وابستہ تھے۔ ان کشمیری لااصل شعرا کی فارسی شاعری کے طُفیل فارسی زبان (لفظیات) اور شعریات (اصناف، موضوعات، تشبیہات واستعارات) بھی

کشمیر کے شعری ذوق اور ''تخلیقیت'' میں شامل ہوتی گئیں۔ چنانچہ کشمیری زبان اور شاعری، جس کی ساخت سنسکرت اور فارسی دور سے قبل ہی وجود رکھتی تھی، سنسکرت اور فارسی کی آمیزش و آویزش کے سبب نئے سانچوں میں ڈھلتی چلی گئی۔ روپہ بھوانی، دیا چند کاچرو خوش دل، حبّہ خاتون سے لے کر رحمٰن راہی تک کی کشمیری شاعری کی زبان، لب و لہجہ، موضوعات اور اقداری نظام کے حوالے سے، کشمیری زبان اور شاعری کی کثیر الجہات ساخت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس لسانی اختلاط کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے لیکن ساتھ ہی کشمیری زبان کی خالص زمینی بنیادی جڑیں جُزوی طور پر کہیں گُم بھی ہوتی چلی گئیں۔ رحمٰن راہی کی معنویت کے اسرار اس لسانی منظر اور پس منظر کے تجزیہ و تحلیل سے ہی کھُل سکتے ہیں۔

کشمیری زبان، رسم الخط، شاعری اور شعریات پر، سنسکرت شعریات کے علاوہ فارسی زبان اور شعریات اور اسلامی نظریۂ شعر کے کتنے اور کیسے اثرات مرتب ہوئے، اس پر عبدالاحد آزاد، محمد یوسف ٹینگ، مرغوب بانہالی، غلام نبی خیال، پروفیسر ابراہیم، حاجنی صاحب اور پروفیسر شفیع شوق وغیرہ نے اس ضمن میں کئی کئی زاویوں سے تحقیقی اور تنقیدی جائزے پیش کئے ہیں۔ ان کے بعد کی نسل میں نذیر احمد ملک، شاد رمضان اور مجروح رشید اور نذیر آزاد وغیرہ نے بھی ان مباحث کو نئے اکتشافی زاویے دیئے ہیں۔ لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی ابھی بھی کشمیری زبان کی پیدائش، لسانی اجزائے ترکیبی اور کشمیری شاعری کے لفظیاتی نظام میں اجتہادی و اختراعی عناصر کے حوالے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہیں کچھ کم ہے؟ پروفیسر رحمٰن راہی کی معنویت کا مرکزی نقطہ یہی احساس ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اسی ڈور کو سُلجھانے میں صَرف کردی۔ گریرسؔن نے کشمیری زبان کے حوالے سے جو نتائج اخذ کئے ہیں، ان سے اختلاف کے باوجود، ابھی تک بات اس سے آگے نہیں بڑھائی جاسکی ہے۔ رحمٰن راہی

کشمیری زبان کی ساخت اور شناخت کا مستقل اور سب کے لئے قابل قبول ''لسانی بیانیہ'' کے متلاشی تھے اور اس تلاش و جستجو کے عمل میں انہوں نے سنسکرت، فارسی اور دردی، پالی اور مختلف اپ بھرنشوں کی لفظیات، ساخت اور اصوات وغیرہ سے بھی بحثیں کی ہیں۔اس ضمن میں انہوں نے تحریر سے زیادہ تقریر کے وسیلے سے ہی سہی جو مفروضات، امکانات حتیٰ کہ نتائج قائم کئے ہیں، ان کی حیثیت غالباً قولِ فیصل کی تو نہیں لیکن اتنی بات تو طے ہے کہ ان کی کوششوں سے برِ صغیر میں کشمیری زبان اور شاعری کے معیار اور وقار میں نئی جہات اور تحقیق وتنقید کے نئے امکانات پیدا ہوئے۔

رحمٰن راہی کشمیری کے مسلم الثبوت شاعر، محقق، نقاد اور دانشور کے بطور مقبول رہے ہیں۔لیکن اردو زبان اور شاعری سے ان کی وابستگی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ رحمٰن راہی تقسیم ملک سے قبل ہی اردو/کشمیری میں مشق سخن شروع کر چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرکار/دربار، تھیٹریکل کمپنیوں اور علامہ اقبال کے اشعار کے طُفیل جموں کشمیر میں اردو لِنگوا فرینکا تو بن ہی چکی تھی۔ طبقہء اشرافیہ کے لئے اردو دانی اور شعر خوانی کو ذریعۂ عزت بھی تصور کیا جانے لگا تھا۔غلام رسول نازکی، رسا جاودانی، شہہ زور کاشمیری، نشاط کشتواڑی، شوریدہ کاشمیری وغیرہ کی اردو شاعری ریاست اور ریاست کے باہر بھی مقبول ہو چکی تھی۔(یہ سبھی شعرا اردو اور کشمیری میں بھی شاعری کی استعداد رکھتے تھے)اور جموں وکشمیر کے ادب دوست حضرات نازکی صاحب مرحوم کے اس دعوے پہ یقین رکھتے تھے کہ

کشمیر کا رہنے والا ہوں ، اردوئے معلّٰی لکھتا ہوں
اس دیس میں مجھ سا کوئی بھی اردو کا سخنور ہو نہ سکا

رحمٰن راہی پر اس منظر نامے کے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ان کی شاعرانہ اور تحقیقی وتنقیدی صلاحیتیں آزادی کے بعد ہی سے مسلسل ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہیں۔

رحمٰن راہی نے جب شعر وادب کو زندگی اور ذوق کا بہانہ بنایا، اس وقت تک کشمیر صرف فارسی اور کشمیری کا ہی نہیں اردو کا بھی ایک باوقار مرکز بن چکا تھا۔

ہر چند کہ رحمٰن راہی کی شہرت کشمیری شاعر اور دانشور کے طور پر ہے لیکن ان کی شاعری کی ابتدا اردو سے ہی ہوئی 1947ء کے آس پاس انہوں نے اردو میں متعدد نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ شروع میں رحمٰن راہی نے روایتی انداز کی اردو غزلیں کہیں، یہ غزلیں اب دستیاب نہیں ہیں۔ خود رحمٰن راہی نے بھی ان کی نشاندہی نہیں کی ہے البتہ اگر لاہور اور جالندھر کے اخبارات ورسائل کھنگالے جائیں تو ممکن ہے بعض اردو غزلیں اور نظمیں مل جائیں۔

رحمٰن راہی کی شاعری کے فکری اکتسابات کے حوالے سے ایک اور اہم نکتے کی نشاندہ بے جا نہ ہوگی۔ چونکہ 1936ء میں پریم چند کی صدارت میں لکھنوء میں منعقدہ ''انجمن ترقی پسند مصنفین کی کامیاب کانفرنس کی تجاویز اور تقریروں کا پورے برصغیر میں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی خیر مقدم کیا۔ خاص طور پر، پریم چند کے صدارتی خطبہ کے اس جملے نے کہ

''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا''

کم وبیش ہر زبان کا ادبی مزاج بدل دیا۔ کشمیر کے شاعر اور ادیب بھی اس سے پیچھے نہیں رہے۔ چنانچہ ۱۹۴۰ کے آس پاس کشمیر میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہوئی۔ پریم ناتھ پردیسی، اختر محی الدین، علی محمد لون، امین کامل، نور شاہ، مہندر رینہ، قیصر قلندر اور رحمٰن راہی بھی کچھ آگے پیچھے اس انجمن سے وابستہ ہوتے چلے گئے۔

اس دور میں رحمٰن راہی نے جو غزلیں کہیں ان میں ترقی پسند خیالات جا بجا ملتے ہیں۔ مثلاً یہ چند اشعار دیکھتے چلیں۔

نقیبِ نو نے نئے دن کا صور پھونک دیا
اندھیرا ٹوٹ چکا، سونے والوں کو تو جگاؤ
قبول، جنت ِ فردا کا وعدہ آج مگر
مرے جہاں میں جفا کے جہنموں کو بجھاؤ
زمانہ تھام چکا ہے بغاوتوں کا علم
قدم ملا کے رفیقو ، قدم بڑھاؤ، بڑھاؤ
اگرچہ راہ بھی خطرناک ہے، سفر بھی دراز
مرے شفیق بزرگو ، مجھے ابھی نہ ڈراؤ

ان اشعار میں واضح طور پر اہل کشمیر کی صورت احوال کی بازگشت ہے۔ رحمٰن راہی کی اسی قبیل کی ایک اور غزل میری ڈائری میں محفوظ رہ گئی ہے۔

نہ بُجھ سکے گا کبھی آندھیوں سے اب یہ چراغ
حیات نے نئی منزل کا پا لیا ہے سُراغ
فسانہ ہائے غمِ دہر طول کھینچ گئے
ہنسی حیات کی چھلکا رہی ہے اپنے دماغ
گلوں کو مل ہی گئی آخرش نوید بہار
خزاں کے لاکھ جتن پر بھی لہلہائیں گے باغ
نوائے وقت ہے راہیؔ کی ہر صدائے جواں
نفس نفس میں جل اٹھے ہیں آج اس سے چراغ

اور اگر دیکھا جائے تو شاعری کا یہ انداز، جوش اور طنطنہ سے بھرا ہوا یہ لب و لہجہ صحیح معنوں میں نوائے وقت تھا۔ چنانچہ اس دور کے دیگر شاعروں کے یہاں بھی اسی انداز کے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً رحمٰن راہی کے معاصر شاعر اور نقاد امین کامل نے اپنی غزلوں

اور خصوصاً نظموں میں قدرے شدت پسندی نظر آتی ہے۔ایک نظم کے یہ اشعار عوامی مسائل اور جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں :

جو آگ لگائیں کھیتوں میں　　منہ بند کریں برساتوں کا
اس امن کی پیاسی دھرتی پر　　کیا کام ہے اِن بد ذاتوں کا
کیا ان کو سُہانی صبحوں کے　　نورانی نظارے ڈستے ہیں
سناٹا انہیں کیا بھاتا ہے　　سُنسان اندھیری راتوں کا

امین کامل کے یہاں بعض اوقات مشہور ترقی پسند شاعروں مخدوم محی الدین اور جوش ملیح آبادی کی طرح گھن گرج اور للکار بھی سُنائی دیتی ہے، مثلاً

آندھیو آؤ اُبلتے ہوئے لاوؤ آؤ
روٹیں لو حادثو ،اے آندھیو، پیہم چلو

اردو میں تو نہیں لیکن کشمیری میں شعری مجموعہ 'نوروزِ صبا' کے علاوہ بھی رحمٰن راہی کے نظموں اور غزلوں کی خاصی تعداد دستیاب ہے۔رحمٰن راہی کی جدید کشمیری شاعری کے بارے میں شفیع شوق، شاد رمضان، مجروح رشید، گلشن مجید،اور فاروق فیاض وغیرہ زیادہ بہتر طور پر لکھ سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اخیر اور اکیسویں صدی کے اوائل تک آ کر رحمٰن راہی کو ''مابعد جدیدیت'' سے بھی دلچسپی ہو گئی تھی ۔شعبۂ اردو کشمیر یونیورسیٹی کے مُجلہ ''بازیافت'' میں مابعد جدیدیت: تحفظات و امکانات، ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت، ، مابعد جدید فکشن ،اور شاعری کے حوالے سے میرے مضامین ۹۹،۹۸. سے ہی شائع ہونے لگے تھے اور رحمٰن راہی سوسئیر کے 'نظریہ لسان'، رولاں بارتھ کے 'پس ساختیات، ،ژاک دریدا کے 'ردِ تشکیل ، وغیرہ نظریات (THEORIES) کے حوالے سے رائے زنی بھی فرماتے۔مارکسیت اور ساختیات کے رشتوں،ادب میں نظریہ سازی

کی اہمیت، متن میں معنی، مصنف، زبان اور منشائے مصنف کی ترسیل وابلاغ کے مسائل پر وہ اکثر شفیع شوق، مجروح رشید اور مجید مضمر کی موجودگی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ ملارمے (MALLRLME) کے اس قول پر کہ،

It is Language which speaks, Not the Author

اسی طرح ملارمے سے مستعار رولاں بارتھ کے اس فقرے پر کہ

Writing Writes Not Author پر مشرقی شعریات کو بیچ میں رکھ کر خوب بحثیں بھی ہوتیں۔

اور میرا خیال ہے کہ رحمٰن راہی کی حالیہ شاعری اور ان کے تازہ تنقیدی مضامین میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ مابعد جدیدیت کے عناصر کی بھی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

رحمٰن راہی نے ''کہوٹ' کے علاوہ کشمیری اور اردو میں بھی جو مظامین لکھے ہیں مثلاً ا۔ ''کشمیری شاعری....دور جدید'' ۲۔ معاصر شاعری اور ابلاغ کا مسئلہ''۔۳۔ موجودہ سماجی ساخت میں، تخلیقی ادیب کا رول''۔ وغیرہ، ان میں کشمیری، زبان، زمین، ضمیر اور ذہن کے حوالے سے، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے ماورا، شاعری کی تخلیق سے لے کر شعریات کی تفہیم وتعبیر تک سے متعلق رحمٰن راہی کے افکار و خیالات، ایک کہیں زیادہ تازہ کار، قابل قبول اور معتبر 'میزان' کا حکم رکھتے ہیں۔ مرغوب بانہالی کے بعد رحمٰن راہی کی خدمات اور مقام ومرتبہ کی تشفی بخش تفہیم وتعبیر اہل کشمیر پر ایک قرض ہے جسے چُکانا ہی ہوگا۔ لیکن فی الحال تو ہر شخص بس اتنا ہی کہہ رہا ہے،

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دِن اور

☆☆☆

......شاؔد رمضان

کشمیری سے ترجمہ ......سید محمد مبشّر رفاعی

رحمان راہی: بلند قامت شاعر و شخصیت

رحمان راہؔی کا غالبؔ کی خدمت میں اپنی غزل بھیج کر نذرانے کے طور پیش کرنا اور انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام لکھوانے کی تمنا، محض شاعرانہ عروج پانے کی طلب ہے یا وہی اشتیاق جو کسی بھی بیدار حس شاعر کو غالب کی شاعرانہ عظمت کا مدرک بنا کر اُس بڑھیا کی مانند آمادہ کرتا ہے، جو روئی کا فقط ایک گالہ لے کر خریدارِ یوسف بننے مصر کے بازار آ پہنچی تھی ؟ یا پھر ان دونوں شاعروں کی فکری اور تخلیقی اُڑان میں ایسی کوئی یکسانیت ہے، جو اِس دعوے کو دلیل کی بنیاد بخشتی ہے؟ حالانکہ غالبؔ غزل کے شاعر ہیں جبکہ رحمان راہؔی بنیادی طور نظم کے شاعر۔ یہ سوال جس قدر تشنہ لب ہے اُسی قدر بحث طلب بھی ہے۔ بحث طلب اس لئے کہ موجودہ دور کے ہم عصر شاعروں کے مقابلے میں رحمان راہؔی کے کلام پر سب سے زیادہ تنقیدی بحث کے باوجود ابھی تک راہؔی کے شاعرانہ فن اور فکر کو صحیح معنوں میں نہ پہچانا گیا ہے اور نہ پرکھا گیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے راہؔی ایک ہمہ جہت شاعر ہیں، جن کے ہاں حیات اور کائنات کے ازلی اور بنیادی مسائل و معاملات سمیت انسانی زندگی کے اندرون و بیرون حادثات کے ظاہر و باطن گوشے شعوری طور شاعری کے موضوع بنائے گئے ہیں اور تشنہ طلبی اس لئے کہ قدر و قیمت اور معیار پر کھنے کیلئے راہؔی کی شاعری مستقبل کے نقاد کی

منتظر ہے جس کے سامنے راہیؔ نہیں بلکہ فقط اُن کا کلام ہوگا۔ بقول راہیؔ:

معنہِ پرور آسہِ کتھ مولناونس
ٹارِ ہرگاہ نَے کھسکھ منساونس

(سیاہ رودِ جرِ ن منز)

تاہم شاید دور حاضر کے کسی بھی سنجیدہ شعر شناس قاری (ناقد......اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھے) کو اس بات سے انکار نہیں ہوگا کہ مجموعی طور کشمیری غزل کے سفر اور صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر اس خزینے میں سے راہیؔ کی غزل غالبؔ کو نذرانے کے طور بھیجی جائے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے اور ساتھ ہی اگر انہیں راہیؔ کی غزل کا فکری پس منظر و پیش منظر سمجھ آئے تو انہیں اپنے مصرعے کی بازگشت سنائی دے گی؛

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور اشعار کے تجربات کا تخلیقی عمل اور اظہار کی لسانی صورتِ حال دیکھ کر غالبؔ ضرور اپنا یہ شعر گنگنائیں گے :

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی میرے حرف پہ انگشت

اس پس منظر میں تھوڑی بہت گفتگو کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے جب راہیؔ کی شاعری کا حوالہ دے کر کچھ عجلت پسند قلمکار یہ تاثر پیدا کرتے ہیں کہ بیسویں صدی کی جدید شاعری، انیسویں صدی کی صوفی شاعری کے مقابلے میں موضوع اور زبان کے اعتبار سے عام قاری کے فہم و ادراک سے پرے ہے۔ اُن کے مطابق جدید شاعری ایک عام قاری کی سمجھ سے بالاتر ہے اور اس کو جدید شاعری سے ذہنی یا روحانی سکون حاصل نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اس قبیل کے لوگوں کو عالمی شاعری کے تناظر میں اعلیٰ

شاعری کے تخلیقی معیار کا ادراک کر کے یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ کیا اِن لوگوں کو شمس فقیرؔ کا یہ کلام :

شُنیاہ گُرڈھی تھےٖ اوس میوٗن اولُے
أمی عشقہٕ نارَن زولیے
کنِزس ژٕوونم روٗنہِ منزولُے
شۆنی شۆنی بوزان آس

رحمٰن ڈار کا یہ کلام :

سمیکس سٕدرس سکھ پیوٗم پکُنے
تھکہٕ پیٚنڈ وٕچھمس نہٕ گُنے
تران تران پأزپر ٕپھٹ مو
تمہِ دادِ چھَس نو بلان

نعمہؔ صاحب کا یہ شعر :

بہ ژایوس سٔنز ژۄرے شمع زألتھ زۄرے
وُچھُم تتہ شوروو تھٕمُت زورعٔشقہٕ نارَسے

یا احمد بٹوارؔی کا یہ شعر :

بہ نے نیہٕ ستۍ سوز بوزنأوِنس
سوزن ڈٕہتھ نی نَس
منہٕ کے یار بلہٕ تَن چھَلہٕ نأوِنَس
چھأوِنس ستۍ مدنَس

وغیرہ سمجھ میں آتا ہے۔ ایک اور توجہ طلب حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور صوفی اور جدید شاعری کا مرکز و محور ایک ہی ہے۔ یعنی وجودِ آدم اور اس کے ساتھ وابستہ حیات و

کائنات کے ازلی مسائل ومعاملات تک رسائی یا غیر رسائی کا سوال۔

آسُن پئُن بہٕ تھکِہٕ ہا، ناسُن چھُ اَر ووٗنتھ
باسُن تہِ اَس ارزَتھ، سہٕ تہِ ما چھُ تیوٗت ارزان

(شآدرمضان)

وجودِ آدمیت کے ان بنیادی سوالوں کی مناسبت سے باقی زبانوں کے قدآور شاعروں سمیت کشمیری زبان کے بالغ فکر صوفی اور جدید شاعروں کے آہ ونالے اس دلدوز آواز پر اختتام کو پہنچتے ہیں :

ژٕیُس چھُکھ تہٕ سہٕ   میوٗن فریاد بوز

یہی فریاد اور احتجاج لل دید کو بہ آوازِ بلند کہنے پر مجبور کرتی ہے :

کینٛہہ نتہٕ کینٛہہ نتہٕ کینٛہہ نتہٕ کیاہ

شیخ العالمؒ کو تلوار کی دھار پر چڑھاتا ہے :

آوُلن وِلمہٕ کنہٕ لگہٕ پیٹھے

اور محموٓد گامی کے اندر ایک انقلاب پیدا کرتا ہے :

کرسا میوٗن نیائے اندٕ ے

رحمٰن راہؔی اسی احساس کا ایک الگ انداز میں اظہار کرتے ہیں :

ژھیوٚی ژأنگی اَتھَن ہٕندی کتھَن تہٕ کوتر موٗدی
سیاہ روٗد ٕجریٚن منٛز گو سانہِ کوٚت پیٹھ دژاکھ

☆

بےٚ نیب قأفلہ ٕگرداولیٚن اندر سرگرم
خموٗش ژأنگی گوپھن سِیہہ لبن چھہِ سنان

اور امین کاملؔ کا یہ خوبصورت تخلیقی اظہار :

زانِہہ تہِ رَتہٕ باندِ اَتھن ہیٚیہِ ہے زمانے مےٚ خبر
ظلمتس ماغڑِ اَنان سِریہِ تھُران راتھ گیم

ہاں! یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ فکری مرکز کی یکسانیت کے باوجود صوفی شاعر اور باخبر جدید شاعر کے درمیان ایک نمایاں فرق ہے۔صوفی شاعر کی فریاد اور احتجاج کی انتہا مقرر ہے جبکہ جدید شاعر کی فریاد اور اس کا احتجاج غیر معلوم منزلوں کی صدا ہے۔یعنی صوفی شاعر کے انکار میں اقرار پوشیدہ ہے جبکہ جدید شاعر ''موجود و غیر موجود'' کی صورت حال میں مبتلا ہے۔ایک عام قاری کس طرح صوفی اور جدید شاعری کے ان بنیادی اسرار و رموز کا ادراک کر سکتا ہے۔! ہر دور کی اعلیٰ شاعری کے اپنے سخن سنج اور سخن فہم قاری ہوتے ہیں اور اس کے برعکس ایک عام قاری شاعری کی موسیقی اور اس کے طرز سے حظ حاصل کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ درجے کا ہر ایک شاعر اپنے سخن فہم قاری کی تلاش میں رہتا ہے۔اسی لئے رحمان ڈار نے کہا ہے کہ ''بوزن تگہ بوز کنہٕ'' اور شمس فقیر نے کہا ہے، ''سہل چھا معنہ زانن''۔رحمٰن راہی کے اس طرح کے شعر کو سخن فہم اور شعر شناس قاری نہ ملا تو شعر کی ادائیگی ناممکن ہے:

سُہ باس۔۔۔۔۔رأژ ہنٛدٕ ین پتھ ونن حبش ہو ہرائے
سُہ شعر۔۔۔۔۔۔تا پہ سنگر پھاسہٕ وِتھ پھولان نٔز شرٛاکھ

یا

ژٕ شوقہ زِنٛہٕ زٕژن کتی کتألی جامہٕ سُوان
مےٚ لانہِ شبنمہٕ پھیرِس چھُ سِری یہٕ دٕسل گرٛاکھ

جس قاری کو ''زُونہٕ زٕژَن کُتألی جامہٕ سُوَن'' یا پھر ''شبنمہٕ پھیرِس چھُہ لأنس سرِ یہ دٕسل گراکھ'' جیسے اشعار کے تخلیقی اظہار کے علامتی برتاو اور اس کے فکری پس منظر کے تحت انسانی زندگی کی المناک صورت حال کی سمجھ ہی نہ ہو، وہ ضرور راہی

صاحب کی شاعری کی زبان کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے ایسے خوبصورت لسانی انداز میں تخلیق کئے گئے اعلیٰ شعری تجربے کو بھی سمجھ سے بالاتر جدید شاعری کے الفاظ کا استعمال قرار دے گا :

سوٗے سوٗرمہٕ چشِم بوٗلی تہٕ سُے سروِ قدل موج
مَس ہِندر مےٚ دوٚد خاب تہٕ بوٚ ندوٗق وَزان اٗسی

☆

اگر یِہ میوٗن صَدا گُنبَدن تہِ ژٕہ دِتھ چوٚ
یِہ انتظار نہ محشر نہ کربلا باسی

☆

ووٗتھان تہٕ کاڈکڈان زن قدیم کاٗلی جنگل
بہان تہٕ پوٗشہِ وٕتھر زَن دِوٕری پَلَن چھہِ سنان

☆

اسرٲری دیوٚت صحیفہٕ تہٕ تارَکھ نبُک نموٗد
پٕری زَن تہٕ فکرِ تری نہٕ یم آیات کری زِ کیاہ

جو لوگ جدید غزل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے وقت غزل گائیکی کی بات کرتے ہوئے اس کے سُر تال کو اس کی خوبی مانتے ہیں اور جدید غزل کی نکتہ چینی کرتے ہیں، وہ خود بھی جانتے ہیں کہ اعلیٰ شاعری گانے کے بجائے پڑھنے کی شے ہے اور ہمیں چاہئے کہ ہم راہؔی کی غزلوں کے تخلیقی حُسن اور فکری پرواز کو گائیکی کی حدود میں قید نہ کریں۔ یہ سُر تال کی محتاج نہیں بلکہ تحت اللفظ پڑھنے کی ایک شے ہے۔ اس کے باوجود اس قبیل کی کشمیری غزل ایسے کشمیری گلوکاروں کی منتظر ہے جن کا فن نور جہاں اور جگجیت سنگھ جیسے عظیم فنکاروں کی مانند ہو۔ یہ بات اہم اور قابل غور ہے کہ کائنات

کے اسرار اور انسانی وجود کی ازلی صورت حال سے متعلق جو کچھ بھی عظیم مشرقی شعراء کے اذہان میں آیا، غزل اس سوچ کی ترجمان ہے۔ لہٰذا شمس الرحمان فاروقیؔ کا یہ قول اہمیت کا حامل ہے کہ غزل بنیادی طور بالواسطہ اظہار اور غیر روایتی موضوعات کی شاعری ہے اور اس میں روزمرہ کی زندگی کے عملی تجربات اُسی صورت میں قبول ہو سکتے ہیں، جب اس کا بیان استعارات میں ہو۔

عالم جنونِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی
(غالبؔ)

☆

میں نو دمیدہ بال چمن زاد طیر تھا
پر گھر سے اٹھ چلا سو گرفتار ہو گیا
(میر تقی میرؔ)

☆

کتھ زخم خورِد باغِر منز تظرِ میُل سپُد
لب تشنہٕ لولہٕ وأنجہٕ آیُت سراب ہیوٚ
(راہیؔ)

کیا کوئی ایسا حساس قاری ہے جس کو اس بات کا ادراک نہیں ہے کہ اعلیٰ شاعری وہی ہے جو علاقائی اور مقامی حدود سے نکل کر آفاقی وسعت حاصل کرتی ہے۔ شاعرانہ عظمت کی بنیادی اور اہم خصوصیت اور وصف یہ ہے کہ شاعر حقیقت کا ترجمان بن کر انسانی صورت حال کی عکاسی کرے۔ اس کے لئے مطالعہ، شعر گوئی کا ہنر اور زبان پر دسترس ہونا لازمی ہے۔ کشمیری میں رحمٰن راہیؔ کی غزل اس قبیل کی اعلیٰ اور آفاقی

شاعری کی ترجمان ہے۔فکری اعتبار سے دیکھا جائے تو للؔ دید سے لے کر مہجورؔ تک شعرا کے کلام میں پائی جانے والی کشمیری زبان کی وسیع شعری روایات سے راہیؔ کی غزل کو بالیدگی ملتی ہے۔

نامور کشمیری نقاد محمد یوسف ٹینگ راہی صاحب کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

''راہیؔ کشمیری زبان کا پہلا ایسا شاعر ہے جس نے مشرق اور مغرب کی ادبیات کے سنگم کیلئے اپنی مادری زبان کو نہر سوئز کی مانند استعمال کیا۔''

وہ مزید کہتے ہیں کہ رحمٰن راہیؔ کی مثال ایک ایسے جداگانہ اور منفرد سمندر کی ہے جس نے کئی دریاؤں کو اپنے وجود میں سمویا ہے۔ایک ایسا سمندر جس کی زمین بھی اپنی ہے اور آسمان بھی اپنا۔ہوا بھی اپنی اور پرندوں کی چہچہاہٹ بھی اپنی۔راہیؔ کی ایسی ہی غزلیں روایت کو زندہ کر کے جدید نغموں کے ساز کی عکاسی کرتی ہیں :

تمبراہ چھےٚ جوأنی تہٕ ژیہٕا شوقہٕ نژُن گوٚژھ
دامانہٕ ڈٕنان راتھ چھےٚ جانانہٕ کٕتھن وات

☆

صبر کریوٚ تیٚمی از تاں سہٕ دل تہٕ خود راہ گوٚو
مےٚ نو ووٚنی روٚدنہٕ پانس پیٹھ تختیار وولو

یہ راہیؔ کے روایت پرور اظہار کا خوبصورت ساز ہے۔اب دیکھئے کہ اسی جدید آگہی کے جدید انسانی روداد کا اظہار کیسے کرتے ہیں :

واقع یہ تاپہٕ کرٛاے تہٕ طالع یہ العطش
ویاپتھ گمانہٕ ناگ ظلماتھ کری زِ کیٛاہ

☆

موکھڈیوٗ نٹھنس تہٕ شفقہٕ شفق پھوٚل گولاب ہیوٗ
پھوٚر بوومس تہٕ روو پریشان خاب ہیو

انسان کی مجموعی المناک صورت حال کے نالہ وفغاں کا اظہار بھی دیکھئے :

ژھیٚوے ژاۓ نگی اتھن ہندی کتھن تہِ کوتر موٗدی
سیاہ روٗدِ جرٕن منٛز گوسانہِ کوٚت پپٛھ دژاکھ

☆

تھرِ اوس تھکٕن کیٛت یہِ پتم پوٚش تہِ تھیٚکہِ ہے
دَپھ پوٚس ہران مُشک تہٕ توشان چھُہ ہِتل واو

☆

زندِ روزنہٕ باپتھ چھی مران لُکھ ژٕ مرکھنا
لوٗ تہِ پاٗٹھی چیٚکھا پیٛالہٕ کھو اُف تہِ کرکھنا

زندگی کی تلخ حقیقت کا ادراک کرکے، امیدوں کے موسم بہار کا لطف لے کر، زندگی کا ازلی سچ جان کر، زندگی جینے کا ارمان۔ ارمانوں کے اسی خوبصورت احساس میں شاعر ایک ایسی تاریک بستی کی شبیہ کی تخلیق کرتا ہے، جہاں شدید برفباری ہو رہی ہے اور شبنم کا ہر قطرہ آگ اگلتا ہے۔ اسی تاریک ماحول میں اپنے نورانی محبوب کی آمد کی التجا تا کہ ظلمات کا یہ ماحول جگمگا اُٹھے۔ ایک طرف ظلمات اور دوسری طرف محبوب کا نورانی چہرہ۔ محبوب کے آنے سے تاریکی میں انوار کی تجلی، ایک خوبصورت احساس ہے اور احساس کا ایک مضبوط تخلیقی اظہار شاعر کی لسانی اور تخلیقی سخنوری کا واضح ثبوت ہے۔

تتہِ لوِ چھُ کھسان نارٕ بُرپژٕ وِ چھُ وسان شین
ہَیے بژٕ گہٕ چھُژی ! میوٗن کرٕ ہُن گام ترکھنا

اندھیرے میں ڈوبی اس بستی کی صورت حال کچھ عجیب ہے اور کچھ عجب بھی۔ جہاں نہ کسی دریچے کے چلمن میں کوئی جنبش ہے اور نہ کسی برآمدے میں کوئی چراغ روشن۔بستی کا حال معلوم کرنے کیلئے زاغ ہَوا کو بھیجتا ہے۔زاغ اور ہوا، اظہار اور سماعت کے کردار ہیں، جن کا استعمال علامتی طور کیا گیا ہے۔اس علامتی اظہار کے پس پردہ انسانی صورت حال کی خستگی کا حال عیاں ہوتا ہے، جو زندگی اور زمانے کے درد کا احساس دلاتا ہے۔

نہَ چھُ دارِڈلان پرِ نہَ چھُ براندٕ دزان ژونگ
واوس چھہُ دپان کاو ژٕ معلوم کرکھنا

شبیہہ کاری راہیؔ کی غزل کا امتیازی حسن ہے۔شعر کے تجربے میں شبیہ کے اظہار سے وہ اپنے موضوع کو اس انداز میں صورت حال کی شکل دیتے ہیں کہ قاری کی آنکھوں کے سامنے منظر چھا جاتا ہے اور وہ محو ہوکر تجربے میں ایک ڈرامائی صورت حال دیکھتا ہے، جس میں حیات سے لبریز کردار اور ان کا گرد ونواح آنکھوں کے سامنے رقص کرتا ہے۔یہ شبیہہ کاری انسانی برتاؤ کی جادوگری ہے اور یہی لسانی جادو راہیؔ کی غزل کا فن ہے۔راہیؔ کی شعری زبان اگرچہ کہیں کہیں روایتی شعری زبان سے الگ محسوس ہوتی ہے، تاہم راہیؔ کے مجموعی شعری مزاج میں گھل مل کر اور شعری تجربے کے قرب سے بہرحال قاری اس جدید زبان سے واقف ہوتا ہے اور وہ قبول کر ہی لیتا ہے کہ راہیؔ کسی اجنبی زبان میں نہیں بولتا ہے بلکہ وہ روزمرہ کی عام زبان کا نیا خدوخال ظاہر کرتا ہے۔اس کے باوجود شعری تجربے کی اڑان، تہہ داری اور معنی خیزی اپنی لسانی صورت ازخود دریافت کرتی ہے۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ غزل کی ''داخلیت، غیر واقفیت اور بالواسطگی'' اس کی بنیادی اور انتہائی پہچان ہے۔یہی وجہ ہے کہ شعر پڑھنے والے کیلئے بھی زبان شناس ہونا لازمی ہے تاکہ وہ اُسی لسانی

خصوصیت کے ذریعے غزل کی بلواسطہ شبیہہ تک پہنچ سکے۔

تہٕ معنہِ کیا چھُہ سپارَن تہِ زانہِ سُۓ تیٚمۍ پوٚر

قدر شناس خطن ہٕنٛدی، اتھن نمن چھِ سنان

رحمٰن راہیؔ کی غزل روزمرہ کے عام واقعات، حالات اور تجربات کے بیان سے زیادہ اُس بنیادی صورت حال کی جانب توجہ دلاتی ہے۔ یہ انسان مقامی حالات میں زندگی گزارنے والا کوئی خاص فرد نہیں بلکہ حیات اور کائنات کے فکری پس منظر میں مبتلا ہوا ایک حساس انسان ہے۔ جدیدت کے اس فکری پس منظر کے تحت صدیوں کے تصورات اور اقدار منتشر ہوگئے۔ اس صورت حال نے ایک نئی سوچ اور ایک نئے ردعمل کو جنم دیا، جس کے تحت زندگی کی بے معنویت کا احساس پھلا پھولا۔ وہ بھی ایک وقت تھا، جب سنیاسی کی تھیلی میں رازوں کے طلسمات ہونے کا یقین ہوا کرتا تھا۔ سنیاسی کے ہاتھوں میں جادو ہوا کرتا تھا اور الفاظ میں مٹھاس۔ لیکن کوئی ایسا حادثہ پیش آیا کہ سنیاسی کے ہاتھوں کا جادو بے معنی ہوکر رہ گیا اور لبوں پر خاموشی چھا گئی۔ سنیاسی جنون کی حالت کا شکار ہوکر موسلا دھار بارش میں ایسی راہوں کے سفر پر نکلتا ہے، جن کی منزل کا کوئی پتہ نہیں۔ شعر کے متعلق یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ عقیدت کے چراغ بجھ گئے اور معنی پرور باتوں کے لب خاموش ہوگئے۔ صورت حال کو معلوم کرنے کیلئے سنیاسی سخت تیز بارش میں رخت سفر باندھ لیتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ عصر حاضر کے انسان کے ایقان کا چراغ بجھ گیا اور الہام کے معنی گم ہوگئے۔ اس غیر یقینیت کے تاریک عالم میں جوگی اس یقین کی منزل کی تلاش میں نکلتا ہے۔ شعر کا راوی آواز دیتا ہے کہ اے جوگی، اس صورت حال میں تم کہاں کی طرف اور کیا کرنے جارہے ہو۔ اس قبیل کے تجربے کو اسی قسم کی استعاراتی اور علامتی زبان کی ضرورت ہے۔ لہٰذا شاعر پر اجنبی زبان کے استعمال کا الزام کیونکر عائد کریں۔ دوسری اہم بات

یہ ہے کہ اس شعر میں کون سا ایسا لفظ ہے، جو ہماری عام زبان میں موجود نہیں ہے۔ البتہ ان الفاظ کو علامتی طور استعمال میں لایا گیا ہے، جس کا ادراک قاری کو اسی اعتبار سے کرنا ہے۔

ژھیۆی ژأ نگو اتھن ہندی کتھن تہٕ کوتر مؤ دی
سیاہ رؤد جرٕن منز گوسانہ کۆت پٹھ دژا کھ

اس قبیل کے اشعار کی عصری آگہی انسانی زندگی کے کرتب یاد دلاتی ہے۔حقیقت حال یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار کا ڈرامائی رنگ روپ ہی ان کا حسن ہے۔الفاظ کے انتخاب کی موزونیت اور اظہار کے اختصار کو راہیؔ کا ایسا استعاراتی برتاؤ دستیاب ہے، جو شعر کے ہمہ جہت معنی کے امکانات تلاش کرتے کرتے شعری تجربات کے ممکنہ دروازے کھول دیتا ہے۔راہیؔ کی غزل کے ایسے اشعار کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ شاعری میں ابھرنے والا کردار اپنے گرد ونواح اور اپنے زمانے کے پسِ منظر کے ساتھ ابھرتا ہے اور وجودِ حیات کی مانند اپنا حال بیان کرتا ہے۔

سہٕ خوف أر کرِتھ زہو پھرٕ کان ضمیرس منز
نجاتھ زون متنوٕ تاں قبر تہٕ خاموشی

☆

زندگی چھنہٕ شری ہال گنڈٕ نی یِکھ تہٕ کڈ کھڑل
یہٕ چھےٚ پھاسی تہٕ منصوٗر لگےقیس تہٕ محمل

☆

زہنہٕ بروٗنہہ نہ ژےٚ کانہہ شوق سرتھ میأنی نظر بند
زندٕ پانہٕ چھُ جانانہٕ یہٕ سیلاب تہٕ ساحل

تمام زبانوں کی شاعری کی طرح ہی کشمیری شاعری میں بھی عشق ایک اہم

موضوع رہا ہے جس میں انتظار کا کرب، وصل کا اشتیاق، ملاپ کی تمنا اور مسرت کی کیفیت ابھرتی ہے۔البتہ راہیؔ اپنی غزلوں کے اشعار میں اس موضوع کو بھی بڑے پیمانے پر جدید انسان کے وجودی سوچ اور روحانی کرب کے نزدیک لاتے ہیں۔شعر کے تجربے میں اسی عاشق اور معشوق کی ملاقات فرحت کی بجائے تلخ احساس کو اجاگر کرتا ہے۔عاشق کو معشوق کا انتظار ہے اور قلب معشوق کے وصل کی تشنگی سے العطش العطش کی صدا دے رہا ہے۔البتہ ملاپ کی گھڑی آبِ وصل سے عاشق کی پیاس بجھانے کی بجائے اس کے لئے سرابِ صحرا ثابت ہوتا ہے کیونکہ نہ جانے کیسے معشوق کے سینے میں زہریلا تیر پیوست ہوا اور اس کا وجود خون آلودہ ہوا ہے۔یہ عشق نہ صوفی شاعر کا مافوق الفطرت عشق ہے، (جہاں جزُ کُل کا طلبگار ہے اور دو کا ملن حقیقت کا عرفان ہے) اور نہ مجازی شاعر کا زمینی عشق ہے (جہاں ملن انتظار کی آخری منزل ہے) بلکہ یہ انسانی زندگی کا ایک ایسا المیہ ہے، جہاں وجود بنیادی طور غیر وجودیت کا دھوکہ ہے۔اُس پر راہیؔ کا اس احساس یا تجربے کا استعاراتی اظہار، جو شعری تجربے کو آفاقی بنا کر شاعر کے تخلیقی مرتبے کا واضح پتہ دیتا ہے۔

کتھ زخم خورِد بانٛبرِ منٛز نظرِ میُل سپُد
لب تشنہٕ لولہٕ وأنجہ آیُت سراب ہیوٚ

☆

دلچہٕ یتھ بے پڑھ بستی باگہِ کُس گٹاشُت آو
لوٚس یُس وسےُ تارُکھ کھوٚت نہٕ آفتابےٕ کانٛہہ

☆

از ژیوٚن اتھو جسم، تسُند راگ ژھٹان ریٚہہ
از بود أچھو شوق پٔنُن سوٚدر وُچھل واو

رحمٰن راہیؔ کی بظاہر ایسی عشقیہ غزلوں کی تخلیقی شدت راہیؔ کے عصر حاضر کے شاعرانہ قد کی قدم بوسی کرتی ہے اور سامع کے دامن کو جھٹک کر یہ باور کراتی ہے کہ پروانے کا رقص میری تخلیقی بالیدگی کا ضامن ہے۔ راہیؔ کی کچھ غزلیں اگرچہ ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہونے کے بعد عوامی سطح پر بہت مقبول ہوئیں، تاہم راہیؔ صاحب کے دو اہم شعری مجموعوں ''نوروزِ صبا'' اور ''سیاہ رُوٗدِ جرین منز'' وہ شایع نہیں ہوئی ہیں۔ نہ جانے کیوں۔۔۔؟ میری دانست میں مہجورؔ کی نئ غزل سے لے کر راہیؔ کی جدید غزل تک اُن غزلوں کا بھی اپنا ایک امتیازی مقام ہے، جو اپنی لسانی صورت، تخلیقی اظہار اور رویّے کے احساس کی بنا پر آج بھی تازہ، نئ اور منفرد ہیں۔ البتہ راہیؔ صاحب کی یہ خوبصورت غزلیں اور اس قبیل کے درجنوں گیت، جو موسیقی کے بھی بہترین نمونے ہیں، اب ریڈیو سے شاذ و نادر ہی نشر ہوتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے، یہ ارباب اختیار ہی بیان کرسکتے ہیں۔

رنگ ژھٹہِ نامیٲنۍ جوٲنی سُہ جاٲنی یارِ پیے
ہُر سروِ قدس مےٚ روٲنی سُہ جاٲنی یارِ پیے
نظرو منز نظراہ تژ اوس مَس مائزٕ اَتھو پلناوس
چھٹہِ پوٗنپر نژِ اسماٲنی سُہ جاٲنۍ یار پیے

☆

شبنمہ بہ چھسے پراران پوش پرژھونۍ ینا روزہم آغوش
مجلونس تہِ کیا با پھٹ کشکول، ینا چھےٚ نہٕ دنیا روزن وول

☆

شرٗ ونۍ ییلہِ تمہِ کوٚر روئہِ دامانس، اِدٕ نسا روٗ دُم پانس تام
سرِ شہل پیوٚ آبِ روانس، اِدٕ نسا روٗ دُم پانس تام

پروفیسر رحمٰن راہیؔ ہمارے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ شاعر ہیں اور آج کے اس جدید دور میں بھی کشمیری زبان نے راہیؔ کا مزاج رکھنے والے کسی دوسرے شاعر کو ختم نہیں دیا۔ محمد یوسف ٹینگ کہتے ہیں کہ راہی وہ شاعر ہے کہ جو ''بے شک کشمیری زبان کا عظیم شاعر جس نے مشرقی اور مغربی ادبیات کے سنگم کیلئے اپنی کشمیری زبان کو بطور ایک نہر سوئز کے استعمال کیا۔'' آخر میں ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ جدید شاعری کے ابتدائی دور میں لکھی گئی راہیؔ کی ان دو تین غزلوں، جن کے کچھ اشعار ایک مخصوص نظریے یا فلسفے کی نذر ہوئے ہیں، پر سخن شناس قارئین کے اذہان میں کچھ سوال پیدا ہوسکتے ہیں۔ ایسی غزلوں کے اشعار میں فلسفے کا اظہار بنیادی مقصد رہا ہے، جہاں تجربہ فلسفے کی نذر ہوگیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر :

زبان تہِ دژایہِ بےٚ وفہٕ ہے کتھَن تہٕ پھوٚ رمژ رأخر
ہواوس اوس نہٕ کاتھہ انگ بلی پھٔرُکن زہر اۓخر

☆☆☆

……پروفیسر مجروحؔ رشید
کشمیری سے ترجمہ ……ڈاکٹر مشتاق حیدر

راہیؔ کی نظمیں: کچھ بنیادی باتیں

شاید راہیؔ کے منفرد اور توانا شعری آواز ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے کشمیری شعری اظہار کو لوک آہنگ سے نہ صرف آزاد کرایا بلکہ اسے ایک فنی اور فکری وقار بھی عطا کیا۔ انہوں نے کشمیری شاعری کی زبان کو مجازی تعلق کے حوالے سے سنجیدہ انسانی جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کی شاعری کا یہ تخلیقی عمل اور تخلیقی رنگ و آہنگ ان کے کئی قارئین کے لیے ایک معمہ بنتا ہے کیونکہ ایسے قارئین کی نظر میں شاعری وہی شے یا اظہار ہے جسے سب لوگ سمجھ سکیں اور اس کی داد بھی دے سکیں۔ یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ عوام اعلیٰ ادیب اور ادب عالیہ سمجھنے کی استعداد رکھتی ہو۔ بلکہ ایسے کام ہمیشہ کچھ مخصوص افراد ہی کرتے ہیں، جنہیں اعلیٰ ادیب اور ادب عالیہ کی سمجھ اور پرکھ ہوتی ہیں اور وہیں ادب سے حظ اٹھانے والے قارئین کی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ ارسطو نے سمجھایا کہ ٹریجڈی، کومیڈی اور ایپک کیا ہوتا ہے؟ اسی نے بتایا کہ سوفوکلیز، یورپیڈیز اور ایسکالس کس درجے کے شاعر اور دانشور ہیں۔ بریڈلے اور ولسن نائٹن نے بتایا کہ شیکسپیئر کی معنویت کیا ہے۔ شیکسپیئر کی مختلف ادبی اور فنی جہات کو انہوں نے ہی روشنی میں لایا۔ سنسکرت شاعری اور ڈرامہ کا تجزیہ آنند وردھن، ممٹ اور ابھنو گپت نے کیا اور انہوں نے ہی سنسکرت ادب کے رنگارنگ تخلیقی گوشوں کو روشن

کیا۔اس پوری تمہیدی بحث کا مقصد یہ حقیقت باور کرانا ہے کہ ایک بڑے شاعر کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے بہر حال ایک تجربہ کار اور ہنر مند ناقد نہ سہی ایک معتبر مبصر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ایسے مبصر کے لیے ضروری ہے کہ وہ شعری منظر نامے میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں سے نہ صرف واقف ہو بلکہ ایسی تبدیلیوں اور شعری رویوں کا معروضی ادراک بھی رکھتا ہو۔

جیسا کہ تمہید میں ہی ذکر کیا گیا کہ راہی کا اظہار بیان منظّم اور مربوط ہے اور اس میں تفصیلات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ تفصیل ایجاز و اختصار کی ضد ہے جبکہ ایجاز ہی حسن و جمال کو پروان چڑھاتا ہے۔''نوروزِ صبا'' سے آج تک جو کچھ بھی راہؔی نے لکھا ہے وہ سب بار بار اس بات کا عندیہ دیتا ہے کہ راہی شعری سفر کی ابتدا سے ہی تجربہ پسند رہے ہیں۔اظہار اور ہیئت کی نئی راہیں تلاش کرنے کی خاطر ان کی سرشت میں موجود تلاش و جستجو کا جذبہ اس سمت میں ابتداء سے ان کی رہبری و رہنمائی کرتا چلا آیا ہے۔

راہؔی کی ترقی پسند دور میں لکھی گئی نظمیں بھی بہت حد تک اصل شعری جوہر سے منہمک رہیں۔ان کا اس بات پر کامل یقین تھا کہ شعر وہی ہے جو قاری کو ایک جمالیاتی لمحے میں محصور کر سکے تا کہ وہ (قاری) کسی انسانی یا ڈرامائی لمحے کے نقش کو ابھار کر انسانی زندگی کی کسی نہ کسی جہت کو روشن کر سکے۔اگر شاعر ایسا نہ کر پائے تو اس کا سارا تخلیقی عمل ریت کا گھروندا بنانے کی طرح ایک سعیٔ لاحاصل ہوگا۔

اس پس منظر میں اگر ہم ''نوروزِ صبا'' کی نظموں کا مطالعہ کریں گے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خیالات کی شاعری ہونے کے باوجود یہ نظمیں شاعرانہ ہنرمندی اور خیالات کے برعکس شاعر کے ذاتی کشفِ معانی اور اظہار و بیان کی عمدہ مثالیں ہیں۔ انہوں نے "سونہ لانکہِ پٹھ "، "فن برائے فن" جیسی نظموں میں پلاٹا نک ہونے کے

باوجود اس بات کا خیال رکھا ہے کہ محض خیال نظم نہیں بن سکتا بلکہ نظم کا معنیاتی جوہر شاعر کی زبان پر دسترس سے ہی کھل کر سامنے آتا ہے۔ ''نوروزِ صبا'' کی نظموں میں ایک حد تک تمام ایسی تفصیلات موجود ہیں جو نظموں کے مجموعی حسن اور تاثر سے متصادم نظر آتی ہیں، تاہم راہی نے اس تصادم سے اپنی شاعری کے اس دور کو خیر آباد کہا ہے جسے ہم ان کی شاعری کا ابتدائی پلاٹانک دور کہہ سکتے ہیں۔ راہیؔ کے قاری کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان کی نظموں کے پیچھے انگریزی رومانی وجدید اور جدید فارسی شاعروں کی نظموں کی شعری روایت بھی کارفرما ہے اور ہم اس کی شاعری کی فقط مشرقی شعریات کے تناظر میں قدر سنجی نہیں کر سکتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک انگریزی نقاد جسے غزل کی Sensibility کا احساس نہ ہو، غالبؔ وحافظؔ کی شاعری کی قدر سنجی سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ مغرب نے بھی اگرچہ ایسے کئی نقاد پیدا کیے ہیں جنھوں نے غالبؔ وحافظؔ کی شعری کائنات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بات بھی عیاں ہے کہ وہ پوری طرح حق ادا نہیں کر پائے ہیں۔ بہرحال میرا مدعا یہی ہے کہ راہیؔ کی نظموں کا آہنگ چونکہ فکری اور فنی اعتبار سے ایک عالمی تناظر کا احاطہ کرتا ہے اس لیے اگر یورپی نہیں تو کم از کم انگریزی نظموں کے رنگ وآہنگ کو راہیؔ کی نظموں کی قدر سنجی کے وقت زیرِ نظر رکھنا ضروری بنتا ہے۔ اس دعوے کو یہ دلیل بھی مستحکم کرتی ہے کہ راہیؔ نے یورپی زبانوں کی کئی نظموں کا کشمیری ترجمہ کر کے اپنی تخلیقی دلچسپی کا مختلف اوقات پر اظہار کیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے نظم کی ایسی کئی ہئیتیں کشمیری زبان میں متعارف کی ہیں جنھوں نے نظم کو نہ صرف کشمیری شعری اظہار کا ایک اہم وسیلہ بنایا بلکہ اسے کشمیری شاعری کی ایک اہم اور مستند و مستحکم ہیئت کے طور پر بھی رائج کیا۔ ڈراماٹک مونولاگ، Soliloquy اوڈ جیسی ہئیتیں اُن (راہیؔ) کی تخلیقی شخصیت کے ایسے آئینے بن گئے جن کی وساطت سے ہم ان کی شخصیت کے

مختلف النوع اور رنگارنگ نقش و نگار کا واضح عکس دیکھ پاتے ہیں۔ راہیؔ کی کئی نظموں میں زندگی کے تین خاص رنگ ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ایک رنگ کو وہ "صحرا" نام دیتے ہیں جہاں ہمیشہ مجبوریوں کی تیز آندھیاں چلتی رہتی ہیں۔ دوسرے رنگ کو وہ " گلزار" کا نام دیتے ہیں جہاں ہر گھڑی ہر لمحہ جشن بہاراں لگا رہتا ہے اور تیسرے رنگ کو وہ سمسار (سنسار) سے موسوم کرتے ہیں جہاں انسان اپنی ہی زندگی پر سینڈھ لگاتا ہے۔ دیکھا جائے تو "جلوۂ زبور" نظم راہی کی تمام شاعری خصوصاً ان کی نظموں کا ایک خاکہ Synopsis کا درجہ رکھتی ہے جہاں زندگی کی یہ متضاد جہتیں باہم دست و گریباں نظر آتی ہیں۔ یہ تخلیقی طریقہ کار راہیؔ کی نظموں میں ایک ڈرامائی صورت حال اختیار کرکے شاعر کے تخلیقی برتاؤ کو منعکس کرتا ہے۔ اسی وجہ سے راہیؔ کی نظموں میں ایسے الگ الگ چہرے (Persona) نظر آتے ہیں جو ایک طرف زندگی کی رنگارنگی کو محیط ہیں اور دوسری جانب خالص کیفیات اور شعری کرداروں کے آئینہ دار ہیں۔

راہیؔ کی نظموں کا ایک واضح آہنگ ان نظموں کا ہے جن میں دوسرا جنم آرکی ٹائپ Rebirth Architype درشایا گیا ہے۔ ایسی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو کولرج، شیکسپیئر اور ٹی ایس ایلیٹ خاص طور پر یاد آتے ہیں۔ "پے چھ ظُلماتہٕ وُزان"، " قعرِ دریا سلسبیل" اور "اکھ خواب" جیسی نظموں میں مایوسی آخر کار ختم ہو جاتی ہے اور انسانی روح کے حصے میں امید آجاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح شیکسپیئر کا ہیملٹ المناک قربانی دے کر ہوریشو اور ہم سب کو نئی زندگی کی نئی نوید سناتا ہے۔

O good Horatio, what a wounded name,
Things standed thus unknown, shall live behind me
If thou didst ever hold me in thy heart,
Absent thee from felicity a while.
And in this harsh world draw thy breath in pain, to
tell my story

جس طرح کولرج کا مغموم ملاح پیاس کا عذاب جھیلنے کے بعد جہاز کی اچانک حرکت محسوس کرنے پر نئے خواب بنتا ہے، ایلیٹ کا شعری کردار ویسٹ لینڈ کے پنجرے میں زرخیزی کی تمنا کرسکتا ہے۔ ضیا جالندھری "زمستان" نظم کے یخ بستہ ماحول میں روانی دیکھ سکتا ہے اور رحمان ڈار کی "شیش رنگ" نظم کے شعری کردار کو سات جنموں کی دولت دستیاب رکھتا ہے، بالکل اسی طرح راہیؔ کا شعری کردار زندگی کے ڈرامے میں کسی نہ کسی طریقے کی قربانی دے کر زندگی کو بحیثیت مجموعی مسخر کرتا ہے۔ نظم "قعرِ دریا سلسبیل" کا شعری کردار من کے بیاباں میں جمے یخ کو توڑ کر دل و جگر کی اس جنت تک رسائی حاصل کرتا ہے جو تازہ تمناؤں سے تعبیر ہے۔ نظم "اکھ خواب" کا مرکزی کردار پوہ اور ماگھ کی خدائی سے آزادی حاصل کر کے رنگ و بو کے گلستان سے سرور و انبساط کے جذبے اور تجربے سے گزرتا ہے۔ اسی طرح نظم "پَے چُھ ظُلماتہِ وُزان" میں جان کنی کی حالت تک پہنچنے کے باوجود ہرن مشک / کستوری یا موتی کو جنم ضرور دیتی ہے۔ یوں راہی رجائیت کی خصوصیت سے اپنی نظموں کو مملو کر کے قاری کو ایک خوش آئیند مستقبل کی نوید سناتے ہیں۔

راہیؔ کی نظموں کی دوسری جہت وہ ہے جس میں فنی ہنرمندی اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ان کی نظر کشادہ ہو جاتی ہے اور وہ دستیاب زندگی کی بے نور آنکھوں اور ننگے سر والی بڑھیا کے سوالوں کے سامنے لاجواب ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کا شعری کردار اس طرح گنگ ہوتا ہوا نظر آتا ہے کہ گویا اس کے الفاظ حلق میں پھنس کے رہ گئے ہوں اور آنکھیں پتھرائی سی نظر آتی ہیں۔ "صدا" اور "مظلوم مسخر" جیسی نظمیں اس قبیل کی سب سے اہم اور نمائندہ نظمیں ہیں جو دستیاب زندگی سے جنم پا کر ایک مکمل اور مجموعی Human predicament کا منظرنامہ ترتیب دیتی ہیں۔ ان نظموں میں شعری کردار ٹریجک ہیرو کے ساتھ ساتھ ایک مظلوم مسخرے کی صورت میں بھی

ڈھلتا نظر آتا ہے۔

کنہِ پیٹھ چھُس یتھ ژلہٕ وٕنی سیٚکہِ پیٹھ
کُن زوٗن پوٗتجن ٹینکہٕ ٹُلان!

(صدا)

یتھ زگتس منز
پیٚیتہِ پرٚتھ انسان
لل، حبہ خاتون
یزید، یہودا
پرتھ کانہہ ژلہٕ وٕنہِ سیٚکہِ پیٹھ
نژان؛
تہٕ نژان نژان
مظلوم آسِتھ مسخرباسان

(مظلوم مسخر)

یہ دونوں نظمیں جہاں ایک طرف نئی آگہی اور شعری طریقہ کار کی غماز ہیں وہیں دوسری طرف یہ شاعر کی وسعت نظر کی بھی آئینہ دار ہیں جو عالمی ادب اور تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔اس کے شانہ بشانہ راہیؔ کی نظموں کا منظر نامہ پیکر تراشی اور علامتوں کے وسیلے سے ایک ایسے نگار خانے کی تشکیل کرتا ہے جسے ہم ریئسم کی زبان میں Physical poetry کہہ سکتے ہیں۔ ایسی شاعری رنگین خیالات کے بجائے پیکروں اور تشبیہات، اشیاء اور ان کے اشیاپن سے مکمل طور پر سروکار رکھتی ہے۔یعنی پیکروں اور علامات کا ایک ایسا انضمام وجود میں آتا ہے جہاں خیالات کے بدلے پیکروں کی اہمیت زیادہ نظر آتی ہے۔"رود"، "ہندِ فونوس" اور "سونتھ" جیسی مشہور

نظمیں اسی تخلیقی طریقے کار کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ان میں شاعر اپنی جذباتیت کو لگام دے کر محض مناظر کی خوبصورتی کو پیش منظر میں پیش کرتا ہے۔وہ منظر یا پیکر میں اپنے جذبے کا کوئی مبدل نہیں ڈھونڈتا ہے بلکہ منظر نگاری اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے تاثر کا خلاقانہ اظہار ہی اس کا مطمع نظر ہوتا ہے۔اس طریقہ کار کے ساتھ ساتھ اور اس سے ملتا جلتا منظر نامہ اُن نظموں میں عیاں ہے جو شاعر کو دستیاب زندگی کے غیر شاعرانہ مزاج سے ہم آہنگ ہونے پر آمادہ کرتا ہے، جس میں شاعر محکومی، مجبوری اور بے بسی میں گرفتار شعری کرداروں کے اُبھرنے کی تمنا کرتا ہے اور وہ زندگی کے اس شش جہتی پیکر کو قاری کے سامنے معروضی انداز میں پیش کرتا ہے۔"باس،"دامن" اور ''لیلا'' اس قبیل کی نمائندہ نظمیں ہیں جن میں رومان کے مقابلے میں زندگی کی ٹھوس اور سنگلاخ حقیقتوں سے شاعر واضح طور پر نظریں ملاتا نظر آتا ہے۔

تا حال راہیؔ نے ہیت کے اعتبار سے نظم میں جو تجربہ کیا ہے وہ "زن تہِ اکھ نظم" کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔اس نظم میں شاعر نے اپنے سامنے موجود بظاہر منتشر اشیا اور حقائق کو ایک دوسرے سے ملا کر پیش کیا ہے۔تاہم نظم کا عنوان "زن تہِ اکھ نظم" یعنی ''جیسے ایک نظم'' اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے کہ شاعر کو خود بھی اس نظمیہ ہئیت کی معنویت پر مکمل یقین نہیں ہے۔

راہیؔ کی نظموں میں فکر و تدبر اور اظہارِ خیال کا کوئی بندھا ٹکا اصول روا نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ان میں فکر کی نامیاتی اپج اور فن کے زینہ بہ زینہ ارتقا کا انصرام ملتا ہے۔ان نظموں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ راہیؔ نے اپنے تخلیقی سفر کے دوران کبھی بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا ہے بلکہ انہوں نے اپنا سفر افقی اور عمودی ہر دو جہتوں میں جاری و ساری رکھا ہے۔آرکی ٹائپس کی لاشعوری بازیافت اور ان کی الگ الگ جہتوں کا برتاؤ ایک الگ بحث کا متقاضی ہے۔ایلیٹ کا تنقیدی نظریہ اور ان کی نظم ''Four

"Quarters" راہی کو بے محابہ شاعرانہ معروضیت حاصل کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

میں اس بات کو پھر ایک بار دہرانا چاہوں گا کہ راہؔی کی نظموں کے پیچھے جہاں وہ عالم گیر یورپی Sensibility کارفرما ہے جس کا مرکزی نقطہ ایک مخصوص بے معنویت Certain absurdity ہے وہیں یورپی شاعری اور تنقید کا کردار بھی واضح نظر آتا ہے، اور یہ کوئی معیوب بات بھی نہیں ہے بلکہ یہ سب راہؔی کی شاعرانہ حیثیت کے ساتھ ساتھ پوری کشمیری شاعری کے رنگ و آہنگ اور تخلیقی فضا کے لیے فالِ نیک ثابت ہوا ہے۔

کتابیات:

راہی، رحمان۔(1995)۔سیاہ رودِ جرین منز۔میزان پبلشرز
رشید مجروح۔(1997)۔عصری کأشرشاعری۔انڈین پرنٹنگ پریس

☆☆☆

......مفتی مدثر فاروقی

رحمٰن راہؔی اور جدید مغربی شعریات

کشمیری شعروادب سے واقفیت رکھنے والے اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ رحمان راہؔی (2023-1925) پچھلی چھ دہائیوں سے کشمیری شاعری کے افق پر ایک روشن ستارے کی طرح چمکتے رہے۔راہؔی نے اپنے اسلوب اور معنی آفرینی سے کشمیری شاعری میں ایک تازہ روح پھونک دی ہے۔ اس مقالے کی غرض راہؔی اور مغربی شعریات پر چند اہم باتیں قاری کے سامنے رکھنا ہے۔ لیکن یہاں اس بات کی وضاحت کردینا ضروری ہے کہ راہؔی کو مغربی شعریات کے تناظر میں دیکھنے کا مقصد یہ نہیں کہ مغربی فکر پر استوار کسی بنے بنائے ماڈل کو ان پر چسپاں کیا جائے بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی شعری اور تنقیدی روایت سے کس قدر متاثر ہیں اور ہمارے لیے مغربی شعریات سے واقفیت راہؔی کو سمجھنے میں کتنی مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

راہؔی نے اپنا شعری سفر ترقی پسند تحریک کے ادبی منشور کے زیرِ اثر شروع کیا۔ کچھ عرصہ اس تحریک کے قدآور قلم کاروں کے شانہ بشانہ گامزن رہے لیکن بالآخر انہوں نے اپنی راہ خود متعین کی اور ترقی پسند ادب کی شعریات سے انحراف کرتے دکھائی دئے۔ترقی پسند ادیب عموماً ادب کو ایک خاص زاویئے سے دیکھتے تھے اور اس کی مقصدیت پر زور دیتے تھے جبکہ راہؔی کی شاعری ان قیود سے آزاد نظر آتی ہے۔

چونکہ ترقی پسند تحریک نے بقولِ گوپی چند نارنگ ''اپنی آئیڈیولوجیکل ترجیحات کی تکمیل وترسیل کے لیے افادیت اور مقصدیت کی لے کو آگے بڑھایا''، اس لیے راہیؔ کے لیے اپنے شعری ذوق اور تخلیقی وجدان کو اس کے تابع کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ جدیدیت میں اس مقصدیت اور افادیت کے تصوّر سے ردّعمل کے طور پر انحراف کیا گیا، لہٰذا راہیؔ کا جدیدیت کی طرف رجحان باعثِ تعجب نہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے جدید اردو شاعری پر ایک عمدہ تبصرہ کیا ہے جو راہیؔ کے اس رجحان کو سمجھنے میں بھی فائدہ مند ہے :

> ''داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعری کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساسِ جرم، خوف، تنہائی، کیفیتِ انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا (کسی نہ کسی نہج سے) اظہار کرتی ہو جو جدید صنعتی اور مشینی اور میکانیکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوش حالی، ذہنی کھوکھلے پن، روحانی دیوالیہ پن اور احساسِ بے چارگی کا عطیہ ہے۔'' (ص ۶۴)

جدید مغربی شعر وتنقید میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے اور راہیؔ پر ایلیٹ کی شعریات کا اثر نمایاں ہے۔ ایلیٹ نے بیسویں صدی میں تنقید اور شاعری دونوں کا رخ بدلنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اپنے ایک اہم مضمون ''روایت اور انفرادی ہنر'' میں ایلیٹ نے شاعر کی انفرادیت اور روایت کے باہمی تعلق پر مفید گفتگو کی ہے۔ ایلیٹ کے مطابق صحیح معنوں میں ایک شاعر بننا صرف اس وقت ممکن ہے جب ایک نئی شعری آواز پہلے سے موجود شعری روایت میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوجائے۔ اس مقصد کو پانے کے لیے ہر نئے شاعر کو اس شعری روایت کو اپنے اندر جذب کرنا ناگزیر ہے۔ تازہ کاری اور انفرادیت کے مروّجہ

تصوّرات کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے ایلیٹ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی بھی شاعر کا کلام محض اس لیے عمدہ نہیں ہوتا کیونکہ اس میں کوئی بالکل نئی بات کہی گئی ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ روایت کا صحیح ادراک ہی کسی شاعر کو حقیقی معنوں میں شاعر بنا سکتا ہے۔ جب تک اس میں روایت کو جذب کر کے خود کو اس کے رنگ میں رنگنے کی صلاحیت نہ ہو تب تک وہ اس روایت کا حصہ نہیں بن سکتا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہر نیا شاعر بس وہی کچھ کہنے کا پابند ہے جو اس سے پہلے کہا گیا ہو اور اس روایت سے ادنیٰ انحراف کی بھی گنجائش نہیں۔ ایلیٹ کے مطابق روایت اور انفرادیت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ کسی بھی شعری روایت سے منسلک افراد کا ایک دوسرے سے ایک نامیاتی تعلق ہوتا ہے۔ اسی لیے جس طرح ماضی حال پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح حال بھی ماضی پر اثر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی ایک نئی آواز روایت کا حصہ بنتی ہے تو روایت کسی نہ کسی درجہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

راہیؔ کی شاعری میں روایت اور جدّت اور روایت اور انفرادیت میں ایک کشمکش اور تناؤ کی صورت دکھائی دیتی ہے اور ان کی منفرد شعری آواز اسی کشمکش اور تناؤ کی پیداوار ہے۔ صدیوں تک کشمیری شاعری میں تصوّف اور رومانویت کا رنگ غالب رہا۔ اول الذّکر نہج کی ابتدا لل دید اور شیخ العالم کی شاعری سے ہوتی ہے جن کا شعری تخیّل ایک ماورائی نظریۂ حیات کی دین ہے۔ یہ نہج بیسویں صدی تک کشمیری شاعری کا اہم جز رہی۔ صوفی شاعری کے ساتھ ساتھ رومانوی شاعری بھی کشمیری شاعری کی پہچان رہی۔ حبّہ خاتون، محمود گامی، رسل میر اور کئی دیگر شعراء نے اس نہج کو پروان چڑھا کر بے حد مقبولیت حاصل کی۔ لیکن بیسویں صدی کے دوران کشمیری شاعری نے دنیوی Worldly رنگ اختیار کر لیا اور مہجورؔ اور آزادؔ نے معاصر سماجی اور سیاسی مسائل کو موضوعِ سخن بنایا۔ راہیؔ اسی منہج کے وارث بن کر اپنے شعری سفر کا آغاز کرتے

ہیں۔وہ حقیقت کو صوفی شعراء کی طرح ایک مستقل اور ماورائی نکتہ نگاہ سے نہیں دیکھتے، نہ شاعری کو تلقینِ اخلاق کا وسیلہ بناتے ہیں اور نہ شعوری طور پر اسے کسی خاص نظریۂ زندگی کی تبلیغ کا آلۂ کار بناتے ہیں۔ وہ روایت کو مسترد بھی نہیں کرتے بلکہ روایت آگہی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ وہ روایت کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور اس کے سرمائے سے نئے شعری معنی پیدا کر لیتے ہیں۔ راہیؔ دراصل ایک بلند پایہ خلاقِ معانی ہیں اور ان کی شاعری معنی آفرینی میں کمال کی ایک عمدہ مثال ہے۔

جدید مغربی شعریات اپنے تنوّع، وسعت اور پیچیدگی کے اعتبار سے ادب کے ہر طالب علم کے لیے ایک بڑا چیلنج پیش کرتی ہے۔ گو کہ اس بحرِ بے کراں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے مگر کچھ ایسے اہم نکات کی نشاندہی ضرور کی جاسکتی ہے جن کو ملحوظِ نظر رکھ کر راہیؔ کو بہتر طور سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے جس تنقیدی اسکول پر سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ نئی تنقید کے نام سے مشہور ہوا۔ نئی تنقید نے جہاں ادب بالخصوص شاعری کو ایک نئے زاویئے سے دیکھنے پر زور دیا وہیں اس کی مقصدیت کی بھی ازسرِ نو تشریح کی۔ اس کے مطابق شاعری کا مقصد حقیقت کو سائنسی طریقِ کار پر جاننا نہیں ہے۔ شاعری کا حتمی مقصد علمی یا عرفانی (Cognitive) ہی ہے لیکن یہ مقصد وہ سائنس کے برعکس محسوس حقیقت کو الفاظ کے ایک خاص پیرایئے میں ڈھال کر انجام دیتی ہے۔ جہاں سائنس کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ محسوسات سے عمومی نتائج اخذ کرتی ہے وہیں شاعری کا طریقہ کار اس کے برعکس خاص کی خصوصیت of particular Particularity کو محفوظ کرنا ہے۔ وقت کی رفتار انسانی تجربوں کو گویا پیہم کالعدم کرتی رہتی ہے جن کو صرف شعری ہیئت کے ذریعہ محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ ہر تجربہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے انوکھا ہوتا ہے لیکن مسلسل معدوم ہونے کے خطرے سے دوچار رہتا ہے۔ سائنس تجرید (Abstraction) کی خوگر ہونے کے باعث

تجربے کی انفرادیت اور خصوصیت کو صحیح معنوں میں قابلِ اعتنا نہیں سمجھتی۔ شاعری ایک تجربے کو الفاظ کے پیرایئے میں ڈھال کر ابدی بنانے کی ایک کوشش ہے۔ جان کرو رینسم نے کہا تھا :

A poet must consider his poem
nothing short of a metaphysical
A poet must consider maneuver.

اس طرح شاعری حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو نہ صرف دوام بخشتی ہے بلکہ انہیں ہمارے لیے بے نقاب بھی کرتی ہے۔ اگرچہ شاعری سے عمومی علم حاصل نہیں ہوتا لیکن یہ محسوسات کی نئی بصیرت بہم پہنچاتی ہے۔ شاعری بقولِ کلینتھ بُروکس استعاروں کے اندر رہ کر کسی بات کو بیان کرنا ہے اور استعاروں سے باہر قدم رکھنا شاعری سے باہر نکلنے کے مترادف ہے۔ نیز جو چیز شاعری کو نثر سے ممتاز کرتی ہے وہ صرف اس میں موجود کچھ جانی پہچانی صنعتیں نہیں بلکہ اس کی وہ ہیئت ہے جو الفاظ کے باہمی ربط سے وجود میں آتی ہے۔ نثر کے برعکس شاعری میں الفاظ کا یہ باہمی ربط کمال درجہ کو پہنچا ہوتا ہے۔ شعری معانی دراصل اسی مخصوص ہیئت کی پیداوار ہوتے ہیں۔

راہیؔ کی شاعری کا بیش بہا حصہ زبان اور شعری ہیئت کی طرف خاص توجہ کا پتا دیتا ہے۔ راہیؔ کو پڑھنے والا ہر قاری محسوس کرتا ہے کہ ان کے لیے زبان صرف معنی کی ترسیل کا آلہ نہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''شارشنائسی'' میں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ راہی مغربی تنقید سے خوب استفادہ کرنا جانتے ہیں۔ زبان اور حقیقت کا باہمی تعلق مغربی فلسفے اور ادبی تنقید کے لیے ایک مستقل مسئلہ ہے۔ ہیئتی تنقید اور ساختیات نے اس مسئلہ کو بالخصوص اجاگر کیا ہے۔ روایتی تنقید کے برعکس مذکورہ نظریات زبان کو اس لیے اتنی اہمیت دیتے ہیں کیونکہ انسان کے فہم وادراک میں زبان ایک کلیدی رول ادا کرتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا

کہ انسان اور حقیقت کے درمیان زبان اپنی ساخت کے ساتھ حائل رہتی ہے۔ اس طرح زبان ہی ہمارے شعور کی معمار ہوتی ہے اور زبان ہی ہمیں اپنے آپ سے اور خارجی دنیا سے روشناس کراتی ہے۔ ''شارشناسی'' میں راہیؔ اس نکتے کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

جدید نظریہ کے مطابق حقیقت یا شعور تک رسائی صرف زبان کے ذریعے ممکن ہے۔ ایک مصنف کے لیے کسی بھی چیز یا صورتِ حال کو بیان کرنے کے لیے الفاظ پر اعتماد کرنا ناگزیر ہے۔ 'کن' ہمیشہ 'فیکون' سے پہلے موجود ہے۔ ماضی میں زبان کو زنگ سے پاک ایک شفّاف شیشے کی طرح سمجھا جاتا تھا جس میں سے جھانک کر ہم حقیقت کو دیکھ سکتے تھے لیکن اب یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ زبان ایک وسیلہ یا ذریعہ ہے، ہی نہیں بلکہ ایک ہیئت یا ساخت ہے جو ہمارے لیے حقیقت کے ادراک کو ممکن بناتی ہے اور اس کی صفات سے ہمیں روشناس کراتی ہے اس کا یہ مطلب ہوا کہ زبان محسوسات کو نام دینے کا ایک آلہ نہیں بلکہ محسوسات بذاتِ خود زبان کی ساخت کی ہی پیداوار ہیں۔ (ص ۱۳۳، ترجمہ از راقم)

راہیؔ نے اس اقتباس میں اس نکتے کی وضاحت کی ہے جو جدید مغربی تنقید میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اپنی نظم ''جلوٕ تہٕ زبور'' میں راہیؔ کشمیری زبان کو اپنا خراجِ تحسین کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں :

ہے کأشرِ زیٚوٚ مےٚ چھِ چأنی وٕژے
ژٕ ے میأنی خبر ژٕ ے میأنی نظر
ژٕ ے میأنہٕ شعورٕ چ سوٗنٕژلی زٕژ
ژٕ ے میأنہِ ضمیرٕ چ مٔژ سارنگ

زبان کے تئیں یہ حسّاسیت راہیؔ کے دوسرے شعری مجموعے ''سیاہ رُودٕ جرین

منز'' کی کئی نظموں میں دکھائی دیتی ہے جبکہ پہلے شعری انتخاب ''نورو زِ صبا'' میں یہ حسّاسیت بالعموم نظر نہیں آتی۔ راہیؔ نے اپنی ابتدائی شاعری سلیس اور غیر مبہم زبان میں کی ہے۔ ''یتھ سمیس منز''، ''فن برائے فن''، ''ویشاٚ کھۍ تہٕ رفگر'' اور اس طرح کی کئی نظمیں اس بات کی عکاس ہیں کہ اپنے ابتدائی دور میں راہیؔ کی توجہ موضوع کی ادائیگی، خیالات کی روانی اور زبان کی شگفتگی پر ہے۔ ایسی ہی ایک نظم ''ویشاٚ کھۍ تہٕ رفگر'' ایک مفلس رفوگر کے خیالات میں رونما ہونے والے تلاطم کو اس طرح بیان کرتی ہے :

وٕہی اگرراتُگ جمعہٲزی آسہِے
وٕہی یمن فردن چھِ کاٚتیاہ زیٹھِ تے گوٚبٕ نقشِہ تژٕ اواں نقشہٕ گر
وٕہی یتھ پاٚٹِس چھُ کھُر آمت ژوپاٚری
ہرٕژ نہِ تامت وتھ چھہٕ زن ازراٚوٕمژ
اونگجہِ ٹینڈین دژایہ پژٕہ پارَہ گرِتھ

ایک اور نظم ''سونہٕ لانکہِ پیٹھ'' میں شاعر فطرت کے حسین مناظر کو دیکھ کر ایک طرف لطف اندوز ہوتا دکھائی دیتا ہے اور دوسری طرف یہی منظر اسے اپنی فنائیت کے احساس سے دوچار کراتا ہے :

کیاہ یہٕ مرگُک یُپ نِیامےٚ تہِ مُوٚل پژٕ اٚ ٹِتھ اٚخرس؟
کیاہ بہٕ یمہٕ نایوراہٕ پھیرِتھ زٕ ہٕے؟
کیاہ بہٕ وِچھنا دُنیہک گاشی پتولاکُن زانٛہہ؟
کیاہ مےٚ بنہِ نازانٛہہ یتھ سونہٕ لانکہِ پیٹھ شامن ہُن؟
موتہٕ کِس پنجرس چھنا ڈِہوٕ ژھتہِ روزان داٚر زانٛہہ؟

ان نظموں کو سمجھنے میں قاری کو کوئی خاص دشواری درپیش نہیں۔ لیکن اس ابتدائی مرحلے کے بعد راہیؔ کی شاعری میں مشکل پسندی، بیان اور معنی کی پیچیدگی اور ابہام

جیسے عناصر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ زبان کے ساتھ راہیؔ کے تجربے کشمیری میں اپنی نوعیت کے پہلے تجربے ہیں۔ کشمیری شاعری میں پیچیدگی اور ابہام کو راہیؔ نے ایک نئی جہت بخشی جس کی بدولت ان کی شاعری میں گہرائی پیدا ہوئی۔ غالبؔ نے سادہ شاعری کو اپنے مزاج کے مطابق نہ پاتے ہوئے کہا تھا :

سخنِ سادہ دلم را نفریبد غالبؔ
نکتہ ای چند از پیچیدہ بیانی بمن آر

معنی کی پیچیدگی کو اپنا شعری امتیاز بنانے میں راہیؔ غالبؔ کے ہم مشرب نظر آتے ہیں۔ لیکن دونوں کی پیچیدگی میں ایک بڑا فرق بھی موجود ہے۔ غالبؔ کا میدان روایتی غزل ہے۔ غزل ایک معروف شعری صنف ہے جس میں ایک طرف علامات، استعاروں اور تشبیہات کا نظام صدیوں سے اپنی ایک خاص ہیئت برقرار رکھے ہوئے ہے اور دوسری طرف اس کے مضامین بھی جانے پہچانے ہیں۔ راہیؔ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کے کلام میں ایسی نظموں کی بہتات ہے جو اسلوب، ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے کشمیری شاعری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ ہیئت کے اعتبار سے آزاد ہیں اور نثر سے قریب تر ہیں۔ اکثر و بیشتر قاری کو نہ تو نظم کا پسِ منظر معلوم ہوتا ہے اور نہ سرِ دست کوئی ایسی کلید میسّر ہوتی ہے جو معنی کے گنجینے کو اس کے لیے کھول دے۔ کئی نظمیں علامات، استعاروں اور تشبیہات کا ایک گھنے جنگل سا منظر پیش کرتی ہیں۔ یہ مشکل پسندی جہاں راہیؔ کو کشمیری شاعروں میں امتیاز بخشتی ہے وہیں قاری کے لیے کچھ مشکلات بھی پیدا کرتی ہے۔ ''سیاہ رُودِ جرین منز'' اور ''کٔدلہٕ ٹھٕٹھس پیٹھ'' کی کئی نظمیں ایسی ہیں جو صرف وسیع مطالعہ رکھنے والے قاری کی دسترس میں آسکتی ہیں۔ راہیؔ نے کشمیری شاعری میں تلمیحات کے استعمال کو ایک بلند سطح پر لا کھڑا کردیا۔ تلمیحات کے اس استعمال میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شہرہ آفاق نظم The

Wasteland کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔اس بات کی مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں کچھ نظموں کو بطور نمونہ پیش کریں گے۔’یہ کہٕ دِل‘ میں راہؔی نے قدیم یونانی رزمیہ ’ایلیڈ‘ کی داستان کی طرف یوں اشارہ کیا ہے :

نابینا یوٗنانٕی گوٗنہٕ ماتھا تیمس
ڈاپھ تراواں یاد پیوٗ واکھ داستاں
حُسن پھوٗر ہوٗسس تہٕ غأرتھ گرٕ یکنہٕ لوٗگ
کتھ بےٚ پٔڑھ سوٗ درس پتولوٗگ ناوِتار!
ہیکٹٔرن گوٗ ند پوٗرز اشُر گاہٕ ریوٗس
اینڈٔروما کی اٚس اٚش ٹاریو اساں
پیٹٔروٗکس موٗد، گُری ترأوِن اٚتی
ایکیلیٖزس خشمہٕ ہتی رتہٕ ژأنگی دی
انتقأمکی نارِ زامتی اجدہا
ایلیم کیوٹاورٕ وپیٹھی نٔژنہٕ لگی

یہاں ’ایلیڈ‘ کے اہم کردار مثلاً ہیکٹؔر، اینڈرؔوما، پیرا ایلیؔم اور لکڑی کا وہ گھوڑا جس میں چھپ کر یونانی جانبازوں نے ٹرائی کے اندر داخل ہو کر اسے آناً فاناً خاکستر کر دیا تھا، کو جمع کیا گیا ہے۔ایک کشمیری نظم میں قدیم یونانی رزمیہ کے کرداروں اور واقعات کی تلمیحات بذاتِ خود ایک انوکھی بات ہے کیونکہ اس میں دو بالکل مختلف تہذیبی روایات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ نیز اس سے ماضی اور حال میں ایک مکالمے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ایک آگاہ قاری جو ہوؔمر کے رزمیہ کو پڑھ چکا ہو یا کم از کم اس کے کرداروں اور کہانی سے واقف ہو تہذیب، زبان، زمان و مکاں کے اس فاصلے کے باوجود جو قدیم یونان اور اس میں موجود ہے آفاقی نوعیت کے چند انسانی جذبات

...... ہوس، محبت، انتقام، بہادری وغیرہ......کو ایک نئے لفظی پیکر کے ذریعے محسوس کر سکتا ہے۔

''باغس منز'' ایک اور ایسی ہی نظم ہے جس میں مختلف مصادر سے تلمیحات لے کر ان میں ایک گہرے تعلّق کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ قاری کا کام اپنے تخیّل سے بظاہر غیر متعلق تلمیحات کو مربوط کرنا ہے :

ازنہَ بُلبیہ حواتہ نہ آدم
ازکوٚرأ کھی پکھشی، أکھی بۄچھِ ہتی نفسن وُیہہ
گوٚڈٕ آوسُے پِچ پچ ہیتھ یُس تُمی جانہٕ مرگ گونہٕ ماتن بوزو
یَس ہردس منٛز میوٚگُلی ڈیشتھ
نبضس نبضس ایحساسن ہٕندی عالم پپان
مٕنزی باسیوٚ زِشیرازُک موٚت شاخِ نباتس سمکھِنہِ آو

آدم اور حوا کا باغِ بہشت سے رخصت ہونا، انگریزی کے مشہور جواں مرگ شاعر جان کیٹس کی دو نظموں ''اوڈ ٹو آٹم'' اور ''اوڈ ٹو نا یٹنگیل''، اور فارسی کے مقبول ترین غزل گو شاعر حافظ شیرازی کو ایک جگہ جمع کرنا اسی اسلوب کا نمونہ ہے۔ ایک اور نظم ''مےٗ نے زیو آسیے ڈزہٕ ٹھ'' میں رومی، شمس تبریز، اور قدیم یونانی لے آکون سے لے کر جدید مغربی فلسفی ہیگل اور مارکس جیسی شخصیات کو یکجا کرنا معنی آفرینی کے انوکھے انداز کی ایک اور مثال ہے :

تبریزُک موٚت اوس غنیمتھ
کتابہٕ زاجنیم پوٚز نَیہِ ہنز لَے بخشینم
کلامہٕ مُشرایوٚنم پوٚز
نزٕناویوٚنس

گیوٚ ناویٚونس
از گووِیَتھ انِد بندکوچس منز روٗمی روٹہ
لےآ کوٗنن آسہ وزٕ ھرِ ہیتھ!

....

سونٛچ کرِ ہاتہٕ ہیگلسؔ ڈٕزم تال
قدم ٹُلہِ ہاتہٕ مارکسؔ پھٹم پٕڑی

قاری کے لیے رومیؔ اور شمسؔ کی داستان، قدیم یونانی ادب سے لئے گئے کردار، جدید دور کے جرمن فلاسفر-- ہیگلؔ اور مارکسؔ -- بالکل غیر متعلق ہیں لیکن یہ نظم ان میں ایک ربط پیدا کردیتی ہے۔ شمسؔ کا رومیؔ کے علمی پندار کو خاک میں ملا کر اس کی روح کو بے قرار کرنا اور رومیؔ کا اس کی صحبت میں رہ کر سوز و گداز سے لبریز شعر کہنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ ایسی رفعتِ شان ہر ایک کی قسمت میں نہیں ہوتی۔ شاعر کو ایسی ہی کسی غیبی عنایت کی توقع تھی لیکن وہ مراد بر نہیں آئی۔ آخر میں شاعر اپنی بے بضاعتی کے اظہار کے لیے ہیگل اور مارکس کو بطورِ علامت پیش کرتا ہے۔ ''سونٛچ کرِ ہاتہٕ ہیگلسؔ ڈٕزم تال/ قدم ٹُلہ ہاتہٕ مارکسؔ پھٹم پٕڑی'' یعنی نہ میری عقل و دانش کی رسائی وہاں تک ہو سکی جہاں تک پہنچنے کی اسے آرزو تھی اور نہ میری کوشش اور میرے عمل نے میرا ساتھ دیا۔ اس اسلوب سے راہیؔ اجنبی علاقوں کو تسخیر کر کے کشمیری شاعری کا کینواس یقیناً وسیع کرتے ہیں۔ ایک اور نظم ''صدا'' میں شاعر حقیقتِ ازلی کو پکار کر اپنے کرب سے یوں آگاہ کرتا ہے :

ژٕیُس چھُکھ تہٕ سُہ
میون فریاد بوز

نظم میں عہدِ قدیم (Old Testament) رامائین، یونانی المیہ اڈیپس

ریکس اور حافظ شیرازی کی یزید بن معاویہ کے شعر کی تضمین جیسے مختلف تلمیحات سے ایک نیا شعری مضمون پیدا ہو گیا ہے۔ آخری بند میں یہ اسلوب اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے :

ژٔرے چھُسے ونان

ہے ایلیم کیوٹا ورٕ وپِٹھِ پھیٖہہ پھیٖہہ کرٕ ونہٕ نارٕ!

ابوتُرابس ہیرِ بوٕنہٕ کالیس وُٹھ گمنا وَن واجینٛز میٖڑی !

ہے کربلہٕ یکہِ چھورٕ چھورٕ کرِو نہٕ آبہٕ!

ہے چنگیزس نکہٕ وارین منز پھرٛ یکہٕ وٕنہِ واوا!

وٕچھ

کَنہٕ پیٹھ چھُس یَتھ ژلہٕ ونہٕ سَیکہِ پیٹھ

کُن زون پوٕتجن ٹینکہٕ ٹُلان!

یونانیوں کے ٹرائی کا خاکستر ہو جانا، حضرت علی کا آنحضورﷺ کی زبانی ابوتراب کا لقب پا کر مسکرانا، کربلا کے دریا کا پیاسوں کی تشنگی نہ مٹا سکنے پر تڑپنا اور فاتحِ عالم اور نخوت سے سرشار چنگیز خان کے نتھنوں میں گردش کرنے والی ہوا جیسے بظاہر غیر متعلق تلمیحات کو یہاں مربوط کیا گیا ہے۔ اسی اسلوب کو انگریزی نقّادوں نے Fusion of disparate ideas کا نام دیا ہے۔ کشمیری شاعری میں اس طرز کی معنی آفرینی بلاشبہ راہی کے امتیازات میں سے ہے۔

راہی کی شاعری میں کلّی طور پر زندگی کی کیا تعبیر ملتی ہے؟ یہ ایک اہم مگر مشکل سوال ہے۔ اگرچہ راہی زندگی کو ایک مستقل اور غیر متغیر نکتہ نگاہ سے نہیں دیکھتے اور نا ہی جذبہء محبت کی کوئی فلسفیانہ تعبیر پیش کرتے ہیں لیکن وہ مابعد جدیدیت کی لایعنیت، سطحیت، اضافیت اور تشکیکِ محض کے علمبردار بھی نہیں۔ ان کی شاعری معاصر تجربوں کی آیئنہ دار ضرور ہے لیکن اقدار اور معنویت سے اِبا نہیں کرتی۔ البتہ ایک ثابت اور

غیر متزلزل نظامِ فکر کی عدم موجودگی سے وہ اپنے لیے شعر گوئی کے انمول مواقع پیدا کر لیتے ہیں۔ راہیؔ محسوسات کے شاعر ہیں اور تجربوں کی ندرت کو شعر کی صورت میں پیش کرنا ان کا اصل کارنامہ ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ راہیؔ کے لیے ہر تجربہ الفاظ کے پیکر میں ہی معرضِ وجود میں آ سکتا ہے اور الفاظ کے مخصوص پیکر سے باہر کوئی تجربہ حقیقی معنوں میں ایک شاعر کے لیے تجربہ نہیں۔ لیکن کوئی شعر یا نظم ان کے لیے الفاظ کا محض ایک پیکر نہیں بلکہ حقیقت کے کسی پہلو کا انکشاف ہے۔

راہیؔ نے ''زندگی'' عنوان سے دو نظمیں لکھی ہیں اور دونوں اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ محسوس حقیقت کو ایک شعری ہیئت کی صورت میں پیش کرتے ہیں جس سے حقیقت کے ایک خاص پہلو کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک نظم'' نوروزِ صبا '' میں ہے اور دوسری ''کٔدلہِ ٹھٔس پیٹھ'' میں۔ ''نوروزِ صبا'' والی نظم زندگی کے دو بالکل مختلف پہلوؤں کی ایک منظر کشی ہے۔ زندگی کبھی ایک سر تراشیدہ بڑھیا کی طرح بدصورت نظر آتی ہے۔ اس صورتِ حال کے برعکس زندگی کا دوسرا پہلو وہ ہے جب وہ خوشگوار اور امنگوں سے بھری نظر آتی ہے۔ ایک جواں سال خاتون کچھ بچوں کو مدرسے سے گھر جاتے ہوئے دیکھ کر اپنے خوشحال مستقبل کا خواب دیکھتی ہے :

أتھی اندریامت چھَ کاٹھہ موجابیٚنٛیا
ہورِ بادم وارِ پیٹھِ پھیرِ تھ یمن مدرس شُریٚن
کوچَو أندِ ری دوراں وِ چھاں
یام تس پِنٛس وَچھس ژِہہ ژِہہ دِواں موصم چھُ باساں
زنتہِ پکنُگ سنٛز کراں
یام تس نیراں چھِ ہاوس
شوقہِ ہٲتی پِنٛس گُلالس ژاٹہِ ہل کُن تھپھ کٔرِتھ

یام تس باساں چھُ سونتہٕ کا لُک خواب ہیوٚ
بے خبر پأٹھیٚن چھُ یامت
تس موٚ دُر ونوُنہٕ ووزلیٚن وٕٹھن پیٹھ گَتھ کراں
زندگی باساں چھ تمہٕ وِزِ مس چھِو ر تے مأری مُنز

ایسی صورت میں زندگی مستی میں ڈوبی اور حسین نظر آتی ہے۔ ''کٔدلہٕ ٹھٔٹھس پیٹھ'' میں پائے جانے والی نظم ''زندگی'' استعاروں اور تشبیہات کے ذریعے زندگی کی بوقلمونی کو بیان کرتی ہے :

وِلگَتھ ریٚہہ زن گوٗلاباہ زِندٕگی
اکھ زٕژلی گوٚٹ آفتابا زِندٕگی
ژاٹہٕ ہالُک نو سبق شُر حأرتن
رنگ برٕنگی مُبہم کتابا زِندٕگی
مُنزلہٕ برٕم، سندیأے ون، بے نیب پٕدی
سُے تذبذب، سُے شتابا زِندگی
شعلہ ور لفظن یمبرٕزلی معنہٕ ہیٚنٕز
آنند آیُت اکھ عذابا زِندٕگی

زندگی کیا ہے؟ ایک رقص کرتا ہوا شعلہ، اشک، گلاب، ایک کرن والا دھندلا آفتاب، مکتب میں نئے سبق سے حیرت زدہ ایک طالب علم، ایک رنگ برنگی مگر مبہم کتاب، منزل کو پانے کا دھوکہ، صبح کا جنگل، بے سراغ نقشِ پا، تذبذب، عجلت، سرمے کی چھاؤں کا سراب، باہر سے شیتل جنگل لیکن اندر سے آتش فشاں، شعلہ صفت الفاظ سے نرگسی معنی اخذ کرنا اور بالآخر بظاہر لطف و سرور مگر حقیقت میں ایک عذاب۔ یہ پیکر تراشی دکھاتی ہے کہ راہؔی محسوسات کو پہلے سے بنے بنائے کسی فکری سانچے میں

نہیں ڈھالتے بلکہ استعارات اور تشبیہات ہی ایک نئے شعری معنی کو تشکیل دیتے ہیں۔
شاعری اور شعریات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن ہر شعری روایت میں ایسے عہد ساز شاعر ابھرتے رہتے ہیں جو اس روایت پر اپنی چھاپ ڈالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ راہیؔ کا شمار بھی ایسے ہی چند عہد ساز شاعروں میں ہوتا ہے اور اس اعزاز کی ایک بڑی وجہ ان کا مغربی شعریات سے استفادہ کر کے کشمیری شاعری کے کینواس کو وسعت دینا ہے۔

حوالہ جات

ٹی۔ای۔ایلیٹ The Scared Wood: Essays Methune, 1920 on Poetry and Criticism. London

جان کرو رینسم The World's Body. Port Washington, New York: Kennikat Press 1964

رحمان راہی سیاہ رُود جرین منز. سرینگر 1997

...... کَدلہِ ٹھُس پیٹھ. میزان پبلیشرز. سرینگر 2013

...... نوروزِ صبا. سرینگر. 1958

...... شارسنٛاسی. سرینگر 2004

شمس الرحمٰن فاروقی جدید شاعری: ایک سمپوزیم۔ مطبوعہ: جدیدیت: تجزیہ و تفہیم۔ مرتبہ ڈاکٹر مظفر حنفی، 1985 لکھنؤ

کلینتھ بُرکس The Well-Wrought Urn: Studies in the Structure of Poetry.London: Dennis Dobson. 1947.
Modern Poetry and the Tradition. University of North Carolina Press. 1939 ------------

گوپی چند نارنگ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات. قومی کونسل برائے فروغ اردو. نئی دہلی. 1993

☆☆☆

۔۔۔۔۔۔پروفیسر رتن تلاشی

کشمیری سے ترجمہ ۔۔۔۔۔۔مبشر رفاعی

رحمان راہی: میرے مشفق استاد

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ 1979 سے لے کر مرحوم راہیؔ کی یونیورسٹی سے سبک دوشی تک میں شعبۂ کشمیری میں راہیؔ کی شاگردی میں رہا۔ پہلے ڈپلوما اور ایم۔اے کے دوران طالب علم کی حیثیت سے، پھر ایم۔فل کے دوران وہ میرے نگراں رہے اور میرے پی۔ایچ۔ڈی کے دوران وہ شعبے کے سربراہ رہے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اِن برسوں کے دوران میرا اُن کے ساتھ کوئی گہرا تعلق رہا، البتہ اُسی نوعیت کا رہا جو استاد اور شاگرد کے درمیان ہوتا ہے۔ تاہم طالب علمی کے زمانے میں، میں اُن چند ایک طالب علموں میں شامل رہا، جن کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ یہ ادب نواز ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے پہلے میں راہیؔ کو جانتا ہی نہیں تھا۔ شاید میں نے اُن کا نام بھی نہ سُنا تھا، کیونکہ کشمیری ادب میں میری کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کچھ ڈرامہ نویسوں کے نام سنے تھے، کیونکہ اُن دنوں ریڈیو پر نشر ہونے والے ڈرامے سننے کا رواج عام تھا۔ لیکن کشمیری شاعری اور شاعروں سے میں مانوس نہیں تھا۔ ریڈیو پر کسی شاعر کا نام سُنا بھی ہوتا تو دھیان نہیں دیا تھا۔ کشمیری شاعری کے کچھ ایسے نغمے سُنے تھے، جو ریڈیو پر نشر ہوا کرتے تھے۔ 1979 میں یونیورسٹی کے شعبۂ کشمیری میں داخلہ لینے سے چند روز قبل میں نے مرحوم راہیؔ کو دیکھا۔ میں نے کشمیری

میں ڈپلوما کرنے کیلئے درخواست دی تھی، تاہم منتخب طالب علموں کی فہرست مشتہر نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ میں سرینگر میں اپنے برادر کے پاس قیام پذیر تھا اور ایک روز میں داخلے کے بارے میں جاننے کیلئے یونیورسٹی کے کشمیری شعبے میں گیا۔ اُن دنوں داخلے کیلئے کوئی امتحان نہیں ہوتا تھا بلکہ ڈگری کے میرٹ کی بنیاد پر داخلہ ملتا تھا۔ میں یونیورسٹی پہنچا۔ کشمیری شعبہ اُن دنوں آرٹس فیکلٹی کی قدیم عمارت میں تھا اور بعد میں کشمیری شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے رحمٰن راہیؔ آرٹس فیکلٹی کے ڈین کے کمرے میں ہی بیٹھتے تھے۔ میں ڈرتے جھجکتے کمرے میں داخل ہوا اور سلام بجالایا۔ راہیؔ پیلے رنگ کا چیک کوٹ زیب تن کئے اپنی کرسی پر تشریف رکھے ہوئے ناک پر عینک چڑھا کر کچھ کاغذات کی ورق گردانی میں مشغول تھے۔ میں ان کے بڑے میز کی ایک جانب کھڑا ہوا اور پوچھا، ''جناب! میں نے داخلہ فارم بھرا تھا، ابھی تک کچھ معلوم نہ ہوسکا۔''

''کیا نام ہے۔''، انہوں نے مجھ سے پوچھا۔''

میں نے اپنا نام بتایا۔ انہوں نے میز پر ایک پڑا ایک کاغذ پلٹ دیا اور کہا، ''چوتھا نمبر ہے۔ بس کچھ دنوں میں فہرست مشتہر ہوگی۔'' یہی وہ پہلی ساعت تھی جب میں نے راہیؔ کو دیکھا اور پہلی ہی ملاقات میں اُن کے مشفقانہ برتاؤ کی تصویر میرے ذہن کے کینواس پر ابھر آئی اور پھر یہ تصویر بہت دیر تک بنی رہی۔

بہرکیف، داخلہ ہوا۔ ڈپلوما کے بعد میں نے ایم۔اے بھی کیا۔ ایم۔اے کی کلاس شروع ہونے سے کچھ دن قبل کشمیری شعبہ اقبال لائبریری کی عمارت کے مشرقی حصے کی پہلی منزل میں منتقل ہوا۔ ایم۔اے کے دوران دو نئے استاد آئے۔ پہلے شفیع شوقؔ اور پھر مرحوم رشید نازکیؔ۔ لیکن اِن دونوں کے آنے سے پہلے راہیؔ اس شعبے کے واحد استاد تھے۔ شعبے کا واحد استاد ہونے کے باوجود وہ کلاس لینے کے معاملے میں

وقت کے پابند تھے اور یہ کہ جس دلچسپی کے ساتھ اُنہوں نے ہمیں کشمیری شاعری کا مضمون پڑھایا، وہ نہایت ہی قابل تعریف ہے۔وہ لوگ حقیقت میں خوش بخت ہیں، جنہوں نے راہؔی جیسے استاد سے کشمیری شاعری پڑھی ہے۔وہ محض شعر کے معنی اور تشریح تک ہی محدود نہیں رہتے تھے بلکہ قاری کو شعر کی طلسماتی دنیا کی سیر بھی کراتے تھے۔تقابلی طریقۂ کار اپنا کر نہ صرف کشمیری بلکہ چند دیگر زبانوں کے اشعار کی پہچان بھی کراتے تھے۔اُن کیلئے فقط شعر کے معنی جاننا ہی کافی نہیں تھا بلکہ شعر کے تجربے تک رسائی کے علاوہ یہ بھی اہم تھا کہ شعر کو کس طرح ادا کیا جائے۔اُنہوں نے شعبے میں کچھ کیسٹس رکھی تھیں، جن میں چند انگریزی اور اردو نظمیں صدابند تھیں۔صدابند کی ہوئی یہ نظمیں وہ کلاس میں سناتے تھے تاکہ ہم یہ جان سکیں کہ شعر یا شعر کے اقتباس پر کہاں زور دیا گیا ہے اور کہاں وقفہ لیا گیا ہے۔ایلیٹ کی نظم ''دی ویسٹ لینڈ'' انہوں نے اسی طرح ہمیں کلاس میں سنائی ہے۔سمجھانے کیلئے بعض اوقات وہ اپنی نظمیں بھی سناتے تھے۔کشمیری شعبے میں صرف کلاس روم میں پڑھائی ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ ادبی مطالعات کے ماحول کو فروغ دینے کیلئے راہؔی نے وہاں ادبی محفلوں کے انعقاد کی روایت کا آغاز بھی کیا۔یہ روایت آج بھی جاری ہے۔اس روایت کی رو سے ہر ہفتے کی جمعرات کو ایک ادبی محفل کا اہتمام ہوتا ہے جس میں ہر کلاس کے طلبا اور اساتذہ شرکت کرتے ہیں۔اُن دنوں محفل میں پانچ چھ طالب علم اپنے مقالات یا تخلیقی فن پارے پیش کرتے تھے، جن پر باقی طلبا وسیع بحث کرتے تھے۔بعض اوقات اِس محفل میں کسی ہم عصر قلم کار یا ادیب کو مدعو کیا جاتا تھا۔یوں کہا جائے کہ یہ محفل اظہار خیال کا مناسب ماحول پیدا کرنے کا ایک کارآمد وسیلہ تھی تو بے جا نہ ہوگا۔یہ محفل کچھ طلبا میں تخلیقی صلاحیت کو اجاگر کرنے اور تنقیدی سوجھ بوجھ پیدا کرنے کا باعث بھی بنی۔یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ یہ محفل کچھ اُبھرتے ہوئے قلم کاروں کیلئے ایک ورکشاپ ثابت

ہوئی۔حقیقت یہی ہے کہ ہم عصر کشمیری ادب اور ادبی مطالعہ کے کچھ اہم قلم کار اسی ادبی محفل کی پیداوار ہیں۔

ادبی محفل کے انعقاد کے علاوہ راہیؔ کے دور میں ادبی معاملات پر بحث وتمحیص کا ایک اور وسیلہ تھا۔اُن دنوں مختلف ادب نواز اور شائقینِ ادب کا کشمیری شعبے میں آنا جانا رہتا تھا،جن میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے وابستہ پروفیسر حامدی کاشمیریؔ، قاضی غلام محمد، پروفیسر شمس الدین، پروفیسر عبدالغنی مدہوشؔ اور پروفیسر محمد امین اندرابی جیسے اساتذہ شامل تھے۔حامدی کاشمیری اور قاضی غلام محمد کبھی کبھی ہماری کلاس بھی لیتے تھے۔طنز ومزاح ہمیں قاضی صاحب ہی نے پڑھایا ہے۔حامدیؔ جدید شاعری پڑھاتے تھے۔بہرحال! یہ اساتذہ کرام اکثر بریک کے دوران کشمیری شعبے میں آتے ، شعبے کے سامنے والے صحن میں دائرہ بنا کر کرسیوں پر راہیؔ صاحب کے ساتھ بیٹھتے اور کسی نہ کسی ادبی معاملے پر بحث چھڑ جاتی تھی۔کچھ طلبا پرانی کرسیاں اٹھا کر لاتے اور اسی دائرے کے اردگرد ایک اور دائرہ بنا کر بیٹھ جاتے تھے۔زیادہ تر اِن ہی اساتذہ کی گفتگو سنتے تھے۔ہاں! کبھی کوئی طالب علم لب کشائی کرتا تو اُس کو ٹوکا نہیں جاتا تھا اور نہ اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔کبھی کبھار یونیورسٹی سے تعلق نہ رکھنے والا کوئی ادیب بھی وہاں آ کر گفتگو کی اس محفل میں شریک ہوجاتا تھا۔اس طرح راہیؔ صاحب کے زمانے میں کشمیری شعبے میں سیکھنے سکھانے کے بہت سارے وسائل تھے۔

راہیؔ صاحب طالب علموں کو غیر نصابی کتابیں پڑھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔کون سی کتاب پڑھی جائے،کبھی کبھی اِس کی صلاح بھی دیتے تھے۔میں نے راہیؔ صاحب کے مشورے پر ہی ڈیوڈ ڈیشز کی تنقید سے متعلق کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔اکثر پوچھا کرتے تھے،''کون سی نئی کتاب پڑھی ہے؟''اسی وجہ سے لائبریری میں سے ادب کے موضوع پر کوئی نہ کوئی کتاب لانی ہی پڑتی تھی۔بھلے ہی اس کتاب

کے مضامین کی محض فہرست دیکھنے کیلئے تاکہ اگر وہ مواد سے متعلق کوئی سوال پوچھیں، تو ہم اس کا جواب دے سکیں۔ان دنوں گوگل کا جنم بھی نہیں ہوا تھا، جہاں سے کسی بھی کتاب کی جانکاری ملتی۔

طالب علم کی کسی بھی غلطی کی نشاندہی کوئی بھی استاد کرسکتا ہے،لیکن جو طالب علم کی کسی بھی خوبی کی نشاندہی کرے،ایسے استاد آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔یہ خوبی راہؔی مرحوم میں پائی جاتی تھی۔کسی بھی طالب علم میں کوئی خوبی دیکھ کر وہ اس کی تعریف کرتے تھے۔مجھے چند ایک بار اس کا تجربہ ہوا ہے۔مثلاً ایم۔اے کے پہلے سمسٹر کا پہلا پرچہ ''لل دید اور شیخ العالم''۔یہ مضمون راہؔی پڑھاتے تھے اور انہوں نے ہمیں لل واکھ کے موضوعاتی مطالعات پر مبنی پیپر لکھنے کو کہا تھا۔وہ طالب علموں کی تحریروں کا باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرتے،نمبرات دیتے اور سدھار کی گنجائش کی صورت میں اس پر ایک نوٹ بھی لکھتے تھے۔اگر کوئی بات پسند آتی تو اس کی بھی نشاندہی کرتے تھے اور پھر طالب علموں کو پیپر واپس لوٹا دیتے تھے۔چنانچہ میں نے بھی ٹرم پیپر لکھا جس میں، میں نے لل دید کے کچھ اشعار کا تجزیہ کر کے اُن کے موضوعاتی اظہار پر روشنی ڈالی تھی۔میں نے اس مقالے میں لل دید کے ایک واکھ(شعر) ''نابدٕ بارس اٹہٕ گنڈ ڈیوٗل گوم'' کے نفسیاتی نقطۂ نظر کا معقول دلائل کے ساتھ تجزیہ کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ لل دید نے اس واکھ(شعر) میں ازدواجی زندگی سے اپنی محرومیت کے درد کا اظہار کیا ہے۔شاید آج کی تاریخ میں اس واکھ کی ایسے انداز میں تشریح نہیں کرسکوں گا۔اکثر ایسا ہوتا تھا کہ راہؔی صاحب کو اگر ایسے مقالوں میں کوئی بات پسند آتی یا توجہ طلب اور اچھی محسوس ہوتی تو وہ اپنے قلم سے اس پر دو نشان لگا دیتے۔ بصورت دیگر عام اساتذہ کی طرح باقی جگہوں پر ایک ہی نشان لگاتے تھے۔لل دید کے اس واکھ کے تجزیے پر انہوں نے پانچ چھ مقامات پر دو دو نشان لگائے تھے۔یعنی

ان کو میری یہ تشریح بہت پسند آئی تھی۔اسی برس شعبے کا سالانہ سمینار منعقد ہوا۔مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ سمینار کا موضوع کیا تھا!۔اس سمینار میں کسی مقالے پر شعر کی تعبیر کے تعلق سے کوئی سوال اٹھایا گیا۔مقالہ نگار کی جانب سے جواب آنے کے بعد راہیؔ بھی اس پر مزید بات کرنے کیلئے اُٹھے۔انہوں نے میرا نام لئے بغیر اُس وقت بھی میرے ٹرم پیپر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ شعر کی کوئی بھی تشریح کی جاسکتی ہے، بشرط یہ کہ شعر کے الفاظ ہمارا ساتھ دیں۔اس طرح کا ایک اور واقعہ ان کی سبک دوشی کے بعد کا ہے، جب میں ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھا۔وہ یہ کہ سال 2001 یا 2002 میں ریڈیو کشمیر سے ''مہندی'' کے موضوع پر میری ایک بات چیت نشر ہوئی۔اسی دن میرے لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی۔راہیؔ صاحب کا فون تھا۔انہوں نے کہا، ''بات چیت سنی۔کافی پسند آئی۔''میں حیران ہوگیا کہ ٹیلی ویژن کے اس دور میں بھی راہیؔ باقاعدگی اور توجہ کے ساتھ ریڈیو سنتے ہیں اور وہ بھی اس نوعیت کی بات چیت۔ایسا کئی بار ہوا ہے کہ مجھے راہیؔ صاحب کو فون کرنے کی ضرورت آن پڑی۔لیکن میرے لئے یہ راہیؔ صاحب کا پہلا اور آخری فون تھا۔دیکھئے......! پہلے ریڈیو پر سننا، پھر اس بات چیت کا پسند آنا، پھر میرا فون نمبر حاصل کرنا اور پھر بات چیت پسند آنے کا اظہار کرنے کیلئے مجھے فون کرنا۔یہ ان کا بڑا پن تھا۔شاید میں اپنے شاگرد کی تعریف کرنے کیلئے اتنی مغزماری نہیں کروں گا۔

ڈپارٹمنٹ میں راہیؔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے دکھائی دیتے تھے،لیکن کبھی کبھار غصہ بھی کرتے تھے۔خاص کر جب کسی استاد کو کلاس لینے میں تاخیر ہوجاتی یا کسی وجہ سے کلاس لینے سے کوئی استاد قاصر رہتا۔اس پر راہیؔ سخت ناراض ہوجاتے تھے۔راہیؔ اُس وقت بھی ناراض ہوجاتے تھے، جب ملازمین کسی دفتری کام میں تساہل پسندی کرتے تھے۔دفتری معاملات میں وہ کافی سنجیدہ تھے اور کسی حد تک ڈرپوک بھی۔کسی

بھی کاغذ میں کوئی غلطی نہ ہو،اس کا خاص خیال رکھتے تھے۔البتہ دوسرے نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو خود دار تھے۔اُن دنوں یونیورسٹی کے بیشتر شعبوں کے سربراہان ، یونیورسٹی افسران اوران سے وابستہ عملے کی میزوں کا باقاعدگی سے طواف کر کے ہی ڈیپارٹمنٹ آتے تھے۔لیکن راہیؔ اس مزاج کے حامل نہیں تھے۔وہ میٹنگ میں شرکت کی غرض سے ہی افسروں کے دفاتر میں جاتے تھے یا اُس صورت میں ، جب ان کا ذاتی طور جانا ناگزیر بن جاتا۔میں نے چند ایک بار ان کو یہ بولتے ہوئے سُنا ہے، ’’عاقلوں کا قول ہے کہ گھوڑے کے پیچھے سے اور افسر کے آگے سے نہ گزرنے میں ہی عافیت ہے۔‘‘ان کو جب کبھی انتظامیہ کے ساتھ کسی معاملے سے متعلق مسئلہ درپیش آتا تو اُس صورت میں ڈیپارٹمنٹ کا ریسرچ اسسٹنٹ سومناتھ پنڈت اُن کیلئے سنکٹ موچک ہنومان بن جاتا۔وہ شاذ ونادر ہی ریسرچ اسسٹنٹ کا کام کرتا تھا۔زیادہ تر دفتری کام کی ذمہ داریاں ہی سنبھالتا تھا۔دفتری معاملات میں راہیؔ ،سومناتھ جی پر بہت بھروسہ بھرتے تھے۔میں نے انہیں بہت سے کاغذات پر’’ Somnath to speak ‘‘ لکھتے دیکھا ہے۔یعنی سومناتھ ان کے صلاح کار تھے۔ہم کو بھی اگر کوئی ایسی بات راہیؔ سے منوانی ہوتی ،جس کے بارے میں ہمیں یہ خدشہ رہتا کہ وہ نہیں مانیں گے،تو اس کیلئے سومناتھ پنڈت ہی ہمارا وسیلہ بنتے۔

راہیؔ کے زمانے میں ڈیپارٹمنٹ کا ماحول خوشگوار تھا۔ ورنہ شعبوں میں اکثر اساتذہ کے درمیان رقابت پائی جاتی ہے اور رقابت کی اس چکی میں طلبا ہی پستے ہیں۔ طالب علم کے کسی ایک استاد کے ساتھ تعلقات اچھے بن جائیں تو دوسرے استاد کو برداشت نہیں ہوتا ہے۔لیکن جب راہیؔ کشمیری شعبے کے سربراہ تھے،وہاں ایسا ماحول نہیں تھا۔شعبے میں راہیؔ صاحب کے علاوہ دو اور اساتذہ تھے،رشید نازکی اور شفیع شوق۔ نازکی اور شوق کے نظریات میں زمین وآسمان کا فرق تھا،تاہم شاگردوں کی دونوں

کے ساتھ قرابت تھی۔ہم کلاس کے باہر بھی نازکی صاحب کے ساتھ گھل مل جاتے تھے اور ہم عمر ہونے کے احساس کی وجہ سے شوق صاحب کے ساتھ کوئی تکلف نہیں رہتا تھا۔راہیؔ صاحب کے ساتھ بھی ہمارا رابطہ کلاس روم تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ کلاس روم کے باہر بھی رابطہ رہتا تھا۔اُن دنوں اُن کے دولت خانے پر جانا کچھ طالب علموں کا معمول تھا۔ڈپلوما کے آخری ایام میں ہم نے ''کاشُر سمُت'' نام کی ایک ادبی تنظیم کی تشکیل عمل میں لائی، جو کشمیری زبان کی ترقی اور ترویج کیلئے سرگرم عمل رہی۔اس تنظیم کی میٹنگ ہم راہیؔ صاحب کے گھر کے صحن کے پائین طبقے میں کرتے تھے۔اس تنظیم کے زیراہتمام ''سمُت'' نام سے ایک اخبار بھی جاری ہوا، جو کچھ شماروں کی اجرائی کے بعد قصہ پارینہ بن گیا۔الغرض تنظیمی سرگرمیوں کے سبب راہیؔ صاحب کے گھر ہمارا آنا جانا رہتا تھا۔طالب علمی کے زمانے میں ہم یونیورسٹی کے باہر کسی بھی ادبی محفل میں شرکت کرتے تو راہیؔ صاحب کی شاگردی کے احساس اوراعتماد کے ساتھ کرتے۔ اکثر کشمیری ادیب کشمیری کے طالب علموں کو راہیؔ صاحب کا دست و بازو قرار دیتے تھے۔راہیؔ صاحب نے اُسی دور میں کشمیر یونیورسٹی کا ترانہ لکھا۔شاید تب ہم ایم۔اے کے پہلے سال میں تھے۔یہ ترانہ سب سے پہلے انہوں نے ہمیں کلاس میں سُنایا اور ہمارے شعبے کے طالب علموں، جن میں شوکت فاروقی کے علاوہ دیگر کچھ طالب علم بھی شامل تھے، نے یہ ترانہ اپنے ابتدائی زمانے میں مختلف تقریبات پر گایا۔

ہمارے Batch کے بعد ایک اور Batch فارغ التحصیل ہوا اوراس کے بعد ہی اس شعبے میں تحقیق کا کام شروع کیا گیا۔ان دنوں ایم۔فِل کے داخلے کیلئے کوئی تحریری امتحان نہیں لیا جاتا تھا۔راہیؔ نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ وہ ان دوBatches میں سے صرف تین طالب علموں کو ایم۔فِل کی ڈگری کروائیں گے۔ان میں نسیم شفائی، مجروح رشید اور میں ناچیز شامل تھے۔میں یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے

کے بعد حبہ کدل سری نگر میں اپنے برادر کے پاس رہائش پذیر تھا۔راہیؔ صاحب نے شعبے کے نور محمد نامی چپراسی کو میرے گھر بھیج کر مجھے ڈپارٹمنٹ میں حاضر ہونے کا پیغام بھیجا۔اس طرح ایم۔ فِل کیلئے میرا اندراج ہوا جس کیلئے راہیؔ میرے نگران تھے۔اس دوران مواد حاصل کرنے میں راہیؔ نے میری کافی مدد کی۔اپنے ایم۔فِل کے موضوع سے متعلق کچھ کتابیں مجھے جب نہ ملیں تو میں نے راہیؔ صاحب کے سامنے اس بات کا اظہار کیا۔انہوں نے مجھے گھر آنے کیلئے کہا۔ایک روز میں چلا گیا۔اپنے مکان کی دوسری منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں راہیؔ صاحب نے کچھ کتابیں رکھی تھیں۔میرے مطلب کی کتابیں دیکھنے کیلئے انہوں نے مجھے اس کمرے میں جانے کو کہا۔مجھے اس کمرے میں اپنے ایم۔فِل کے موضوع کی درجن بھر کتابیں مل گئیں۔انہوں نے مجھے قلم اور کاغذ دیتے ہوئے ان کتابوں کی فہرست بنانے کیلئے کہا۔اس پر میرا نام بھی لکھوایا۔انہوں نے یہ کاغذ سنبھال کر رکھا اور میں چائے پی کر وہاں سے چل پڑا۔اُس دن مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ گھر سے باہر راہیؔ اگرتیس مار خان ہیں، لیکن گھر کے اندر ان کی اہلیہ کی چلتی ہے۔وہ نہ صرف گھر سنبھالتی تھیں بلکہ راہیؔ صاحب کے معاملات بھی سنبھالتی تھیں۔مجھے لگا تھا کہ کتابیں واپس کرنے کے وقت تک یہ کاغذ ضائع ہوجائے گا۔لیکن جب آٹھ نو ماہ بعد میں کتابیں واپس کرنے راہیؔ صاحب کے پاس گیا تو میں یہ دیکھ کر کافی حیران ہوگیا کہ راہیؔ صاحب کی اہلیہ کاغذ کا وہی پرچہ لے کر آئیں اور کتابیں گن گن کر وصول کی۔

راہیؔ ایک تجربہ کار استاد اور ایک بلند پایہ عالم و شاعر تھے۔تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنے وطیرے میں وہ کبھی کبھی فکشن کے دورخی کرداروں کی مانند غیر متوقع شخصیت بن جاتے تھے۔پی۔ایچ۔ڈی کے دوران انہوں نے ایک روز مجروحؔ صاحب اور مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور گویا ہوئے، ''ان لڑکوں سے دور ہی رہا

کرو۔'' پھر انگریزی میں بولتے ہوئے کہا،'' Behave Yourself as Teachers''۔ ہمیں لگا کہ جس شعبے میں ہم طالب علم تھے، وہاں اب شاید ہمیں پڑھانا ہوگا۔ لیکن کچھ دن بعد ہی پتہ چلا کہ راہیؔ نے ایڈہاک بنیادوں پر ہمارے دو جونیئرس کی تقرری عمل میں لائی تھی۔ چند ایک دنوں میں ان کی سوچ میں آئی اس تبدیلی کو ہم کبھی نہ سمجھ سکے۔ بہر حال راہیؔ کوئی فرشتہ نہیں بلکہ ایک انسان تھے۔ میرے لئے راہیؔ صاحب ہمیشہ ایک قابل احترام استاد رہے، جنہوں نے میری بے سمت زندگی کو ایک سمت عطا کی۔ میرے ذہن میں ان کی وہی قابل احترام تصویر تھی، جو اُن کے ساتھ ہوئی پہلی ملاقات میں بنی تھی۔

بہر حال! جب بھی راہیؔ کی بات ہوتی ہے تو ان کی ادبی خدمات کا ہی ذکر ہوتا ہے۔ مگر ان کی یہ خدمت بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے کشمیری زبان کو قلم کاروں کی ایک ایسی نسل دی، جنہوں نے آگے چل کر اپنی بیش قیمت تحریروں اور اپنے تجربات سے کشمیری زبان کے ادبی سرمائے کا دامن بھر دیا۔ ان میں نسیم شفائیؔ، مجروحؔ رشید، شادؔ رمضان، فاروق فیاضؔ، بشرؔ بشیر اور ولی محمد خوش باشؔ وغیرہ جیسے قلم کار شامل ہیں۔ راہیؔ نے اپنے طالب علم اس قابل بنائے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں۔ دور حاضر میں راہیؔ کے سبھی طالب علم کشمیری ادب کے مطالعاتی افق پر ستاروں کی مانند چھائے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

.......پروفیسر شاد رمضان

کشمیری سے ترجمہ ......ارشد حسین

رحمان راہی: منفرد اسلوب کا شاعر

شاعری انسانی تجربے کا لسانی بیان ہے۔اس لسانی صورت میں پیدا ہونے والے تجربہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے قاری کے اندر حقیقت کے ساتھ ہم کلام ہونے کے لئے عشق بھی ہونا چاہئے اور لسانی برتاؤ اور سلوک کی صلاحیت بھی۔ بقول غالبؔ

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہُوا دیدہ بینا نہ ہُوا

پروفیسر رحمان راہی آج تک کی کشمیری شاعری کا وہ قدآور شاعر ہے جس کی شاعری ہم دنیا کی اہم زبانوں کے عظیم شاعروں کے ادب پاروں کے ہم پلہ رکھ سکتے ہیں۔آپ کی شاعری پڑھ کر وہ احساس کم تری کا جذبہ کسی حد تک کم ہو جاتا ہے جو ہم کچھ زبانوں کا عظیم ادبی سرمایہ پڑھ کر دل ہی دل میں محسوس کرتے ہیں۔رحمان راہی کی شاعری کی اہم اور قابل توجہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کی اَن گنت جہتوں اور بوقلموں شبیہات کی ترجمان ہے۔کلہم انسانی کوائف واحوال کا فکر انگیز اظہار بھی اور عصری زندگی کے گنجلک مسائل اور پیچیدہ افکار و نظریات کی امنگ بھی ہے۔موصوف شعوری طور ان نئی اور بوقلموں شبیہات کا احساس دلانے اور انہیں نمودار کرنے کی سنجیدہ کوشش کر کے ان

جدید دلکش وپُر رونق شبیہات کو نغمگی بخشتا ہے۔اُن کی شاعری کی زبان پوری کشمیری شاعری میں ایک منفرد و ممتاز مثال ہے جو مرزا غالبؔ کے اس شعر کا احساس دلاتا ہے۔

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

پروفیسر رحمان راہی کا دوسرا اہم شعری مجموعہ ''سیاہ رودِ جرین منز'' ہے۔ یہ کتاب کشمیری زبان کا وہ پہلا شعری مجموعہ ہے جس نے ثابت کردیا کہ کشمیری زبان مشکل سے مشکل تجربہ، خیال یا احساس کے بیان کا اعلیٰ تخلیقی مقام حاصل کرنے کی صلاحیت و اہلیت رکھتی ہے۔ کشمیری زبان کے معروف محقق و نقاد محمد یوسف ٹینگ اس کتاب پر اپنا تنقیدی تبصرہ یوں لکھتے ہیں۔

''سیاہ رودِ جرین منز'' کشمیری زبان کی وہ پہلی کتاب ہے جسے ہم عالمی سطح پر پیش کر سکتے ہیں۔''

انگریزی زبان وادب کے معروف استاد ڈاکٹر غلام رسول ملک ''سیاہ رودِ جرین منز'' کتاب کے متعلق اپنا تبصرہ یوں بیان کرتے ہیں؛

''کشمیری زبان کے جتنے شاعر لل دید سے لے کر آج تک پیدا ہوئے ہیں ان تمام میں رحمان راہی سب سے اہم اور عظیم شاعر ہیں۔''

کشمیری ادب کی تاریخ رقم کرنے والے مصنف پروفیسر شفیع شوق ''سیاہ رودِ جرین منز'' کے شعری مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بات کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ رحمان راہی ہمارے عظیم شاعر ہیں، ''سیاہ رودِ جرین منز'' کشمیری زبان وادب کی ایک اہم ترین کتاب اور قیمتی سرمایہ ہے''۔

اس شعری مجموعہ کا نام کتاب کے آغاز میں ہی شامل ایک غزل کے شعر سے منتخب کیا گیا ہے۔

ژھیوِ ژأ نگِ اَتھن ہِنٛدِ کھَن تہِ کوتر موٗ دِ
سیاہ رودِ جریٚن منز گو سانہِ کوٚت پٔٹھ دراکھ

زیر بحث کتاب کے اندر رحمان راہی کا گزشتہ پچاس سالوں کو محیط منتخب کلام جمع کیا گیا ہے جس میں نظم، غزل اور نعت خوانی شامل ہیں۔ نظمیں پابند، آزاد اور نیم آزاد ہیں۔ موضوعاتی اعتبار اور شاعرانہ تجربوں کے لحاظ سے کتاب میں شامل نظمیں رحمان راہی کی شاعری کے تین ادوار کا احاطہ کرتی ہیں۔ پہلے دور کی شاعری میں شاعر ترقی پسندی کو الوداع کر کے جدیدیت کی طرف اپنا رُخ کرتے ہیں جسے ہم رحمان راہی کی شاعری کا تغیر وتبدل کا دور کہہ سکتے ہیں۔ مجموعہ ''نورو زِصبا'' میں شاعر اپنے پہلے دور کی شاعری کو الوداع کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے اور جدیدیت کے نئے رجحان تلے پھلنے پھولنے والے نئے دور کی ابتدا کرتا ہے۔ اس درمیانی دور کی نظمیں ''سہلاب تہ ساحل''، ''خوشک شہرس منز''، ریہہ تہِ رقص''، ''بہ چُھس راوان'' اور ''اژھبن نغمہ'' وغیرہ ہیں۔ ''سہلاب تہ ساحل'' نظم کے یہ چند اشعار نمونہ کے طور پیش ہیں:

مزازے چُھ پارُد بے سوکھ کأینانس
ہواڈوٚل شمع ژھیوو ژھوکہِ شب صبح پھوٚل
وُنی اوس کفنس وِلتھ ماگ ڈولان
وُنی وُپھلہِ شراون بہارن مشکِ مول

☆

چھےٚ یتھ عالمس أڈرن اختلاجٕ
ازل شینہِ بالاہ ابد تاپہِ کالاہ
وَنس منز چُھ پادر ہٕہُن گرٕز حقیقتھ
پٔتُن مَد چُھ ہرنس دٕژن شوخ ڈالاہ

☆

دِلا یُتھنۂ ئلِو دامنس لادَ ہیاوَکھ
چھےٚ باغس اندررنگ بڑنگو ذٔ ژپوشن
اگر رٔٹ نۂ یمبرزلو پرارنچ خوے
بۆمبُر زندِ تھاوان چھ سوٗنچ رٕوا یتھ
اگر زن ہرُد آسہ سوزان وندس سَے
دٔ زِتھ بونۂ رٔژھران چھےٚ گریشمک امانتھ

شاعر کو زندگی کی حسین، دل آویزاور خوش نما حقائق کے ساتھ ساتھ اس کے اذیت ناک و تلخ تجربوں کے ساتھ ملاقات ہو جاتی ہے۔ زندگی جہاں ہرن کا شوخ ناچ ہے وہی یہ شیر کی خونخار جھپٹ بھی ہے جہاں یہ کِھل کر مرجھا جانے والی یمبر زل پھول کی مانند ہے وہیں یہ موسم خزان میں بہار کا خیال بخشنے اور امید دلانے والا چنار بھی ہے۔ اُس زمانے کی اور ایک نفیس اور دل رُبا نظم ''بہ چھس راوان'' ہے جس میں عاشق اپنی معشوق کو زمانہ جوانی کے دلنشین اور میٹھے لمحات کو یاد دلا کر کہتا ہے۔

ژےٚ آسی ووٚنی مُشتھ گومُت سُہ عالم
ہواوس اوس زن لوٗچن لمان کانٛہہ
گوان بجلی تھمبَس نکھ اُس کتی جاہ
کھٔرِکھ ڈالانی کَنی چھیٚلی مُتی پلو ہیتھ
ووٚزُل چھٹہٕ ہنٛد پھرن ننہٕ تاپہٕ ووٚشلیو و
غاۓفل پاۓٹھی نۆودیُت اُلچِن میٚے
مَلکھ ژٔڈ ژٔڈ تٔرِکھ زن اُنزِنی وولرس
ٹینڈٕرن ژِہ ژِہ دِوان ترٛ ووُتھ بمن خم
ژٕ چھکھ ووٚنی سۆ درٕینٛی اکھ خانہٕ دارٕینٛ

چُھ آنگن چانہِ رنگ روٹمت گلالو
زمانا گوو ؤں بتہٕ شُری بأژ سوٚمبرِتھ
کڈان چُھس زندگیہ ریٚشمی پَنس کھُر

موضوعی اعتبار سے یہ نظم ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ یہ نظم ماقبل عشقیہ شاعری کے مقابلہ میں ایک نیا لہجہ اور مزاج بیان کرتی ہے۔ رسول میر اور غلام احمد مہجور نے کشمیری عشقیہ شاعری کے محبوب کو خیالی اور آسمانی فضاؤں سے باہر نکال کر زمینی و عملی زندگی کے قریب لایا تھا لیکن مذکورہ نظم کے اندر یہی زمینی محبوب بالکل حقیقت پسندانہ، معروف اور روزمرہ زندگی کا رُوپ دھار لیتا ہے۔ یہ عملی محبوب عام کشمیری لڑکی کی مانند اپنے کپڑے دھوتا ہے، انہیں دھو کر سکھانے کے لئے دھوپ میں پھیلاتا ہے اور گھر کے برآمدے پر نکل کر اپنے سرِ انگشت کو ہلا ہلا کر عاشق کے دل میں عشق کی حرارت کو مہمیز بخشتا ہے۔ یہ محبوب باضابطہ طور ایک زندہ و جاوید کردار بن جاتا ہے اور عاشق حقیقی زندگی کا ترجمان بن جاتا ہے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس نظم کی وساطت سے کشمیری شاعری میں ایک حقیقت پسندانہ اور رومانوی عشقیہ شاعری کا آغاز ہو جاتا ہے اور اس اعتبار سے یہ نظم کشمیری عشقیہ شاعری میں ایک نیا موڑ اور طرح دینے کے سفر میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم کی ڈرامائی صورت حال اور اس صورت حال کو بخشی ہوئی موزون اور برمحل آواز اُس زمانے تک کی کشمیری عشقیہ شاعری میں ایک نئی اور منفرد مثال ہے۔

یہ حقیقت عیاں راچہ بیاں ہے کہ کشمیری زبان میں نظم لکھنے کی روایت بہت پُرانی ہے۔ شیخ العالم سے لے کر مہجور اور آزاد تک نظم کے کئی نمونے منصۂ شہود پر آئے لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ موجودہ دور کی نظمیں کشمیری زبان میں موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ایک نیا مزاج، لہجہ اور آہنگ رکھتی ہیں۔ اس نئے آہنگ اور مزاج میں رحمان راہی کی نظم موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے ایک نئی تخلیقی بنیاد ہے۔ راہی کی اس قسم کی

نظمیں نہ ہی بیانیہ انداز اختیار کرتی ہیں جس کے اندر کوئی خیال براہ راست بیان ہو اور نہ ہی غیر ضروری تفصیل کی نذر ہو جاتی ہیں بلکہ ان نظموں کے اندر موضوع اور ہیئت کا تخلیقی سنگم پیدا ہو جاتا ہے۔ یا ایسا بھی کہا جا سکتا ہے کہ نظم ایک زندہ جاوید وجود کی مانند کلام کرتی ہے، پروان چڑھتی ہے اور نشو ونما پا کر بالغ ہو جاتی ہے۔ انگریزی زبان سے جو (Short Poem) مختصر نظم کا تصور کشمیری زبان میں وارد ہو گیا اس کی بہترین مثال ''سیاہ رودِ جرین منز'' نامی مجموعہ میں شامل ''پےچھُ ظلماتہٕ وُزان'' جیسی نظم ہے جو موضوع اور ہیئت کی ہم آہنگی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس نظم کی ڈرامائی صورت حال دیکھئے :

راتھ اڈٕ نِندر گرٕ ہتھ ژھیوٚن مےٚ خیالن ہیو
پٲزا کھ ذیہنچہِ وَن ژھایہِ أندٕری پرٛ زنووُم
توٗنتہِ لتس اوس تتھے پٲٹھی وُہاں کوتر رَتھ
بالہٕ تیتنائلی چھیٚنے تیر دٕنان فضہس منٛز

نظم میں سے ایک کردار نمودار ہو جاتا ہے جو نصف شب کے اندر گہری نیند سے اُٹھ کر اپنے لاشعور کے اندر جھانک کر اسے ٹٹولتا ہے۔ اپنے لاشعور کو ٹٹول ٹٹول کر یہ کردار ایسی صورت حال کے اندر جا پہنچتا ہے جہاں عُقاب کی چونچ سے شکار ہوئے کبوتر کا خون اُڑتا ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر فضا میں شکار ہوئے کبوتر کے پنکھ اُڑ رہے ہیں۔ نظم میں سے نمودار ہوا کردار اپنی صورت حال کو قوت بیان بخش کر کہتا ہے:

شاندٕ پیٚٹھی کأرِ پھرٕم سوٚن تہِ سیاہ چاہ ڈیوٗنٛٹھم
شینہٕ تھوٚسی آسی ژھپٕن جاےسران دٕرزَن منز
ونگی جہِ پیٹھ پھہٕر نہٕ بدل اوس اویزان بیوٗ ارہ
أتھی اندر گوم کنن راتہٕ موٗغلی موٗ دوٗ ہوٗ
دل اگر ساتھ مےٚ دِی ہے بہ وون کر بکھ دمہٕ ہا

یہ ایک خوف ناک اور ڈراؤنی صورت حال ہے جہاں اس قدر ہیبت ناک اور سنگین خیالات قلب وذہن میں جنم لیتے ہیں مگر یہ خوف ناک صورت حال اُس وقت ناگہاں طور بدل جاتی ہے جب اس کردار کو اچانک سے اپنا لختِ جگر یاد آجاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ منظر ایک طلسماتی عالم کو جنم دیتا ہے جو موت کے بجائے زندگی کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے اور خوف ودہشت، یاس وقنوط اور بدصورتی کے بجائے سکون واطمنان، امید اور خوشحالی کی فضاء کو جنم دیتا ہے:

ناگہابِ یاد مگر پیؤم پنُن لختِ جگر
کالہِ بچھووے نش شوقہِ کتھن کن دأرِتھ
دادِ ستۍ ہانگہِ کُس حال سپُد باوِیُو مَس
تمۍ مگر بوُز أڈِے کتھ تہِ نیندرِ میٹھِیس

یہ ایک انسان کی نفسیاتی کیفیت ہے جس کے اندرون میں خوف رچا بسا ہے لیکن انسان اس خوف ناک صورت حال سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور ہمت و حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ نظم کا عنوان ہی انسان کی نفسیاتی صورت حال کو اظہار بخشتا ہے یعنیُ ظلماتہ منز چھ آبِ حیاتک پَے وُزان''۔ جس طرح معروف کشمیری شاعر وہاب کھاؔر خون جگر جلا کر ظلمات میں سے چُن چُن کر لعل و گوہر ڈھونڈ کر ان کی پہچان کرتا ہے:

شمع زاجؤم ہٹہ کے رَتے سُہ گہہ ظلماتہِ پیؤم
اتھ ظلماتس لال کیا چھےٚ سُہ کس پتے گوم

زیر بحث شعری مجموعہ میں اس قسم کی کئی اور نظمیں جیسے بدبین، اُہی، اوش تپ اَسُن ،قعر دریا، سلسبیل یا چون خط وتم شامل ہیں۔

پروفیسر رحمان راہی کے دوسرے دور کی شاعری کا تعلق اُس رجحان کے ساتھ

ہے جسے ہم عرف عام میں جدیدیت کہتے ہیں۔اس دور کی شاعری ترقی پسندی اور رومانویت کو پرے چھوڑ کر حقیقت کو ہوش بینی کے ساتھ بغل گیر کراتی ہے۔ راہی کی شاعری کا یہ دور ''سیاہ رودجرین منز'' کا دور ہے جہاں زندگی کے نشیب وفراز کے ساتھ نبردآزما انسان کے محنت کش ہاتھ اور حُسن گویائی دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور روایتی اقدار اور رشتے منہدم ہوئے جاتے ہیں۔حالات وکوائف کی شکست و ریخت، پشیمانی اور زبوں حالی رحمان راہی کے اس دور کی نظموں سے عیاں ہے اور کشمیری شاعری کے اندر موضوعاتی اور ہیئت کے اعتبار سے ایک نئے مزاج اور لہجے کی آئینہ دار ہیں۔

رحمان راہی کشمیری زبان کے وہ نابغۂ روزگار شاعر ہیں جو بہ یک وقت انگریزی، فارسی اور اردو زبان میں لکھے گئے عظیم ادب کا وسیع وعمیق مطالعہ رکھتے ہیں جس نے اس کے تخیلی پرواز کو وسعت وفروتنی بخشی اور اس کے اندر کے شاعر کی تخلیقی پرواز نے اُڑان بھر کے نئی نئی سرحدیں تلاش کی۔اپنی شاعری کے دوسرے دور میں اس روشن مغز اور زیرک شاعر نے ایسی نظمیں صفحۂ قرطاس پر لائیں جو نہ صرف موضوع، ہیئت کے اعتبار سے کشمیری زبان کی شاعری میں نئی اور تازہ دم تھیں بلکہ اسے کشمیری نظم گوئی کا ارتقاء بھی آساں ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج کی تاریخ میں کشمیری نظم کو ہم دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ شاعری کے ہم پلہ رکھ سکتے ہیں۔اس جدید رجحان کی ترجمانی کرنے والی نظموں میں ''مے نے زبوآسہے دزمژ، رود، ملاقاتھ، تعارف، درامُن، ہوا، نیول غزل تہ صدا'' جیسی نظمیں شامل ہیں۔نظم ''صدا'' اس جدید رجحان کی ایک بہترین مثال ہے جو مرزا بیدلؔ کے ایک فارسی مصرعہ سے شروع ہو جاتی ہے۔

چوں صدا سیرم بیروں از کوچۂ زنجیر نیست ؎

ژیُس چھکھ تہٕ سُہ (بیدل)

مێون فٕری یادبۄز

سۄ درس اۄ برٕ رنگ

آفتابس لوٚٹیوٚک

بُتراژنیچہِ کیوٚم

واوَس ہنٛدِ پوشک فونوس

بوز کھ ہے چُھکھ

بوز مێون فٕری یاد

یہ نظم کائنات میں پڑے ہوئے بے سکون انسان کی صورت حال ہے۔اُس انسان کی جسے عقیدہ سے عاری ہونے اور قدروں کے مسمار ہونے کا خوف عذاب بن کر جگر پارہ پارہ کرتا ہے، اُس انسان کی جسے ہونے کے باوجود نہ ہونے کا احساس آنکھ کا تنکا بن کر تہہ و بالا کر دیتا ہے۔

پتہٕ کنہِ اوسُم شیٖتل ژھایت رٲیل ون

اَن زاٰنی منز ہُش مُش پاٛٹھین نیوٗم تھٔلِتھ

(روتلہِ چھم تار کھنب وہوان)

بُتھِ اٰسم خلو کھ زُوی پٕری ین ہنٛدی

وَنونہٕ آلو

تم کھیٚسیم یمو تیز اٰبٕ سونچو سیٚکہِ شاٹھس پیٹھ

نیٚکہِ نیٚکہِ دِگہ دِگہِ

(دوہلی ہۄنی وُنگان)

نظم کے اندر پیدا کی ہوئی صورت حال صرف آج کے جدید انسان کی نہیں ہے یا کسی مخصوص دور سے وابستہ انسان کی کیفیت کا مظہر نہیں ہے بلکہ یہ جملہ نسل انسانی

کی صورت حال ہے یا یوں کہا جائے کہ یہ انسان کی ازلی وابدی صورت حال ہے جس کے ساتھ یہ زمانۂ ازل سے نبرد آزما ہے۔نظم کے اندر جو تاریخی واقعات یا کردار پیدا کئے گئے ہیں وہ سارے تاریخ انسانی کے الم ناک داستان کے ترتیب وار ابواب ہیں:

لرِ کأنٔز مے ییٚلہِ پھٔٹ مأنتھٕر پھرٕ بکہٕ وٕنی امبرٕی گٔج
یوٚنچ لِوَن وَژھم دوٕدِ ہیڈرس
رأمس رِکھ مأنڈم سیتاییہِ
ایڈٕپسس پیوٚم انہِ گٹہِ کوٚران
کوٚران۔۔۔۔۔کوٚرِتھ
أخر پننۓ دٔسل خنٛجر
پنٕنی أچھ رتہٕ۔۔۔۔شہلاوان
حأفظ ٕسند ہٹہِ یٔزیدٕ ٕسنٛز کربلھ بوزَن والیا!
میوٚن فُرٕیاد بوٚز
نظم کے آخر پر شاعر جملہ انسانی صورت حال کو کچھ اس طرح سے تعبیر کرتا ہے
کنہ پیٹھ چھُس یتھ ژلہ ونہ سیکہ پیٹھ
کُن زون پوٚتجن ٹینکہ ٹُلان

''سیاہ رود جرین منز'' نامی کتاب میں شامل رحمان راہؔی کی شاعری کا تیسرا دور جدیدیت کے رجحان سے ہٹ کر نئے سفر کا عندیہ دیتا ہے۔اگرچہ رحمان راہؔی کی پہلے دور شاعری میں بھی باطنی اضطراب اور کرب کا احساس جھلکتا ہے مگر اس کے تیسرے دور کی شاعری میں یہ واضح اشارے ملتے ہیں کہ رحمان راہؔی محض خارجی حقائق کے ساتھ مصروف اور الجھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ وہ باطنی سفر میں بھی سرگرداں

دکھائے دے رہے ہیں۔شاعر کے اندر ظاہری حوادث کے ساتھ ساتھ باطنی طلاطم برپا ہوتا ہے۔اس قبیل کی نظموں میں ''خراج'' قابل ذکر ہے۔اس دور کی شاعری کا سب سے مہکتا گلاب جو مذکورہ کتاب میں شامل ہے وہ بعنوان نعتیہ نظم ''نعت نبیؐ'' ہے۔نظم کا موضوع پابند ہے جس کا بہرحال شاعر کو تابع رہنا ہے البتہ جو برتاؤ اور اہتمام شاعر اس تجربے کو بخشتا ہے وہ کشمیری نعتیہ شاعری میں بالکل نرالا اور تازہ دم ہے۔یہ اسلوب واظہار صرف رحمان راہیؔ کی دین ہے جو کشمیری نعتیہ ادب میں ایک نئے اظہار وبیان کا آغاز ہے۔موصوف جس تخلیقی قوت اور بالیدگی کے ساتھ الفاظ، تراکیب،تشبیہات اور استعارات کا برمحل وبروقت استعمال اور برتاو اس نعتیہ کلام کے اندر کرتا ہے اُس سے موضوع کا جلال ٹپکتا ہے اور جمال چھلکتا ہے۔

بہٕ اوُسس آمہِ تاوِ ے، آمہٕ تاوے، آمہٕ تاوِ ے یوت
سُہ نا کُنہ کونٛدِ منٛز کانٛہہ بانہٕ اوٗ ڈے اوٕمے
تہٕ اُتھی منٛز اندرِ کتھ تاں آمہٕ تاوَس
بے توقع بے خبر پأٹھن
عجب ژٕتہمبر اہش زایم
یہ نیلیوٗ مُت ِشٹھیوٗ مُت پَل
سوٗمژ تہمبر نژن نازل
پلس وۆتھ دِہ،دِہس وٕژھ رنگ،رنگوتٕچ ریہہ،رہوٗژ ھٹ
برہہ تہٕ پل پھوٚٹ
نداگو و:یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

''سیاہ رود جرین منز'' میں شامل رحمان راہی کی غزل کشمیری شاعری میں نیا لہجہ اور آہنگ لے کر آیا۔راہیؔ کی غزل گوئی میں خیال اور ہیئت کا تخلیقی سنگم ہے جو کلھم

انسانی صورت حال کا فکر انگیز اور انقلابی اظہار و بیان ہے:

ہِندر کھڑ کھ تہٕ دَزان سیمنٛن چھِ حبشی دَچھ
ہُشار گے تہٕ شہلی سرِ کوترن چھِ سنان

☆

اگر یہِ میوٚن صدا گُنبدن تہٕ ژٕ دِتھ چھَو
یہِ انتظار نہ محشر نہ کربلا باسی

☆

ترٛٹھ وَژھ تہٕ دوٚدٕر وپر سروپا انأری گوو
اَتھ ہوٚر سونتھ کالہٕ کراماتھ کری زِ کیٛاہ

☆

سُہ خوف أرٕ کٕرِتھ زہو پھرٛ کان ضٔمیرس منٛز
نجاتھ زون متھو تاں صبر تہٕ خاموشی

☆☆☆

......ڈاکٹر آفاق عزیز

رحمٰن راہی کی تنقیدی بصیرت

پروفیسر رحمٰن راہی کی گوناں گوں ادبی صلاحیتوں کا احاطہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، راہی صاحب ادبیات کشمیر کے اُن نمائندہ نقادوں میں خاص مقام رکھتے ہیں، جنہیں تخیّلِ شعر، شعریت اور شعر شناسی کا زبردست ادراک ہیں ۔ جہاں تک راہی صاحب کے تنقیدی شعور کا تعلق ہے، وہ تنقیدی اصولوں سے مکمل آشنائی رکھتے تھے اور ساتھ ہی اطلاقی تنقید کو بروئے کار لانے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ جس کا عندیہ ان کے بیشتر تنقیدی مضامین میں ملتا ہے۔ کسی بھی متن پر گفتگو کرتے وقت راہی صاحب کے ذہن میں ہمہ وقت کئی پہلو سامنے رہتے تھے جن کے متعلق وہ اپنے ایک خاص نظریئے سے بات کرنے کے قائل تھے۔ جب بھی شعر کی گرہیں کھولنے کی بات ہوتی تو وہ سب سے پہلے شعر کے تخیلی نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے تشبیہ، استعارہ، پیکر وغیرہ جیسے پہلوؤں پر زور دیتے، اُنہیں تنقیدی نکتہ نگاہ سے پرکھتے اور خاص اسلوب میں اپنا موقف پیش کرتے۔ یہاں تک تخلیق کار خود حیرت میں پڑ جاتا کہ راہی صاحب نے میرے مافی الضمیر کی کس طرح عکاسی کی ہے۔ کبھی کبھار راہی صاحب تخلیق کار سے ایک قدم آگے بڑھ کر قاری کے لئے ایک نئی دنیا آباد کرتے نظر آتے تھے۔ ساتھ ہی راہی صاحب کی یہ خوبی ہے کہ وہ ذات سے بالاتر ہو صرف ادبی متون کو ہی ہدف تنقید بناتے ہوئے نہایت ہی سادہ اسلوب میں اپنا مافی الضمیر پیش کرتے

تھے۔راہی صاحب ادبی متون پر بحث کرتے ہوئے پہلے سوالات قائم کرتے اور پھر اپنے قائم کردہ سوالات کے تسلی بخش جوابات ڈھونڈنے کی سعی کرتے تھے،جس میں وہ کماحقہ سرخرو بھی ہوتے تھے۔

راہی صاحب شعری متون پر قلم اُٹھاتے وقت یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے اور بڑا شاعر کون ہوسکتا ہے اور اُس کی صفات کیا ہیں۔

پروفیسر رحمٰن راہی نے آج سے ٹھیک بھسٹھ برس پہلے ''تنقید:معنی اور مقصد'' عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں تنقید کے ابتدائی نقوش اوراس کے ارتقا پر عمدہ بحث کی ہے۔تنقید کے معنی ومفہوم پر راہی صاحب یوں رقمطراز ہیں:

''تنقید کا لغوی معنی ہے تجزیہ کرنا یا کوئی چیز پرکھنا۔اس کے اصطلاحی معنی پر سبھی یکساں رائے کے قائل نہیں ہیں۔مختلف آرا کے متعلق سوچنے سے عیاں ہے کہ ''تنقید کا اصلی کام کیا ہے''۔جیسے سوال کا جواب دیتے وقت اختلاف سر اُٹھاتا ہے[۱]......''

مندرجہ بالا اقتباس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ''تنقید'' کے اصطلاحی معنوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے لیکن اس کا مفہوم مختلف ادوار سے ہوتے ہوئے بدلتا گیا ہے۔ابتدائی دور میں تنقید ناصحانہ ہوا کرتی تھی۔یہ سلسلہ کافی مدت تک جاری رہا۔

راہی صاحب اس نوعیت کی تنقیدی کمزوریوں سے پوری طرح باخبر تھے۔اُنہیں معلوم تھا کہ ناصحانہ تنقیدی نظریئے کو اپنانے سے ادبی متون میں کچھ خاص کہنے کی کم گنجائش رہتی ہے۔یہ روش کہ ادب تخلیق کرنا ایک ہُنر ہے جو دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر حاصل کیا جاسکتا ہے۔راہی کے بقول ایک انتہائی کمزور سوچ کی عکاسی ہے۔وہ ایسے نقادوں کا دھیان اس بات کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ ادب تخلیق کرنے کی صلاحیت پُراسرار منبع سے جڑی ہوئی ہے۔اس نوعیت کہ صلاحیت[۲] کو زبان پر لانے ،لفظوں کے سانچے میں ڈھالنے اور صفحۂ قرطاس کی زینت بننے تک

بے شمار کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جو عقل و دانش سے کوسوں دور ہے۔ اگر راہیؔ کے بقول اس فطری صلاحیت کو بھی سازگار ماحول اور مُناسب حالات بہم نہ ہوں تو اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ اگرچہ بعض اوقات راہیؔ صاحب اپنا موقف پیش کرتے ہوئے خود تضاد کے شکار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

''ہدایت ناموں کے ذریعہ (یا پیر و طالب کے رشتے میں بندھنے کے بعد) کسی فرد میں یہ صلاحیت؟ پیدا کرنا نہ صرف مُشکل ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ ۵''

بے شک ہدایت ناموں کے مطابق ادب خاص کر شاعری تخلیق کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن صوفی ادب خاص کر شاعری کو راہِ ہدایت کا ذریعہ تسلیم کرنا صحیح ہے، کا جواب ہر حال میں نفی ہی ہو سکتا ہے۔ مگر صوفی فکر و خیال پر مبنی ادبی تخیّل عمل کا نتیجہ قرار دینا صوفی علوم سے زیادتی ہی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس نظریئے سے مزید خدشات بھی جنم لیں گے کہ شاید نقاد صوفی تجربات یا علوم سے ناواقف ہے۔ کیونکہ ایک صوفی اپنے روحانی سفر کے دوران جن مشکلات، تجربات، اور مشاہدات سے گزرتا ہے، وہ وہیں تجربات صفحہ قرطاس پر لانے کی کوشش کرتا ہے جو کسی پُراسرار منبع سے منسلک ہوں اور جس کا برملا اظہار راہیؔ صاحب نے از خود کیا ہے۔ ۶ قیاساً عرض ہے کہ شاید اسی نظریہ کو مرزا اسداللہ خان غالب نے یوں شعری شانچے میں پیش کیا ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب سریرِ خامہ نوائے سروش میں

راہیؔ صاحب اس خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر کشمیری صوفی شاعری کا مطالعہ ذرا غور و گہرائی سے کیا جائے تو یہ نکتہ واضح ہوگا کہ کشمیر کے اہم صوفی شعراء بالواسطہ زبان استعمال کرتے آئے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ اپنا سری تجربہ غیری سری وسائل کی مدد سے سامنے لاتے ہیں۔ یا بہ الفاظ دیگر یہ

کہ باطنی مشکلات، تکالیف اور کٹھن مراحل طے کرنے کے بعد جن تجربات اور مُشاہدات سے شاعر کا سابقہ پڑتا ہے وہ بہر حال استعاری، تمثیلی، تلمیحی اور علامتی روپ دھار لیتے ہیں ''۔[۷]

اس قسم کی تنقیدی مثالیں راہی صاحب کے بیشتر مضامین میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ حضرت شیخ العالمؒ پر لکھے گئے ایک مضمون میں مذکورہ آراء یوں صفحہ قرطاس کی زینت بنتی ہے:

''............شیخ بُنیادی طور پر ایک ریشی رہے ہیں جن کے یہاں کبھی کبھی ایک متصوف (Mystic) کے تجربات بھی ملتے ہیں اور نتیجتاً ان کے تجربات کی مجموعی فضا غیر معمولی ہوتی ہے وہ عام شعراء کی طرح نہ تو انسانی عشق ومحبت یا نفرت وانتقام کے موضوعات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں اور نہ ہمارے آپ کے جیسے معمولی کے تجربات کو شعر کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضرت شیخ خود کو دوسروں کے سامنے جواب دہ نہیں پاتے ہیں بلکہ اپنی ذات کو خالقِ کائنات کے روبرو پاتے ہیں۔ اس غیر معمولی فضا کا اندازہ کرنا ہو تو خود شیخ کے الفاظ میرے ان اشعار کے لئے گہری اور پُرشوق سوچ چاہیئے (یِمن پدن مۆ وېژار گوٚ ژُھے) کی روشنی میں ان کے اشعار پر توجہ ہونی چاہیئے[۸] ....''

مُستند ہے کہ شاعری میں سب سے اہم اور کلیدی اشارہ ''استعارہ'' ہے جو ادب میں ریڑھ کی حیثیت رکھتا ہے، کے متعلق راہی صاحب نے بعض مضامین میں بار بار ثابت کیا ہے کہ علامتی اور استعاری اسلوب میں کہی گئی بات تنقیدی اصولوں کے مطابق ''فنی بالیدگی کی دلیل'' ہوتی ہے۔ نامور کشمیر صوفی شاعر وہاب کھار کی وژن نما نظم ''زونہ پچھی سالِ ڈل جان'' کا جائزہ لیتے ہوئے راہی صاحب یوں رقمطراز ہیں؛

چھےٚ ہرنن سورمَے اَ چھی زونہ پچھی سالِ ڈل جان
سونتہٕ رٔتے زیٹھنہٕ پچھی زونہ پچھی سالِ ڈل جان

لکھتے ہیں کہ سرسری طور دیکھا جائے تو ان ابتدائی مصرعوں میں صرف اور صرف ایک مجازی احساس، کیفیت اور جذبہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔لیکن غور وفکر کرنے کے بعد شعر کی پرواز بلندیاں چھونے لگتی ہیں۔جس کا اعتراف راہیؔ جیسا نقادان الفاظ میں کرتا ہے:

''مگر وہاب صأبنہِ بأتُک دوٚیمے بند تہٕ تمہِ پتہٕ ینہٕ وأل سأری بند چھِ کُنہِ گچھِ گانگلہِ ورأے ظوٗن پاوان زِ وہاب صأب چھُ ورگہٕ باوژہُند شاعر: رہ چأ کس تالہِ پیٹھ أچھی/ راتہِ موٗغلٕی وٕنی کاوس شیچھی/ اکھ تُلر بیا کھ چھےٚ مچھی/ سخی بأ گران، بخیل بوٚ چھی/ جبر یلن وٕنی نبیس شیچھی وغأرِ وغأرِ۔سورُے بأ تھ چھُ یہ یہِ ڈٕلِ زِ تہِ، أچھوتہٕ کھور بوٗثینہٕ وٕنی دِوان زِ ماملہٕ نہ چھُ نسیمہ نشاط پھیرن والین مجازی مجنونن ہُند تہٕ نہ ڈل شِکارِ بہتھ حُسنِ قو درتس مون تُلن والین عام سأیلہِ متین ہُند[9]''۔

راہیؔ صاب نے جہاں صوفی شاعری میں اسرار و موز کھنگالے ہیں وہیں اُنہوں نے مجازی شعراء کی تخلیقات کو بھی کھنگالا ہے۔ انسانی محبت سے جُڑے جذبات ، واردات اور فراق کی روداد سے بھرے مجازی موضوعات پر راہیؔ صاحب نے سنجیدہ قلم آزمائی کی ہے اور بلاخوف وخطر اپنی ناقدانہ رائے صفحۂ قرطاس کے حوالے کی ہے۔ چند مثالیں قارئین کی دلچسپی کے پیش خدمت ہیں:

''کُجاسہ جسمأنی صورت حال زِ'' گچھِ کُٹھِ اَچھِ دأ رروزے پأ رأ وِتھ'' یا ''زِ آلہِ وس تہٕ لرِ پان ساوس'' تہٕ کُجا آبس اندر پمپوش لأگِتھ درشنس پرارُنک شعور۔یِی گو جذبس تخلیکُک پرتوپنُک سلسلہ شروع سپدُن[10]............''۔

کشمیری ادب کو پرکھنے میں راہی صاحب نے زبردست اہمیت کا کام انجام دیا ہے۔جس کا جائزہ مستقبل میں ضرور لیا جائیگا۔جب موصوف کسی شعری متن کو موضوع بناتے ہیں تو بڑے آسان لفظوں میں اس کی فنی خوبیوں پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں،

جس سے قاری بڑی حد تک محظوظ ہوتا ہے۔

اسی نوعیت کے ایک مضمون ''کن مےٚ دژام'' جو بنیادی طور احمد بٹواری کی غزل نمائَتھ کا ایک بند ہے، کے متعلق راہی صاحب نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ موصوف کے اس مضمون سے ایک شعر کا تنقیدی جائزہ بطور مثال پیش خدمت ہے جس سے قارئین راہیؔ صاحب کی تنقیدی بصیرت سے واقف ہوں گے: شعر یوں ہے ؎

یہِ شمع لاطمع رٲتی راتس چھےٚ پرِ بزٕ لانو
شب دراوتہٕ آو صبا، گاش گاشش نِش مند چھانو

اس شعر کی تنقیدی فضا قائم کرتے ہوئے راہیؔ صاحب قارئین کو یوں معطر کرتے ہیں:

''سیٚد سیوٚد چھُ اکھ منظر بزٕ وٕنہہ کُن یوان۔ اکھ گہہ ژھٹہٕ وُن شمع چھُ دزان تہٕ راتی راتس پریزلان۔ سوال چھُ کیازِ؟ پونزٕ ن، أہنٛدِ دزنہٕ پھوٚ روُشنان تہٕ پکھٕ دزان، مگر شمع گوٕ موکھٕ دزان؟ أمِس کُس لاچٕ؟ ذٕ پوٚکہیں نہٕ ......یہِ چھُ لاطمع۔ پانہٕ دزان تہٕ اوٚ ند پوٚک گاشراوان۔ انجام صبح سپُد، آفتابُک پرتو پیوٚ وتہٕ گاش گاشش نِش مند چھانو!۔ شعرک مرکز چھُ شمع، یعنے اکھ ژینہٕ وَن، اکھ علامت اکہِ واچٕ۔ اتھ علامژ واتن چھےٚ بوزن پرن وأٲلس پنٕنی کاٚم تہٕ پنُن توفیق۔ ونہٕ باپت زن وٕنہ بہٕ زِ شمع گو دوستِ خدائےیُس دوزخن بَے تہٕ جنتُک طمع، سورُے منسأوِتھ ہیرِ بوٕنہٕ محض یادِ خدا بنان چھُ تہٕ یُس امی یادٕ چی برکژ پانہٕ اکھ گاشہِ آگُر بٕنِتھ پنُن اوند پوٚکھ پرِ بزٕ لاوان چھُ، مگر یس تہِ گٲرتھ تہِ پنٕنہِ ہژرُک حبس زندٕ آسان چھُ تہٕ یہِ احساس تہِ آسان چھُ زِ تس گٲستھ تہِ چھُ اکھ وجود: شمعس بُتھِ آفتابہٕ! مێون یہِ یہِ تاویل زن آسہِ صحیح تہٕ توتہِ گونہٕ مطلب زِ شعرس چھُ یتےٚ معنہِ۔ ممکن چھُ سوٚ درٕ پتھ یتھ چیزس مےٚ خأٲلی اکھ پوٕ تج زٲنِتھ کھوٚنت کوٚڈ سوٚ آسہِ مولُل لعل تہٕ لعل شناخس نِش واتہس قدر پزٕنہٕ پأٹھی[۱۱]''

اس تنقیدی رائے سے یہ بات صاف طور جھلکتی ہے کہ کسی بھی ادب پارہ پر نقادوں کی الگ الگ رائے ہوسکتی ہے۔ جس کا دارومدار ان کی علمی بصیرت، تجربات اور مُشاہدات پر منحصر ہے۔ ٹی ایس ایلیّٹ کے بقول ''تنقید ہماری زندگی کے لئے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی سانس''۔ اگر نقاد کی تنقیدی سانس لینے میں کسی قسم کا نقص ہے تو ادب پارے کی چھان پھٹک پر اس کا منفی اثر صاف نظر آئے گا۔

یہاں بھی راہیؔ صاحب خاموش نہیں رہے بلکہ بہ آوازِ بلند کہہ دیتے ہیں کہ اگر پنکھڑی کی پرچھائیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے صرف پھولوں کی خوشبو ہی میسر ہو، وہ بھی دل و دماغ کو معطر اور تروتازہ کرتی ہے بلکہ طراوت بخش ثابت ہوتی ہے۔ بے شک تنقید شناس جانتے ہیں کہ نقاد اپنی بساط بھر کوشش سے ادبی متون کے مافی الضمیر تک پہنچنے کی تگ ودو ضرور کرتے ہیں لیکن وہ خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں منزل ملتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ نقاد کی ذمہ داری ہے اور فرض بھی کہ وہ ادب پارے کو اپنی قابلیت اور توفیق کے مطابق سمجھے، پرکھے اور حسن و قبح کی طرف اشارہ کرے تاکہ قاری کو متن کے اسرار و رموز سمجھنے میں آسانی ہوجائیے۔

تنقید کئی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ جہاں تک راہیؔ صاحب کی تنقیدی بصیرت کا تعلق ہے وہ ادب پارے کو کئی زاویوں سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کی صدائے بازگشت ان کے بیشتر تنقیدی مضامین میں سُنائی دیتی ہے۔ نفسیاتی، عمرانی، رومانی، جمالیاتی اور مارکسی تنقید کی پرچھائیں بھی ان کے مضامین میں ملتی ہیں۔ تاہم تقابلی تنقید پر اُنہیں زبردست دسترس حاصل ہے۔ جس کا ثبوت ان کے مضامین کے ساتھ ساتھ ''کہوٹ'' نامی کتاب سے بخوبی ملتا ہے۔ بلاشبہ راہیؔ کے تقابلی تنقید پر بات کرنے کے لئے الگ سے ایک مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

۱۔ پروفیسر رحمٰن راہیؔ، ۱۹۷۹ء ''کہوٹ''، سرینگر ص، ۲۹۔

۲۔ ہدایتی نظریہ کا یہ قلم کار اس دُنیا میں نہیں ہے۔ اللہ مغفرت کرے۔

۳۔ ادب تخلیق کرنے کی ہُنر یا کسب کی طرف اشارہ۔

۴۔ پروفیسر رحمٰن راہیؔ، ۱۹۷۹ء ''کہوٹ'' سرینگر، ص، ۳۰۔

۵۔ پروفیسر رحمٰن راہیؔ، ۱۹۷۹ء، ''کہوٹ''، سرینگر، ص، ۲۷۔۴۰۔

۶۔ رحمٰن راہیؔ، ''زونہ پچھی سائِل ڈل جان''، ''آلوٗ'' ۱۹۹۸ء، جلد۔۲، شمارہ۴، نظامت اطلاعات، حکومت جموں وکشمیر، ص، ۸، ۹۔

۷۔ پروفیسر جی۔ این۔ خاکی/ ڈاکٹر آفاق عزیز، ۲۰۲۱ء، حضرت شیخ العالمؒ (مشاہیر ادب کے تخلیقی مضامین کا مجموعہ)، جلداول، سنٹر فار شیخ العالم اسٹیڈیز، کشمیر یونیورسٹی، ص، ۱۶۵۔

۸۔ رحمٰن راہیؔ، ''زونہ پچھی سائِل ڈل جان''، ''آلوٗ'' ۱۹۹۸ء، جلد۔۲۰، شمارہ۴، نظامت اطلاعات، حکومت جموں وکشمیر، ص، ۸۔

۹۔ رحمٰن راہیؔ ''مہجورنہِ شاعری منز تغزل''، ''انہار''، جلد۔۱۱، شمارہ۱۴، ۱۹۸۸ء شعبہ کشمیر۔ کشمیر یونیورسٹی، ص، ۱۳۱۔

۱۱۔ رحمٰن راہیؔ، ''کن مےٚ دِژام''، ''انہار''، جلد۔۱۶، ۱۰۱۶، کأشُر شعبہ، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر، ص ۱۹-۲۰۔

☆☆☆

......ڈاکٹر شفقت الطاف

کشمیری سے ترجمہ ......ارشد حسین

''کھوٹ'' کشمیری تنقید کا منفرد کارنامہ

''کھوٹ'' پروفیسر رحمان راہیؔ کا کشمیری زبان میں لکھے گئے تنقیدی مقالوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ہماری ادبی تنقیدی تاریخ کی وہ پہلی کتاب ہے جس میں ادب کی اہمیت، ندرت اور بیان پر غور و فکر کرنے کے علاوہ قدیم اور معاصر کشمیری شاعری کے فنی وموضوعاتی معاملات کا جائزہ لے کر عظیم شاعری کے محاسن اور معائب پر بحث و تمحیص کا نہایت سنجیدگی کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کشمیری زبان کے تنقیدی ادب کے ارتقائی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر رحمان راہیؔ نے اپنے ان مضامین میں بڑی حد تک غیر جانب داری سے کام لے کر اپنا موقف قاری کے سامنے پیش کرنے کی سنجیدہ اور کامیاب کوشش کی ہے۔ ''کھوٹ'' کے منظر عام پر آتے ہی پروفیسر شفیع شوق نے بھی ''زبان تہ ادب'' اور غلام نبی ناظرؔ نے ''کتاب'' شائع کیں۔ جبکہ شفیع شوقؔ صاحب نے بہت پہلے شیخ العالم اور لل دید کی شاعری پر تنقیدی مقالے رقم کئے تھے جس کے جواب میں پروفیسر رحمان راہیؔ اور محمد یوسف ٹینگ کو بھی ان دو اہم شاعروں کے فنی کمال پر مضامین لکھنے پڑے۔[۱]

بہرکیف کشمیری شاعری پر تنقیدی مقالوں کا مجموعہ جو قارئین کے پاس سب سے پہلے پہنچا وہ ''کھوٹ'' ہے۔ اس طرح سے ''کھوٹ'' ہمارے تنقیدی ادب کے مراتب

(Hierarchy) میں اولین کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔اس تنقیدی کتاب کی اہمیت کا اندازہ شفیع شوقؔ صاحب کے اس اقتباس سے خوب لگایا جا سکتا ہے:

''جب رحمان راہی نے قدیم اور معاصر کشمیری شاعری سے متعلق اپنے مختلف مضامین کا مجموعہ ''کہوٹ'' نامی کتاب شائع کر دی تو کشمیری تنقیدی ادب کو صحیح سمت مل گئی۔''۲

تنقیدی ادب سے متعلق ''کہوٹ'' کا نام لے کر میرا ہرگز یہ مدعا نہیں ہے کہ ان تمام تنقیدی کتب اور مقالوں کی اہمیت و افادیت پر کسی صورت میں انگشت نمائی کی جائے جو عبدالاحد آزاد سے لے کر آج تک کشمیری تنقیدی ادب کو پھلنے پھولنے اور پروان چڑھانے کا سبب بنے ہیں۔تنقیدی ادب کے حوالے سے جو بھی کشمیری زبان میں لکھا گیا ہے بلاشبہ وہ سارا مواد بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پہلے پہل جو بھی تنقید کے نام پر کشمیری میں شائع کیا گیا اس کا متعد بہ حصہ جانبدارانہ، یک طرفہ اور اشاراتی تھا۔۳ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر ایک چیز اپنے ابتدائی اور نو آموزی کے زمانہ کے دوران ناہموار اور ناہنجار مراحل سے گزر کر ارتقا اور حُسن کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔

''کہوٹ'' تنقیدی مضامین پر مشتمل ہماری پہلی کتاب ہے جس نے کشمیری زبان کے تنقیدی تحقیق کو ابتدائی پڑاؤ سے آگے نکال کر ایسی سمت بخشی جہاں آج پروفیسر شاد رمضان یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ''کشمیری ادب کی تحقیق اور تنقید اپنی ابتدائی منزل طے کر کے ایک سنجیدہ اور خوش رفتار ارتقا سے پروان چڑھ رہی ہے۔۴

کشمیری تنقیدی مقالوں کا مجموعہ ''کہوٹ'' چودہ مضامین پر مشتمل ہے جو 1979ء میں شائع کیا گیا ہے۔ رحمان راہی نے یہ مضامین 1961ء سے لے کر 1978ء کے دوران لکھے ہیں۔ یہ مضامین زبان تہ باوتھ، ادبک مقصد، تنقید۔امیک

معنہ تہ مقصد، شارُت تہ تمکی ترکیبی اجزا، قدیم کأ شرشاعری لل دیدتہ شیخ العالم۔۔اکھ سرسری مطالعہ، شیخ العالم سنز شاعرانہ حیثیت، ششِ رنگ، کاشرشاعری، جدید کاشر شاعری وا تناورک مسلہ، ہمکال شاعری منز ردقبولک عمل، جدیدیت کینہہ وتچھِ پوچھِ کتھ تہ موجود سماجی گرتس منز تخلیقی ادیبہ سُند رول نامی عناوین کے تحت رقم کرکے کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔زیر بحث کتاب میں درج مقالوں پر کوئی بات کرنے سے قبل میں کشمیری تنقیدی ادب میں پائے جانے والے نقائص اور خامیوں پر رائے ظاہر کرنا لازمی گردانتا ہوں۔جس کا مطلب یہ ہے کہ تخلیقی اور تنقیدی ادب کے درمیان ایک واضح فرق یہ ہے کہ جہاں تخلیقی ادب زندگی اور اسے منسلک مختلف اجزا کے جائزے کا نام ہے وہیں تنقیدی ادب، تخلیقی ادب کو معیار قائم کرنے اور مہمیز بخشنے کا کام کرتا ہے۔ کچھ اہل ادب کا کہنا ہے کہ تنقید اصل میں تخلیق در تخلیق کے عمل کا نام ہے اور تنقید تخلیق کے اندر سرایت کرکے معنی کے اندر معنی تلاش کرنے کا کام کرتا ہے۔ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ دراصل تنقید تخلیق کا نام اور تخلیق تنقید کا۔شاید وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اصل میں تنقید، ادبی متون کا ثانوی ماخذ ہے جسے یہ منفی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ نقاد قاری کو تخلیق کی اصلیت سے پرے لے جاتا ہے۔مشاہدے میں آیا ہے کہ بسا اوقات ایک زیرک اور ماہر عالم ونقاد کسی تخلیقی ادب پارے کے تنقیدی جائزے کے دوران قاری کے ذہن کو اس حد تک گرفت میں لے کر اس پر حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ نقاد کی مضبوط دلیل کے سامنے مترجم کی صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔ولیم ہنری ہڈسن Willam Henary Hudson اس بات کی وکالت کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"If he is a really great critic that is,
if he is a man of exceptional learning,
grasp and vigour of personality he is

really to impose himself upon us. He dominates our thought to such an extent that we take his verdict as final."

پروفیسر رحمان راہیؔ اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر کسی بھی تنقیدی نقطہ کو سامنے لاتے وقت اسے ایک مضبوط اور پُرکشش دلیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور قاری کو اس کے ساتھ اتفاق کرنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین پڑھنے کے بعد یہ احساس ابھرتا ہے کہ راہی صاحب نے تقابلی مطالعہ کی روش اپنا کر قاری کے لئے ایک راستہ ہموار کیا ہے۔ حالانکہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ قاری کے پاس مطالعہ کی وسعت نظر اور ذہنی استعداد تخلیق کار یا نقاد سے بڑھ کر ہو جسے وہ ادبی فن پارے میں پوشیدہ اور پنہاں ایسے گوشوں کی نشاندہی کر سکتا ہے جہاں خالق و نقاد کی رسائی نہیں ہو۔ ایک دفعہ معروف امریکی پروفیسر سے اپنے ایک شاگرد نے پوچھا کہ Timon Athens پر بہتر اور موزون کتاب کونسی لکھی گئی ہے۔ شاگرد یہ سوچ رہا تھا کہ استاد مذکورہ کتاب پر لکھے گئے کئی مستند تنقیدی کتابوں کا نام لیں گے کیونکہ شاگرد کو Timon of Athens پر ایک تنقیدی مقالہ لکھنا مقصود تھا۔ پروفیسر کا جواب سن کر پہلے پہل اُس شاگرد کو حیرانی ہوئی مگر ساتھ ہی اس کے ذہن میں یہ بات بھی آ گئی کہ ہر کتاب اپنی خوبیاں و خامیاں بذات خود بیان کرتی ہے لیکن یہ اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ قاری کتنا صاحب نظر، حساس و زیرک اور وسعت و ظرف کا حامل ہے۔

رحمان راہی کے ادب پاروں پر جتنی بھی تنقیدی مواد لکھا جائے لیکن اسے بہر کیف کسی بھی صورت میں ''سیاہ رود جر بن منز'' نامی کتاب سے برتری حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ رحمان راہی کا متن (Text) ہی اس پر سب سے بڑی تنقید ہے۔ یہ تنقیدی ادب کی چند خامیاں ہیں تاہم تنقیدی ادب ہی وہ ایک واحد وسیلہ ہے جو کسی متن و نفسِ

مضمون کے پڑھنے اوراس کے موضوع و بیان کی اصل تک رسائی حاصل کرنے میں رہنمائی کرتا ہے۔جس کتاب اورادب پارے پر جتنا زیادہ تنقیدی موادلکھا گیا ہوا تنا ہی اسے متعلق قاری کی سوچ میں وسعت اورنکھار آ سکتا ہے۔مثال کے طور پر امین کامل نے ''شش رنگ'' نظم پرایک دلچسپ تنقیدی مضمون لکھ کراس میں یہ نقطہ اُبھارا کہ:

'' اس نظم کا لطیف اور جنسی لہجہ اس کے روحانی تجربے کے اندر بوجھل پن پیدا کرتاہے''۔۶؎

''شش رنگ'' نظم کے تجزیاتی مطالعہ کے بعد امین کامل کو ایسا لگتا ہے کہ اس کا لطیف اور حسین لہجہ اس کے روحانی مزاج کو بوجھل کر دیتا ہے مگر رحمان راہی اپنی کتاب ''کہوٹ'' میں امین کامل کی رائے کے ساتھ برملا اختلاف کر کے اپنی رائے اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس اندیشہ کا اظہار کرنا بالکل مشکل ہے کہ امین کامل صاحب کو ایک ہی آن میں جنس اور معرفت دونوں کے ساتھ برابری اور اتفاق ہو کیونکہ صوفیانہ شاعری کے تجزیہ وتبصرہ نگار کو لازمی طوراس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ جنس اپنے روزاوّل سے ہی معرفت کے بیان کا نہ صرف اہم بلکہ چندصورتوں میں بنیادی وسیلہ رہا ہے مثلاً شکتی اورنر،شاہداور مشہود،لیڈااورراز ہونز،ایڈیپس اور جوکسٹلا''۔۷؎

ایک ہی نظم کے متعلق دونقادوں کے متضاد ومختلف نقطہ ہائے نظر پر شفیع شوق کا کہنا ہے کہ:

''کسی ادب پارے سے متعلق مختلف ومتضاد رائے پڑھ کر قاری کے اندرادب سمجھنے پرکھنے کی اہلیت بڑھ جاتی ہےاوروہ اس ادب پارے کے متعلق اپنی ایک رائے قائم کرسکتا ہے۔یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ضروری نہیں ہے کہ تنقید کسی نظم یا ادب پارے سے متعلق قاری کے اندر پائے جانے والے سوالات کا جواب ہوگا۔''۸؎

کسی ادب پارے پر کی گئی تنقید کا تنقید کرنا ایک موثر اور فعال طریقہ ہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جس ادب پارے پر جتنی زیادہ مختلف ومتضاد آرا سامنے آتی ہیں اتنا ہی جلد قاری اس کے رموز واسرار اور کوائف سے آشنا ہو کر اس کے متعلق اپنی انفرادی رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں آجاتا ہے۔کوئی بھی تنقید حتمی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے اندر ہمیشہ وسعت اور توسیع کی گنجائش موجود رہتی ہے اور ایسی تنقید قاری کے ادبی ذوق وشوق کی نشو ونما اور رہنمائی کے لئے ضروری ہے۔تنقید کی اسی اہمیت اور مقام کو زیر نظر رکھ کر ''کھوٹ'' کے اندر ماضی سے لے کر آج تک کشمیری شاعری کی تمام روایتوں کو اس انداز سے کھنگالا گیا ہے کہ کشمیری شاعری اور اس زبان کے شعراء سے متعلق ہماری عقیدت متزلزل ہوجاتی ہے۔اس اقتباس پر ایک نظر دوڑائیں :

''چودھویں صدی کے نصف آخر میں رہنے والی مجذوب عارفہ لل دید کشمیری زبان کی اہم شاعرہ تسلیم کی جاتی ہے۔اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ جو کلام لل دید سے منسوب کیا جاتا ہے وہ موجودہ ناہموار شکل و صورت میں بہت ہی مشکوک لگتا ہے۔چند واکھوں کی زبان حسب توقع بہت ہی قدیم اور سنسکرت آمیز ہے مگر باقی ماندہ 'واکھوں' کی زبان آج کی موجودہ ورائج زبان سے ملتی جلتی ہے۔۹

تحریری دستاویز کی عدم موجودگی کے نتیجے میں ہماری قدیم شاعری سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر ہمارے پاس پہنچی ہے۔زبانی روایتوں کی وساطت سے پہنچے ہوئے یہ قدیم تخلیقی متون بہت حد تک مشکوک، غیر معتبر وغیر مستند لگ رہے ہیں۔اسی غلط بیانی کی وجہ سے حبہ خاتون اور اَرنہ مال کے گیت مختلف شعراء کے ساتھ منسوب کئے گئے ہیں۔ پروفیسر رحمٰن راہی اس حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

''ایسا بھی ہوا ہے کہ مرزا عارف حبہ خاتون سے منسوب ایک مشہور گیت'' مالینو

ہو' کے تخلیق کاری کا سہرا کسی کبیر کے سر باندھنا چاہتا ہے۔ایسے بہت سے گیت ہیں جن کے متعلق کئی حضرات یہ رائے رکھتے ہیں کہ اصل میں یہ گیت حبہ خاتون اور نہ ہی اَرنہ مال کے ہیں بلکہ وہ لوک ادب کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔''۱۰

رحمان راہی نے جو خدشات ہمارے قدیم ادب کے بارے میں بیان کئے ہیں اس کے مطابق تمام شاعری کو موجودہ دور کے جدید تقاضوں اور اصولوں کی بنیاد پر ازسرنو پرکھنا ہوگا۔علی الخصوص لل دید اور اسے ماقبل زمانہ کی جان کاری حاصل کرنے کے لئے ہمیں ایسے محققین اور عالموں کی معانت اور مدد درکار ہوگی جو شاردا رسم الخط میں تحریر شدہ قدیم نسخے پڑھنے کی اہلیت کے حامل ہوں۔ گیری سن، مہا اویادے، مکندرام شاستری یا رچرڈ ٹمپل کے بیانات پر اکتفا کرنا ہماری غفلت شعاری اور تساہل پسندی کا برملا ثبوت ہے۔اس تشویش کو مدنظر رکھ کر کہیں ہمیں لل دید اور شیخ العالم کے علاوہ حبہ خاتون اور اَرنی مال کی شاعری کو ازسرنو مرتب تو نہیں کرنا ہوگا جس کے لئے ہمیں معتبر تاریخی شہادتیں، سنجیدہ تنقیدی معیار اور باذوق تحقیقی اہلیت کو بروئے کار لانا ہوگا۔اس بات کا بہت دکھ ہے کہ ہمارے اسلاف کی غفلت شعاری اور عدم توجہی کے سبب ہمارا قدیم منظوم ادب بڑی حد تک ضائع ہو چکا ہے۔ اس پُرآشوب اور بے پُرسان حال زمانے کے ہزاروں گیتوں کو تخلیق کار کی عدم واقفیت کے سبب انہیں لُوکہ پاتھر قرار دیا گیا ہے۔غور سے دیکھا جائے تو یہ گیت اس زمانے کے لوگوں کی زندگی، غم، کرب، احساس اور تجربے کی عکاسی کرتے ہیں۔ان گیتوں کا جمالیاتی حُسن ، اجتماعی کیفیت، جدا گانہ لَے اور انفرادی تجربہ کو دیکھتے ہوئے یہ اجتماعی و عام لوگوں کے ذہنوں کی تخلیق نہیں ہوسکتی۔اس قبیل کی شاعری پر دوبارہ غوروفکر کرنے کی ہر ممکن گنجائش موجود ہے۔

دور حاضر کی کشمیری شاعری پر رحمان راہی کی رائے اس کے تجرباتی کردار کی

ایک نمائندہ خصوصیت ہے۔تنقید نگار کا کہنا صحیح ہے کیونکہ ان تجربات کے اندر عالمی سطح کی فکری، سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کا پرتو ملتا ہے۔نقاد کا یہ کہنا بجا ہے کہ ان تجربات میں عالمی سطح کی سماجی، فکری اور سیاسی تبدیلیوں کا پس منظر ملتا ہے۔شفیع شوق کا یہ کہنا نا قابل تردید ہے کہ ''ان انقلابی تبدیلیوں نے کشمیر سمیت پورے برصغیر کو متاثر کیا ہے اور انسانی سوچ پوری طرح تبدیل ہو کر نئی سرحدیں تلاش کرنے میں لگ گئی۔''۱۲ مذکورہ تبدیلی ادب اور شاعری کو بھی اپنی گرفت میں لے کر اس پر حاوی ہو گئی۔شاعری کے قدیم تماثیل واستعاروں، اظہار واقدار کے خلاف بہ بانگ دہل بغاوت شروع ہو گئی۔اس جدلیاتی شاعری کے نتیجے میں نئے کارناموں کے وجود میں آنے کا باقاعدہ آغاز ہو گیا مگر اس کے ساتھ ہی کئی نقائص وخامیوں سے بھی پردہ سرک گیا جن کو دیکھ کر بہت سے شعراء اس جدید روایت پسند شاعری سے منحرف ہو گئے۔اس کے علی الرغم وہ قدیم معنوں، اقدار واظہار کو ہی بیان کرتے رہے۔کشمیری زبان کی شاعری کی اس موجودہ صورت حال پر رحمان راہی تبصرہ یوں کرتے ہیں:

''موجودہ دور کی کشمیری شاعری کے اندر جو رجحانات پائے جاتے ہیں وہ کسی میکانکی پھیر بدل کا نتیجہ نہیں ہیں ان کے پیچھے اور پس پردہ ایک تاریخ ہے۔اپنی سابقہ روایات کو پس پُشت ڈالنا اور نئی روایات کی برتری کے زعم وارمان آج کے شعرا کے اندر ہم پاتے ہیں ان کا برملا اظہار آزاد کی شاعری سے بھی ہوا ہے گرچہ وہ 1948ء میں انتقال کر چکے ہیں۔اس کے برعکس احد زرگر کی شاعری جیسے آج کی ہی شاعری لگ رہی ہے لیکن اُس کو موجودہ دور کا شاعر کہنا صحیح نہیں۔''۱۳

بیسویں صدی کے کشمیری شعرا کے تخلیقی وادبی مقام ومرتبہ کو بیان کرتے ہوئے رحمان راہی دور اندیشی، منصفانہ انداز اور غیر جانبداری کا احساس دلاتے ہیں۔راہی نے عصری شعرا کے شعری فن پاروں کی گہرائی میں جھانک کر ان کے تخلیقی قد وقامت کو

جانچا ہے۔ مجروحؔ رشید، رحمان راہی کی تنقیدی بصیرت اور آ گہی کا معترف ہوکر موجودہ شاعری سے متعلق ان کے جاندار، صحت منداور مثبت رویہ کی پذیرائی اس طرح کرتے ہیں :

''راہی صاحب کا تجزیہ نہ صرف ایک عیاں و بیاں حقیقت ہے بلکہ یہ کشمیری زبان اوراس کے ادبی تنقید نگاروں کوعبدالاحد آزادؔ کوقدر کی نگاہ سے دیکھنے اوراس کے ادبی دین کو پرکھنے اور جانچنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔'' ۱۴؎

رحمان راہی، نادمؔ، کامل، فراق، اختر محی الدین، علی محمد لون جیسے ہم عصرادبا سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ'' ان ادبا نے کارل مارکس کے صحت مند فلسفے سے اثر اخذ کرکے بعض اصل وصحیح ادب تخلیق کرکے عام کشمیری کو غربت سے نکال کر آسودہ حال بنانے کی کوشش کررہے ہیں اور بعض مارکسی تنقید کی ہدایات کی پیروی کرتے کرتے ناکامی سے دوچار ہوتے تھے۔'' ۱۵؎

رحمان راہی اپنے ایک خاص دوست محمد یوسف ٹینگ صاحب کے رسول میرؔ پر لکھے ہوئے مضمون کے خلاف ردعمل کا اظہاراس طرح سے کرتے ہیں :

''اگر رسول میرؔ کی سراپا نگاری کو بقول محمد یوسف ٹینگ عالمی ادب کے عظیم کارناموں کے پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے تو اس صورت میں ان اہم فنی کوتاہیوں کونظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور پھران کی بنیاد پر رسول میرؔ کوعظیم شعرا میں شمار کرنا مبالغہ آرائی ہوگی۔ ۱۶؎

جدید کشمیری شاعری پر بحث کرتے ہوئے موصوف نے 1964ء سے قبل پندرہ سولہ سالہ شعری سرمایہ کو مدنظر رکھ کراس کی ترسیل (Communication) کے مسئلہ کو زیر بحث لایا ہے۔ رحمان راہی اس وجہ سے اسے جدید شاعری کا نام دیتے ہیں کیونکہ یہ اپنے معنی، ہیئت اورشکل وصورت کے لحاظ سے بہت حد تک تغیر پذیرا ورتبدیل

ہو چکی ہے۔ یہ ایسا ہی معاملہ ہے کہ زمان و مکان کا بدلاؤ ہر علم و ادب کو متاثر کر دیتا ہے اور اس اثر اندازی کا تذکرہ وہ یوں کرتے ہیں:

''زمان و مکان کے پھیر بدل سے ادب اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ ہر دور کا ادب قدیم روایات اپنے اندر سمو کر معنی و مفہوم اور مزاج و درک کے لحاظ سے متنوع ہوتا ہے۔'' ۱۷

قدیم و جدید شعراء کے مابین موازنہ کرتے ہوئے رحمان راہؔی کو دونوں کی ماہیت میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ البتہ جو فرق اور امتیاز انہیں دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جدید شاعری کے اندر انسانی فطرت کے عالمی عنصر کی موجودگی ہے۔ مجروح رشید بھی اسی بات کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''یہ عصری تصور انسان کو وقت کے ادراک و عرفان کو حاصل کرنے میں معاونت و مدد کرتا ہے۔'' ۱۸۔ رحمان راہی خود بھی قدیم اور جدید شاعری میں پھیر بدل پر اپنی رائے یوں بیان کرتے ہیں:

''اور جب ہم قدیم اور جدید شاعری کے باہمی پھیر بدل کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمارا مقصود یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ قدیم شاعری کے مقابلہ میں جدید شاعری کے اندر چند ایسے موضوعات پر قلم اُٹھانے کی کوشش پائی جاتی ہے جن کی طرف قدیم شعرا کی توجہ نہیں گئی ہے یا جو قدیم موضوعات سے متعلق نئے زاویہ نگاہ اور نظریہ کے مطابق بات کرنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔'' ۱۹

ردو قبول ادبی تنقید کا ایک اہم اور لازمی جز ہے۔ ردو قبول کو ایک تنقیدی معیار بنا کر ہم کسی بھی زبان کے ادب کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے قابل اعتبار منصف بن سکتے ہیں۔ ادبی تنقید کے اسی جمہوری و غیر جانبدار رویہ کو دیکھ کر وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) نے برملا طور اس بات کا علان کیا کہ'' آیا کام صحیح ہے کہ خراب، تنقید کا یہی دائرہ کار ہے۔'' ردو قبول کو ایک تنقیدی معیار اور پیمانہ بنا کر رحمان راہی نے کشمیری

ادب کے آسودہ حال ہونے کا دعوی اس انداز میں کیا ہے:

''ردوقبول کا عمل اگر زندہ ہونے کی علامت ہے تو پھر یہ بات کسی شک وشائبہ سے بالاتر ہے کہ کشمیری زبان اور ادب زندہ ہے۔ شدت پسندی اور جذباتیت سے محفوظ ہونا اگر صحیح اور متوازن ادب کی دلیل ہے تو پھر کشمیری زبان اور اس کے ادب کو کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے۔''۲۰

تنقیدی اور تخلیقی اہمیت کے علاوہ زیر بحث کتاب کا اسلوب قاری کو متوجہ کرتا ہے۔ اسلوب قلم کار کا گفتار ہوتا ہے اور یہی گفتار ارسطو کی نظر میں قلم کار کی شخصیت کی سنجیدگی اور گہرائی کا پتہ دیتا ہے۔ رحمان راہی کا اسلوب بھی منفرد ہے، وہ الفاظ کو موزون اور مناسب ترتیب بخش کر انہیں متحرک بنانے میں ملکہ رکھتے ہیں۔ وہ الفاظ کا معنی لغوی یا حوالیاتی سطح پر تلاش نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کا احساساتی پیرایہ دیکھ کر ان کا استعمال کرتے ہیں۔ ایسا بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے تصور اور خیال کو اپنے انداز میں الفاظ کے ڈھانچے میں ڈھالتے ہیں۔ رحمان راہی کے اسلوب کے اعلیٰ معیار کو دیکھ کر مجھے لانجائنیس (Longinus) کی روح کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ایک اعلیٰ پایہ شاعر اور نقاد کی طرح رحمان راہی بھی الفاظ، تراکیب اور جملوں کی منفرد محفل سجا کر ایک نئے ڈکشن کا وجود عمل میں لاتے ہیں۔ اس اقتباس کو دیکھیں:

''شاعری اُسی شعر سے چھلکتی ہے جو زندہ وتابندہ ہو۔ ایسے ہی جس طرح گل آفتاب پر بھونرا بےچین و بےقرار فریفتگی کی حالت میں دیوانہ وار گھومتا پھرتا ہے۔ کانٹے کی ٹہنی کے لال نم پر علی الصبح پڑی سورج کی کرنیں چمکتی دمکتی ہیں۔ یہ زندگی شعر کو شاعر بخشتا ہے اور اس عمل میں فطرت بہت حد مدد کرتی ہے۔''۲۱

اس اقتباس کو پڑھ کر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ رحمان راہی ایک اعلیٰ پایہ ادیب اور نقاد کی طرح نثر میں بھی نئے اور جداگانہ استعارہ و اظہار کا فراخدلانہ

استعمال کر کے اپنے منفرد طرز ادب کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔موصوف ایک بے باک نقاد کی طرح الفاظ اور جملوں کی موزونیت اور ہنر مندی کا استعمال اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری ششدر ہو کر داد دیئے بغیر نہیں رہتا ہے۔رحمان راہی کے اسلوب کا اپنا ایک نرالا حُسن ہے جو الفاظ اور تراکیب اور میکانکی طریقہ کا پابند نہیں ہے۔اُن کے لفظوں کے اندر تخیل اور احساس کی سارنگی اور لَے بجتی ہے۔رحمان راہی خود بے مثال شاعر اور شعر شناس ہیں۔آپ کی پُرکشش شاعرانہ شخصیت، قوت بیانی، موثر فہم و فراست، فکری دوراندیشی، پرواز تخیل دیکھ کر مجھے آر ڈبلیو امرسن (R. W.) کی یہ غور طلب اور مفید مطلب بات یاد آتی ہے :

"Great men are most distinguished by range and extent than by orginality. If we require orginality which consists in weaving like a spider, their web from their own bowels in finding clay and making bricks and building the house; no great men are original"

لسانی اعتبار سے ''کھوٹ'' کتاب کے اندر اسلوبیاتی اور ساختیاتی تنقید کا طلسم خانہ پوشیدہ ہے جسے بازیاب کرنے کی ضرورت ہے۔ہم فرڈینڈ ڈسوسیو (Fredinand De Saussure) کے نظریہ لینگ (Langue) اور پیرول (Parol) کو بروئے کار لا کر تنقیدی مقالوں کے اس مجموعہ کا باضابطہ ساختیاتی تجزیہ کر سکتے ہیں۔کیونکہ تنقید نگار نے جو زبان ان مقالوں میں استعمال کی ہے وہ ظاہری لسانی نظام کے قواعد وضوابط کے ہی تابع ہے البتہ موصوف نے کشمیری زبان کے فطری حُسن اور مزاج کو مدنظر رکھ کر ہر ایک واقعہ کے بیان کا عملی استعمال کیا ہے۔

لغت سازی اور اصطلاح سازی کے حوالہ سے بھی یہ کتاب قابل ستائش ہے۔ اس کتاب کے فرہنگ اور ذخیرہ الفاظ کے اندر کشمیری زبان کی بہت سی نئی ترکیبوں

کے ساتھ ساتھ انگریزی لفظوں اور تراکیب کے کشمیری مترادف موجود ہیں جن کا فاضل ادیب ازخود موجد ہے۔ رحمان راہی ان تراکیب اور اصطلاحات کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں:

''کشمیری زبان میں صحیح انداز میں اپنی بات بیان کرنے کے لئے میں نے وقتاً فوقتاً مختلف اصطلاحیں ادھر اُدھر سے ڈھونڈ لائی ہیں یا ازخود وجود میں لائی ہیں جن میں اب بہت اصطلاحیں اور الفاظ دیگر قلم کار بھی استعمال میں لا رہے ہیں۔''۲۳

اسی طرح سے اگر مترادفات کی یہ اختراعی عمل کشمیری زبان کے تخلیقی وتنقیدی ادب میں جاری وساری رہی اسے نہ صرف ہماری لغوی ضروریات پوری ہوں گی بلکہ ہماری زبان کے قوت اظہار میں وسعت ملے گی ۔رحمان راہی نے جن انگریزی الفاظ اور تراکیب کے کشمیری ہم پلہ معنی معرض وجود میں لائے ہیں، وہ کچھ اس طرح سے ہیں :

چھیکرس (Ultimate)، دیدآگہی (Vision)، کہنن (Nothings)، الگائے (Exception)، وننبن (Expression)، وُچھن ترائے (Point of view)، وُچھ بل (Illusion)، گٹاشُت (Twilight)، تھکہ نشانہ (Punctuation mark)، منہ کانچھ موطلی (Willing suspension of disbelief)، مولہ آنکون (Evaluation)، مُرژِ گری (Image making)، شخصاوبر (Personification)، کجراس (Paradox)، النکاری (Figurative)، شعوری کول (Stream of conciousness)، رٹن ہٲری (Receptiveness)، جوشِل (Sentimental)، حساوی (Sensuous)، خیالہ ہانکل (Association of ideas)، روحانی ہم مانگے (Spritiual adventure)۔

کشمیری شاعری کے وسیع وعریض سمندر کا احاطہ کرنا ذہنی وفکری سطح پر ایک

بڑا کارنامہ ہے۔ رحمان راہی کی شاعرانہ شخصیت کے متعلق پروفیسر حامدی کاشمیری کے یہ دانشورانہ کلمات راہی کے بلند پایہ علمی قدرومنزلت سے متعلق ہمارے شعور کو بیداری بخشتے ہیں۔

''وہ (رحمان راہی) پہلے سے ہی طے شدہ یا مروجہ اصولوں یا نظریات یا فارمولوں سے زندگی سے متعارف نہیں کراتا ہے بلکہ وہ ازخود زندگی جینے کی ہمت رکھتا ہے۔''[۲۴]

لہٰذا یہ بات کسی مبالغہ آرائی کے بغیر کہی جاسکتی ہے کہ ''کہوٹ'' نامی کتاب کشمیری تنقیدی ادب کا پہلا پڑاو ہے جس نے کشمیری زبان میں معروضی تنقید کی راہ ہموار کی ہے۔ یہ کتاب فاضل نقاد کے تنقیدی شعور کے ساتھ ساتھ اُس کی لسانی و تحقیقی اہلیت وصلاحیت کی عکاسی کر کے اُس کی ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

حاشیہ وحوالہ جات

۱ ناجی منور، شفیع شوق، نووکاشر ادبک تاریخ (سرینگر: شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳)، صفحہ ۲۶۹

۲ ایضاً صفحہ ۲۶۹

۳ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی: جے کے آفسٹ پرنٹرز۔ ۱۹۷۹) صفحہ ۲،

۴ شاد رمضان، اتھ ظلماتس لعل کیاہ چھِ تے (پبلشر مصنف: سری نگر، ۲۰۰۵) صفحہ

5) William Henry Hudson, An Introduction to the Study of Literature reprinted New Delhi: Kalyani Publishers1998) Page 266.

۶ امین کامل، صوفی شاعری، ص ۲۲۔

۷ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی جے کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۱۷۳۔

۸۔ شفیع شوق، زبان تہ ادب (سری نگر، مصنف، ۱۹۸۰)، صفحہ ۱۳۔
۹۔ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی جے کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۹۰۔۹۱۔
۱۰۔ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی جے کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۹۲۔
۱۱۔ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی جے کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۱۷۷۔
۱۲۔ ناجی منور، شفیع شوق، نوو کاشر ادبک تاریخ (سرینگر: شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۳)، صفحہ ۲۲۸۔
۱۳۔ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی جے کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۱۷۷۔
۱۴۔ ڈاکٹر مجروح رشید، عصری کاشر شاعری، (انڈین پرنٹنگ پریس ۱۹۹۸) صفحہ ۴۴۔
۱۵۔ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی جے کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۱۴۱۔
۱۶۔ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی جے کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۱۱۹۔
۱۷۔ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی جے کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۱۹۲۔
۱۸۔ ڈاکٹر مجروح رشید، عصری کاشر شاعری، (انڈین پرنٹنگ پریس ۱۹۹۸) صفحہ ۱۰۔
۱۹۔ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی سب کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۱۹۸۔
۲۰۔ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی جے کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۲۷۲۔
۲۱۔ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی جے کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۲۷۲۔
22) R.W Emerson "Shakespare; or the Poet" appeared in English Critical Essays in 19th Century" edited by Edmund D. Jones.
۲۳۔ رحمان راہی، کہوٹ (دہلی جے کے آفسٹ پرنٹرز ۱۹۷۹)، صفحہ ۲۔
۲۴۔ حامدی کاشمیری، جدید کاشر شاعری، (سرینگر: شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی) صفحہ ۱۲۱۔

☆☆☆

......ڈاکٹر عابد احمد
انگریزی سے ترجمہ ......سید مبشر رفاعی

رحمٰن راہیؔ: تخیل و تفکر کا شاعر

رحمٰن راہیؔ ایک معتبر اور ایسے انعام یافتہ شاعر ہیں، جنہوں نے کشمیری زبان وادب کو ملک کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں شامل کروانے میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے شاعری اور نثر نگاری میں ادبی شاہکار تخلیق کئے ہیں۔ انہیں بیش قیمت تراکیب اور کثیر تمدنی تلمیحات کے استعمال میں کمال فن کی قدرت کا مالک تسلیم کیا جاتا ہے۔ افکار کی بے مثال پیچیدگیاں ان کی شاعری کے امتیازی وصف ہیں۔

بیسویں صدی کے وسط میں رونما ہوئی عمیق تبدیلی کے نتیجے میں کشمیری سماج کو ایک غیر یقینی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف سیاسی مستقبل مخدوش دکھائی دے رہا تھا اور دوسری طرف تمدن کی بنیادیں بے ثباتی کا شکار ہو رہی تھیں۔ اس صورت حال کے نتیجے میں جمالیات اور تمدنی واجبات میں تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ اس صورت حال میں Progressive Writers Movement (ترقی پسند انشا پرداز تحریک) کشمیر کی انفرادیت، تمدن اور ادب کو منتشر ہونے سے بچانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ اس تحریک سے متاثر ہوئے دو شعرا، غلام احمد مہجورؔ اور عبدالاحد آزادؔ نے شاعری کے منظر نامے میں ایک نئی روح پھونک دی اور یہ مشعل راہیؔ سمیت اپنے بعد آنے والے شاعروں کی نسل میں منتقل کی۔

راہیؔ، جن کا اصل نام عبدالرحمان میر تھا، کا جنم 1925ء میں سرینگر میں ہوا۔اگرچہ بچپن سے ہی شاعری کی جانب ان کا میلان تھا، تاہم پراگریسیو رائٹرس مووومنٹ سے متاثر ہونے کے بعد انہوں نے نظمیں لکھنا شروع کیا۔ابتدائی نظموں میں وہ ایک ایسے مثالیت پسند عشق کا اظہار کرتے ہیں، جہاں عہد جوانی کے سبھی جذبات کی تکمیل ہوتی ہے۔ان کے شعری مجموعے ''نوروزِ صبا'' میں ترقی پسند نظریئے اور عشقیہ خواہشات کا امتزاج ملتا ہے۔تاہم اس تحریک سے متاثر ہوئے دیگر شعرا کے برعکس انہیں اس فن کی اہمیت کا پورا علم تھا۔ یہ اُس دور کی، اُن کی شاعری میں خود کلامی کے فن کے استعمال سے ثابت ہوتا ہے، جس نے انہیں عظیم صلاحیت کے حامل اور فن کی قوت کا احترام کرنے والا محتاط قلمکار ثابت کیا۔رومان اور خالص فن کے تیئں ان کے جذبے کا سنگم ان کی کئی معروف نظموں بشمول ''شاعر''، ''حُسنِ لازوال'' اور ''فن برائے فن'' میں واضح طور دیکھنے کو ملتا ہے۔''فن برائے فن'' میں فن کو ایک وضع کے طور پیش کیا گیا ہے جو زندگی جینے کیلئے بذاتِ خود کافی ہے۔

ان کے مجموعے ''سیاہ رودِ جرین منز'' نے راہیؔ کو کشمیری زبان کے بڑے تخلیق کار کا مقام دلایا۔اس سے ان کے تخلیقی کینواس اور عالمی کیفیات کے علاوہ انسان کی عمومی صورت حال کے تیئں انفرادی قرب کا نقشہ بھی ابھرتا ہے۔اس مجموعے کی پہلی نظم ''جلوۂ زیوٗر'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان کی شاعری کے خزانے کی کلید ہے۔ یہ نظم کشمیری تمدن اور زبان کا نغمۂ فتح اور ان کے متحرک تخیل کے زود اثر جُز کے تیئں ان کا خراج ہے۔

اس نظم سے ان کی موروثی روایات کے وسائل کا اظہار ہوتا ہے، جو لل دید، حبہ خاتون، محمود گامی اور رسول میر کے کلام میں مجسم ہیں۔انہوں نے اپنی نظموں کی تخلیق میں ان وسائل کا استعمال کیا ہے جن سے زندگی، اس کے اتار چڑھاؤ اور

پیچیدگیوں کے بارے میں ان کے فہم وادراک کے نقوش ملتے ہیں۔ نتیجے کے طور بے مثال تخیل اور تکنیک کی حامل نظمیں معرض وجود میں آئی ہیں۔

راہیؔ کے آخری دور کی شاعری انقلابی نوعیت کی شاعری ہونے کے اعتبار سے ان کی ابتدائی شاعری سے مختلف ہے۔انہوں نے دوسری زبانوں سے مستعار لئے گئے محاوروں اور تجربات کا استعمال ترک کر کے ذاتی زندگی کے تجربات کا اظہار کیا۔جب انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ تخلیقی فن کسی طے شدہ روایت کا محتاج نہیں ہے،تو وہ ذاتی تجربات کے موافق خود کے محاورے تخلیق کرنے کی حوصلہ مند جستجو کرتے ہیں۔ اس اظہار کا اپنا آہنگ اور اپنی موسیقی ہے۔ یہ اظہار خیال ان کی شاعری،منفرد تجربات اور مضامین کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔یہی خاصیت انہیں اپنے ہم عصروں اور پیش رووٴں سے مختلف بنا دیتی ہے۔ قاری، دریا، سلسبیل ،صدا، آوُلن وغیرہ کچھ ایسی نظمیں ہیں جو کشمیر کے جمالیات کی حدود میں انوکھے تجربات ثابت ہوتی ہیں۔

اگر نسیمِ بہار پھر سے عجلت میں ہے
اے دل خبر دار رہنا، کہیں ہوش نہ کھو دینا
اگر سنبل دوبارہ دل موہ لیتا ہے
بھٹک نہ جانا اور آہ نہ بھرنا
کائنات سیماب کی مانند بے چین ہے
پون چلی ہے،نور پھیلا ہے
رات گزر گئی ہے،سویرا ہوا ہے
ابھی ابھی پنہاں سرما محورقص تھا
ابھی بہار آئے گی

اور اپنی خوشبو پھیلائے گی
کیا پتوار ساگر کی گہرائی میں جائے گا
یہ تنہا زندگی آئینوں کا گھر ہے
اگر اس کا ساز خوشنما ہے
یہ بے درد رباب کبھی کبھی
دل کے درد کا ساز بجاتا ہے
اے دل محصور نہ ہونا
باغ میں بے شمار پھولوں کا وجود ہے
صبح و شام میں وقت نہ بانٹنا
پوشیدہ سورج چاند کو چمکاتا ہے

(The Flood and the Shore)

اپنے خود کے طرز تحریر کی تلاش میں، راہیؔ نے کشمیری شاعری کے محاوروں کو بنیادی سطح پر تبدیل کیا اور اس طرح کشمیر کے تہذیبی ڈھانچے کے بارے میں روایتی تصور کو بدل دیا۔ اپنے تخلیقی اظہار کے ذریعے انہوں نے حقیقت میں ایک ایسی تازہ عالمی رائے قائم کی جو عصری ادراک اور عصری حقائق کیلئے زیادہ موزون تھی۔

دنیا میں انسان کی زندگی کس قدر مختصر ہے
چودھویں کے چاند جیسی دلفریب
اوس کے چند لمحے
چند گلاب کے
اس سے پہلے کہ ہم کسی راستے پر چل پڑیں
قبر اور چتا کسی کا لحاظ نہیں کرتیں

بچپن کے بعد جوانی اور پھر
چڑ چڑی عمر آتی ہے
کتنی مختصر ہے ہماری زندگی، لیکن آہ!
کتنی لامحدود ہماری تمنائیں
(ایک بوڑھی عورت کی خود کلامی)

(مترجم:۔ٹی این رینہ)

راہیؔ نے زندگی کے پیچیدہ اور ہمہ جہت تجربات کو ایک محاورے کے ذریعے اظہار بخشا، جس سے اس کے تخلیقی تصور نے طبعیاتی اور مابعد دنیا کے غیر دریافت شدہ سلطنت کی صورت اختیار کی۔ نتیجے میں ایک ایسی شاعری وجود میں آئی، جس نے کشمیری تصور، اظہار اور محاوروں کو بے مثال تونگری بخشی ہے، اور اس کے مقررین وقارئین کیلئے نئے مناظر کو وسعت دے کر اس کو کسی بھی عالمی زبان کے ہم پلہ بنا دیا ہے۔ مبہم تجربات کی دائمی کھوج میں مصروف، مدفون الفاظ کو زندہ کرنے اور ان میں نئی روح پھونکنے کیلئے وہ وقت کو چھانٹتے ہیں۔

زندگی! ایک نابینا بدصورت ساحرہ
شیشے کی مانند چمکتے آسمان میں سحر سے قبل کالی گھٹا
ستاروں کی روشنی بجھاتے ہوئے
ایک راکشس چاند کو نگلتے ہوئے
پہاڑیوں کے عقب میں
گرج کی گونج سے غضبناک شور پیدا ہوا ہے
آسمانی بجلی کے راکشس اپنے خطرناک ہتھیار لہرا رہے ہیں

پتھریلی پہاڑیاں ژالے کی آمد آمد سے تھرتھرا رہی ہیں
اپنے گھونسلوں کی تباہی کے احساس سے پرندے زرد پڑ رہے ہیں
(زندگی:۔مترجم۔۔۔ٹی این رینہ)

بے پناہ تخلیقی صلاحیت کے مالک راہیؔ جیسے منش کیلئے ایسی جستجو ضروری تھی، جو مکمل طور بدلے وقت میں جدید حقائق کا اظہار کرتی ہے۔اس کی شاعری عصری ذہانت کی آئینہ دار ہے جس میں زندگی کے المناک احساس، اس کی حساسیت، شعور کی اعلیٰ سطح کے نتیجے میں عصر حاضر میں محسوس ہونے والے اس کے ریزہ ریزہ ہونے کے عمل کا فہم، سائنس میں جدید ترین تحقیق (دقیق اور مادی)، تاریخی ارتقا اور عشق جیسے بنیادی انسانی جذبے کے تبدیل ہوئے معنیٰ کی عکاسی ہوتی ہے :

اس راز سے کب اٹھے گا پردہ
تا کہ حیات ومماۃ کی حقیقت آشکار ہوجائے
کیا موت کبھی اس ریشم کے کیڑے کی طرح
اپنے سخت کام کے جال میں پھنس جائے گی؟
زندگی کب فتح یاب ہوگی؟
تا کہ انسان کو حیات جاودانی ملے

(سونہ لانک پر: مترجم ٹی این رینہ)

راہیؔ کو ان کی کثیر تہذیبی آگہی کیلئے بھی جانا جاتا ہے، جس کی عکاسی ان کے مضامین کے انتخاب اور ان کے طرز تحریر میں ہوتی ہے۔ یونانی۔رومی سے وسط مشرقی وسط ایشائی اور بھارتی برصغیر تک کی رنگا رنگ تہذیبی پہچان کے وسیع مطالعہ اور علامتوں کی جانکاری نے انہیں ایک عالمی نسبت عطا کی اور اس طرح انہوں نے اپنی شعری دنیا میں مہارت کے ساتھ ان علامتوں کی تکمیل کی۔

''راہیؔ کے تخلیقی تصور میں حیرت انگیز اور مافوق العادت لچک، ہمدردی اور جدا جدا عناصر کو یکجا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت کے علاوہ شگفتہ و مادی تصویروں کے ذریعے تجربہ کاری حاصل کرنے کا اظہار ہوتا ہے۔''

(غلام رسول ملک: 171)

ان کے تخیل کا کینواس وسیع اور ہمہ جہت ہے۔انہوں نے مختلف تہذیبی مصادر سے مستعار لے کر خود کا طرز تحریر تخلیق کیا ہے جو اِس طرزِ تحریر کی پیچیدگی، اختراع اور مادیت کی وجہ سے منفرد ہے۔''زَبَروَن بالہِ تھنگو''(زبرون چوٹی) اور ''زَن تہٕ اکھ نظم''(جیسے ایک نظم ہو)،ایسی نظمیں ہیں جن میں عصرِ جدید کے بدلے حقائق کی روشنی میں کچھ روایتی بنیادی تصورات کے بار بار خیال سے ڈرامائی اثر پیدا کرنے کی خاطر ہمہ جہت تہذیبی ادراک اور اشاروں و کنایوں کا سنگم ملتا ہے۔

میں نے زندگی بھر انتظار کیا
کہ تم خاموشی توڑ دو گے
اور مجھ میں نور پیدا ہوگا
اے زبرون چوٹی! تمہاری مضبوط چھاتی سے پھوٹ پڑے گا
میرے منتشر دل کی دائمی ہم آہنگی
دھول میں اَٹی میری آنکھیں اتھاہ سمندر کو نگل جائیں گی
اور شانت کمل کی گود بھریں گی
اے زبرون چوٹی
تُو میری ابدی ہمدم ہے
میں نے زندگی بھر انتظار کیا
کیا تم نے میرے بے چین دل کی دھڑکن سُنی

میں نے بار ہا سُنی
تمہارے سسکتے دل کی پُر جوش آوازیں
جب بھی تم کو وقت ملے
شاید میرے قدموں کی آہٹ سنائی دے
میں ابدی انتظار میں رہوں گا
انتظار کی حد سے آگے
بے حرکت تیرتے باغات کی

(اے زبرون چوٹی)

راہیؔ زندگی کا دور سے مشاہدہ نہیں بلکہ ذاتی سطح پر کافی قریب سے اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ اپنے تصور میں جیتے ہیں پھر اس کو ایک ایسے استعارے میں بدل دیتے ہیں جو ان کے تجرباتی احساس اور بصیرتِ فن کا محور بنتی ہے۔ نتیجے کے طور ادب کا ایک شاہکار سامنے آتا ہے جو انتہا درجے کی خصوصیات کا حامل محسوس ہوتا ہے اور جس کی اہمیت آفاقی ہوتی ہے۔ اس سے ان کی شاعری خصوصاً ان کی نظموں میں صراحت اور اختیاری حالت پیدا ہوتی ہے۔

بدقسمت پنکھوں کا گچھا
غضبناک باز کی زد میں
نرگسی صنوبر بھونرے سے دور
اور چنبیلی کو ایک کالا ناگ لپٹے ہوئے
پروانہ نگلتی آگ میں رقصاں
شبنم کا قطرہ سورج کی کرنوں میں دھیمی مسکراہٹ کی مانند
پنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی فاختہ اڑان بھرنے سے عاری

اس کھیل میں بھوکا شاہین لہو بہائے گا
نہ دنیا میں کوئی امید باقی نہ آسمانوں میں کوئی یقین
بے نشان ماضی اور بے نام مستقبل
ریگ رواں اس دنیا کی منزل نہیں کوئی

زندگی کے بارے میں راہیؔ کے تجربات تلخ ہیں۔ وہ اس کی بے ثباتی اور اس کے بھاگتے لمحات اور جھومتی تشفی کا تعاقب کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ اس جستجو کی عکاسی ان کے الفاظ میں ہوتی ہے، جن کو وہ مہارت کے ساتھ متحرک استعارات میں تبدیل کرتے ہیں۔ وہ فیاضی کے ساتھ ان کا استعمال کرتے ہیں۔ مزید برآں وہ مانوس اور غیر مانوس الفاظ کو محاوروں میں تبدیل کر کے اپنی انوکھی اور غیر روایتی شبیہ کاری کے ذریعے کامل معنٰی بیان کرتے ہیں، جس سے ان الفاظ کے اصل مطلب سے کہیں زیادہ گہرے معنی کا اظہار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ''زَبَروَن بالہِ تھُنگی'' (زبرون چوٹی) ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر عصرِ حاضر میں اس چوٹی کی افسانوی، تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کو نظر میں رکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں اس سے مخاطب ہے۔ ''زبرون'' اور ''بہشت کا گہرا دریا'' اس طرح کے شعری اظہار کی دو مثالیں ہیں۔

زباں داں اور سنجیدہ قاری ہونے کے باوجود راہیؔ اپنی نظموں کی تخلیق کے عمل میں کشمیر کی بیش قیمت تہذیبی شناخت کو بروئے کار لاتے ہیں۔ وہ کشمیر کے تہذیبی لینڈ سکیپ سے اس قدر جڑے ہوئے ہیں کہ اپنی شاعری میں اس کی اصطلاحات اور استعارات، چاہے وہ کشمیر کے ماضی کے ساتھ یا مستقبل کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں، کا فیاضی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ کشمیر کی قدیم ترین خصوصیات و علامات، اس کے افسانوی روایات کا علم اور تہذیب کی نشانیاں اور ان کے تخیل کا مادہ ہے۔ ان کی زیادہ تر شاعری ان کی خود کی دریافت کی سمت میں ایک سفر

ہے اور اس میں کشمیر کی تہذیب کے ساتھ ان کے گہرے اُنس کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ کشمیر کو اپنی خصوصیات کے حوالے سے فقط ایک مقام نہیں بلکہ اس کو ایک خیالی کائنات کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ محسوس کئے گئے اپنے تجربات کو زیادہ بامعنی بنانے کیلئے انہیں اپنے جغرافیائی وتہذیبی سیاق وسباق میں ظاہر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دم توڑتے تہذیبی اظہار، الفاظ اور طرزِ کلام کے تحفظ، ان کے احیائے نو اور ان کو آنے والی نسلوں کی خاطر محفوظ رکھنے کیلئے دانستہ جستجو کرتے ہیں۔ راہیؔ کشمیر کے تابناک ماضی کا منظر سامنے لانے کیلئے ان الفاظ اور محاوروں کا استعمال کرتے ہیں۔

عصری زندگی کی پیچیدگیوں کو ظاہر کرنے کیلئے 1970 سے راہیؔ نے سادہ طرزِ کلام میں نظمیں لکھیں اور اس طرح اپنے منفرد انداز میں کشمیری ادب میں مابعد جدیدیت کی جمالیاتی حِس کو متعارف کیا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں بنیادی طور عشق کے تصور کو بدل کر رکھ دیا۔ مثلاً ''تخلیق''، جس میں عشق کو زندگی کی حقیقت مانا جاتا ہے، جس میں جسم اور روح کا درجہ یکساں ہے، یہ اُتنا ہی طبعی ہے جتنا کہ روحانی عشق انسان کو آزادی عطا کرتا ہے اور اس کو زندگی کی غیر مانوس جہتوں سے آشنا کراتا ہے۔ یہ نظم خوبصورتی کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت کے مماثل کو ظاہر کرتی ہے لیکن ایک ہی زبان میں ایک دوسرے کی تحسین وآفرین کیلئے مختلف تقاضے تخیل کی پیچیدگی کے موافق ہے۔ عشق کی طبعی حالت محض حیوانی جبلت یا تولیدی حقیقت نہیں ہے اور اس کو سماجی امتناع کے پردے میں چھپانا سراسر نفاق ہے۔ نظم کے موثر استعارات جنسی جبلت کو ایک آزادانہ صورت میں ظاہر کرتے ہیں جو اپنے آپ میں معنی خیز ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دباؤ میں عشق اور جنس کی تبدیلی اور اس کی تخیلی اور فلسفی جہتوں کے زیاں پر اپنی کچھ نظموں مثلاً ''تخلیق'' میں راہیؔ اظہارِ تاسف کرتے ہیں۔

میں فرش کو محسوس کیوں نہیں کر سکتا

اگرچہ کانوں میں ہوا محسوس ہوتی ہے
یہ کون سی اندھیری گپھا ہے، میں کہاں ہوں
کیا مجھے یہ دہکتی آگ نگلنی ہوگی

(تخلیق)

زندگی کے گہرے سوالات کے ساتھ سنجیدہ رشتے کی بنا پر بھی راہیؔ کی شاعری مشہور ہے۔ رینہ کہتے ہیں کہ:

''راہیؔ نے وجود کے بنیادی مسائل اور انسانی تاریخ پر مذہب، سیاست اور فلسفے کے اثرات پر غور وفکر کیا ہے۔(121)

کوئی بھی ہستی اپنے آپ میں بے معنی ہے البتہ یہ تب بامعنی بن جاتی ہے جب یہ انضمام، اتمام اور وصل کے ذریعے کُل (میول) کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اپنی پہنچ میں عالمگیریت کی حامل داستانوں اور تصویروں کے آزاد وسائل کی بنا پر بھی ان نظموں کو جانا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مقام پر راہیؔ نے انسانیت کے مول کا ادراک کیا ہے کہ یہ کس طرح نہ صرف اپنے ماضی بلکہ قضا کے ساتھ بھی بندھی ہوئی ہے۔ وہ بڑی ہی باریک بینی کے ساتھ عالمی داستانوں، تاریخی حکایات اور تہذیبی تلمیحات سے استعارات کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ''اسلوبِ بیان کا تعقل'' ان کی بعد کی شاعری کا ایک وصف قرار پاتا ہے، جس میں ''یونانی، اسلامی اور ہندوستانی علامات'' کا بھرپور استعمال ہوتا ہے۔(رینہ۔122)

مختلف استعاروں کے ساتھ محاروں کو تشکیل دیتے ہوئے، راہیؔ بہرحال اپنے خود کے شعری بول چال تک پہنچ جاتے ہیں جس کو وہ مضبوط وموثر ذریعے اور بحرووزن کے روایتی طور طریقے کے متبادل کے طور اپناتے ہیں، جو اُن کی جذباتی حرکات اور روح کی تار کے ہم آہنگ ہے۔ اس کا ڈھانچہ شاعر کے تجربات کے ساتھ

مربوط بھی ہے اوراس کے تابع بھی، جوشاعرکوادب کے حدود میں ایسی آزادی عطا کرتا ہے جس کی وہ تمنا کرتا ہے۔راہی تجریدیت اورابہام کواچھی شاعری کی خصوصیات مانتے ہیں۔غزل کے مقابلے میں نظم کوتہذیبی اظہار کا ذریعہ بنانا ان کے اُس شعوروفہم کا نتیجہ ہے کہ نظم ان کی محرکات کے موافق ہے اور بحر کے روایتی انداز کے مقابلے میں نظم جذبات ومحرکات کی باریکیوں کے اظہار کیلئے موزون ہے۔

شاعر ہونے کے علاوہ راہی ایک نقاد اور نثر نگار بھی تھے۔انہوں نے اپنے یکتا اور بے مثل طرزِ تحریر سے کشمیری نثر نگاری کو چار چاند لگائے ہیں اوران کی تنقید نگاری اختراعی ثابت ہوئی ہے۔انہوں نے اُس وقت ادبی تخلیق اورتوصیف کے عمل میں عالمگیر سطح کا معیار متعارف کیا، جب تنقیدی ادب موضوعی اورخوش تعبیری کے ردِعمل پر مبنی ہوتا تھا۔اس صورت حال میں کشمیری تحریروں کی اصل قدر ومنزلت کا اندازہ لگانے کیلئے انہوں نے تنقیدی ادب کی آزمودہ اورمعتبر کسوٹی کی تجویز دی۔اس سے بذاتِ خود شاعری، نثر نگاری اورتنقید میں بہتری آئی اور اس طرح شاعری کے علاوہ ہئیت میں بھی زبان کی مزید آراستگی ہوئی۔''شعرٗت تہٕ تمکّیٖ ترکیبی اجزا'' جیسے ان کے مضامین کوکشمیری نثر کی تنقید میں سنگِ میل کی حیثیت سے سراہا گیا ہے۔1979ء میں شایع شدہ ان کے مضامین کا مجموعہ ''کہوٗٹ'' کشمیری زبان و ادب میں اپنی نوعیت کی واحد تنقیدی کتاب ہے۔

اس کتاب نے کشمیری ادب کے قارئین کیلئے نئی وسعتیں پیدا کی۔یہ مجموعہ کلاسیکی اور جدید کشمیری شاعری کے غیر مانوس پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے بدلتے وقت میں تخلیقی ادب کی توضیح وتشریح کرتا ہے۔انہوں نے کشمیری میں تنقیدی ادب کومزید جِلا بخشنے کیلئے نئے الفاظ اور لہجے کا استعمال کیا ہے۔

ان کی ایک اور کتاب ''شعر شناسی'' کشمیر کے عارفانہ مزاج اور کشمیر میں

سماجی اور ثقافتی مزاج ترتیب دینے میں اس کے انقلابی کردار کے بارے میں اختراعی نوعیت کا کام ہے۔اس میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کشمیر کی صوفی اور عارفانہ شاعری کی جڑیں کس طرح انسانیت پسندی پر مبنی ہیں اور یہ کس طرح آج بھی برمحل ہے۔کشمیر کی صوفیانہ وعارفانہ شاعری کی روایت سے متعلق اختراعی کام کی مناسبت سے یہ کتاب تازہ نظریئے سے شاعری کی اس قسم کا مطالعہ کرنے میں سکالروں کیلئے مددگار ثابت ہوئی ہے۔

مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ نامور شاعر سے رجحان ساز و ادبی اصول دان ہونے تک راہیؔ کشمیری ادب اور ثقافت کی ایک موثر و مختار شخصیت ہیں۔کشمیری زبان اور عالمگیر مضامین کے اظہار میں اس کو اپنانے کے تئیں ان کا جداگانہ رویہ آج بھی یکتا ہے۔اظہار خیال کیلئے اصطلاح سازی اور تخلیقی حاکمیت ان کو اپنے ہم عصروں سے جداگانہ بنادیتی ہے۔ان کے فنکارانہ کمالات نے کشمیری زبان کی تخیلی اور شعری دنیا کو بے مثال وسعتیں عطا کی ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:۔

ملک جی آر:۔ کشمیری ثقافت وادب۔سرینگر۔شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی 2006ء

رینہ ترلوک ناتھ۔کشمیری ادب کی ایک تاریخ۔نئی دلی۔ساہتیہ اکیڈیمی۔2005ء

.......محی الدین ریشی

رحمٰن راہیؔ: کاروانِ ادب کے سرخیل

پروفیسر رحمٰن راہی بلا شبہ عصرِ حاضر کے ایک بڑے شاعر ہیں، جنہوں نے کشمیری زبان کو وقار بخشا اور اسے عالمی ادب کے ہم پلہ بنانے میں ایک کلیدی رول ادا کیا ہے۔ اپنے 75 سالہ ادبی سفر کے دوران انہوں نے کئی منازل طے کئے اور ایسے مقام کو چھو لیا جہاں پہنچنے کی آرزو ہر کسی شاعر یا ادیب کی ہوتی ہے۔ یہ سفر کا کب اور کیسے شروع ہوا' اس بارے میں محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں کہ راہی کو بچپن سے ہی کشمیری ادب اور سنگیت کے ساتھ دلچسپی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کشمیری زبان کے منشی نول کشور یعنی خواجہ نُور محمد تاجر کتب کی دکان ان کے گھر کے پاس ہی ہوا کرتی تھی۔ اس دُکان پر راہی کا آنا جانا شروع ہوا' جو اُن دنوں کشمیری زبان کا کلاسیکی اور ہم عصر ادب کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ مانا جاتا تھا۔ اگرچہ نور محمد ایک کتاب فروش تاجر تھا لیکن اُسے فارسی' اردو' کشمیری اور کسی حد تک عربی ادب کا بھی ذوق تھا۔ انہوں نے پوری طرح سے اس نوجوان کے اندر چھپے جوہر کو پہچان لیا اور اس کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ راہی نے خود اس بات کا اعتراف کیا کہ ادب کے حوالے سے یہی ان کی پہلی تربیت گاہ تھی۔

راہی نے اس زمانے میں اردو زبان میں اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے اور مضامین بھی لکھتے تھے جو کلچرل کانفرنس کے ترجمان ''کونگ پوش'' رسالہ

میں چھپتے تھے۔ راہی کی ادبی صلاحتیں اگر چہ اردو زبان میں کافی اُجاگر ہوئیں لیکن انہیں جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ اپنے جذبات و احساسات کو جِلا بخشنے کے لئے مادری زبان کا استعمال کرنا چاہئے۔ اس طرح انہوں نے 1950 ء کے آس پاس کشمیری زبان میں شاعری کا آغاز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کشمیری شاعری کی کایا پلٹ دی۔ 1958 کے بعد عالمی ادب پر سوشلسٹ اندازِ فکر کا اثر نمایاں ہونے لگا تو راہی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ ان کی شاعری کے لب و لہجہ پر نئے سُر اور صدا پیدا ہونے لگے جن کی بدولت کشمیری شاعری میں بھی عالمی محاوروں اور احساسات کی مہک محسوس ہونے لگی۔

'نوروزِ صبا' کے عنوان سے ان کا شاعری مجموعہ 1959 میں شائع ہوا جس میں سوشلسٹ نظریات کے ساتھ ساتھ قدیم زبانوں کی شاعری کا اثر بھی راہی کی نظموں میں دیکھنے کو مل گیا۔ اس طرح راہی نے کشمیری شاعری کو عالمی ادب کے قریب لانے کی کامیاب کوشش کی۔ راہی کو اردو اور فارسی شاعری پر عبور حاصل تھا۔ غالب اور حافظ شیرازی ان کے پسندیدہ شعرا تھے۔ راہی کے اشعار میں جہاں لوک ادب کا شعور دیکھنے کو ملتا ہے وہاں بین الاقوامی سخنوروں کے احساسات بھی محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ اس طرح راہی نے کشمیری شاعری کو جدید تقاضوں سے ہم کنار کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

پروفیسر راہی کے دوسرے شعری مجموعے ''سیاہ رود جرین منز'' کا ادبی حلقوں میں زبردست چرچہ رہا اور اس کو ہر طرف سے پذیرائی حاصل ہوئی۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد یوسف ٹینگ لکھتے ہیں کہ کشمیری زبان کی یہ واحد کتاب ہے جسے ہم عالمی سطح پر پیش کر سکتے ہیں۔ کتاب سے متاثر ہو کر انگریزی زبان کے پروفیسر غلام رسول ملک کہتے ہیں کہ کشمیری زبان میں لل دید سے لے کر آج تک جتنے بھی شاعر ہو

گزرے ہیں اُن میں رحمٰن راہی سب سے اہم شاعر ہیں۔ اقبال فہیم اس کتاب کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں کشمیری قوم کا نفسیاتی وجود آشکار ہو جاتا ہے۔ جب کہ پروفیسر شاد رمضان کہتے کہ پروفیسر راہی کشمیری زبان کے پہلے ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری کو ہم دُنیا کی اہم زبانوں کے اعلیٰ ادب کے ساتھ کھڑا کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد کمتری کا وہ احساس کم ہو جاتا ہے جب ہم چند زبانوں کا عظیم ادب پڑھتے ہوئے محسوس کرتے تھے۔ راہی صاحب کے تخلیقی اور تحقیقی سفر کو مدِ نظر رکھ کر پروفیسر بشر بشیر کہتے ہیں کہ کشمیر کے جتنے بھی مفکر، فلسفی اور شاعر جیسے ابھینو گُپت، لل ایشوری وغیرہ ہو گزرے ہیں رحمٰن راہی اسی کڑی کا ایک حصہ ہیں۔ پروفیسر مجروح رشید نے ان کی کئی نظموں کا انگریزی ترجمہ کیا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی زبان وادب میں جو مقام ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کو حاصل ہے وہی مقام ہمارے ادب میں راہی کو حاصل ہے۔

1998 کے آخری ایام میں جب میں نے ''آلَو'' رسالے کا نظم نمبر ترتیب دینے کا کام شروع کیا تھا اُس وقت ارجن دیو مجبور کی یہ بات مجھے بھلی معلوم ہوئی کہ راہی کے کلام کا تجزیہ کرنے کے لئے تنقیدی بصیرت ہونا انتہائی ضروری ہے۔ یہ بات میری اس التجا کے جواب میں اُنہوں نے کہی تھی کہ راہی کی نظموں کا تنقیدی جائزہ لینے کے لئے میں نے ٹینگ صاحب کو درخواست کی تھی شاید وہ انتہائی مصروف ہیں۔ اب آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ ہی راہی کے کلام کے حوالے سے مقالہ لکھیں تو انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ راہی صاحب کی شاعری پر بات کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس کے لئے تنقید نگار کا عالم ہونا بہت ضروری ہے اس لئے آپ ٹینگ صاحب کا ہی انتظار کریں۔

آخر کار ٹینگ صاحب نے راہی صاحب کی شاعری پر اپنا مضمون بھیج دیا۔ اس

مضمون کو پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ واقعی راہی صاحب کے کلام کا تجزیہ محمد یوسف ٹینگ سے بہتر اور کوئی نہیں کرسکتا تھا۔اسی سال کلچرل اکادمی کے اہتمام سے جموں میں کشمیری کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں ٹینگ صاحب نے اس بات کا اعتراف کیا کہ رحمٰن راہی کا کلام عالمی پیمانہ کا معیار رکھتا ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ میں نے نوبل انعام یافتہ کتابوں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور دعویٰ کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ راہی کا کلام نہ صرف اُس معیار پر پورا اتر رہا ہے بلکہ بعض جگہوں پر اس سے بھی آگے جا رہا ہے ۔ٹینگ صاحب کی یہ باتیں شاید گیان پیٹھ ایوارڈ سلیکشن کمیٹی کے ممبران کا توجہ مرکوز کرنے کے لئے کافی تھیں جنہوں نے راہی کے ادبی کارناموں پر غور کرنے کے بعد ۲۰۰۵۔۲۰۰۴ء میں یہ اعلان کیا کہ ڈاکٹر لکشمی سنگھوی کی صدارت میں سلیکشن کمیٹی نے کشمیری زبان کے نامی شاعر اور تنقید نگار پروفیسر راہی کو ہندوستانی زبانوں میں قابل رشک کام کے عوض یہ باوقار ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔اس اعلان سے ریاست کے ادبی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اسے کشمیری زبان کے لئے ایک نیک شگون مانا گیا۔اگرچہ اس سے پہلے بھی اس ایوارڈ کے لئے کئی کشمیری ادیبوں اور شاعروں کے نام تجویز کئے گئے تھے لیکن ان پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔

راہی صاحب کو جہاں اپنی محنت کا پھل 1961ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے ملنا شروع ہوا تھا وہاں ان کے قد کا احساس اس وقت ہونے لگا جب انہیں دوسری ریاستوں سے انعامات ملنے شروع ہو گئے جن میں آل انڈیا بنگال رائٹرس کانفرنس ایورڈ اور ہندی ورلڈ سمیلن جیسے انعامات شامل ہیں۔لیکن اصلی کامیابی انہیں 1999 میں ملی جب انہیں کشمیری زبان وادب کے علاوہ تعلیمی میدان میں اعلیٰ کارکردگی کے عوض ساہیتہ اکادمی کے سب سے بڑے اعزاز ''فیلوشپ'' عطا کی گئی۔اسی سال انہیں پدم شری دیا گیا۔اور 2003ء میں انہیں دوسرا بڑا ایورڈ ''راشٹریہ کبیر سمان'' دیا

گیا۔اس کے بعد بین الاقوامی امریکی کاٹھواری فاونڈیشن ایوارڈ بھی دیا گیا۔ بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ سے نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی کشمیری زبان کے وقار میں اضافہ ہوا۔

راہی صاحب کو میں بچپن سے جانتا ہوں کیونکہ اُن کا آبائی گھر ہمارے ہی علاقے میں تھا لیکن ان کی شخصیت کو 1997ء میں پہچان پایا جب ریاستی محکمہ اطلاعات جہاں میں کام کررہا تھا نے مجھے کشمیری رسالے کی ذمہ داریاں سونپ دی۔ اس سلسلے میں' میں نے کشمیری زبان کے تقریباً تمام ادیبوں, شاعروں اور قلمکاروں کے ساتھ رابطہ قایم کیا اور انہیں رسالے کے لئے اپنی نگارشات ارسال کرنے کی گزارش کی۔بعض لوگوں نے میری بات پر توجہ نہیں دی لیکن راہی صاحب نے اپنی مصروفیات کے باوجود مجھے وقت دیا اور اپنے قیمتی مشوروں سے سرفراز بھی کیا۔اس طرح'' آلَو'' کی صورت میں محکمہ اطلاعات کے کشمیری رسالہ کا جنم ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ رسالہ پرنٹنگ مواد اور عمدہ گیٹ اَپ کی وجہ سے ادبی حلقوں میں مقبول ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ریاست میں ناسازگار حالات کی وجہ سے تمام ادبی، علمی اور ثقافتی سرگرمیاں ٹھپ ہو چکی تھیں۔راہی صاحب نے پہلے شمارے کے لئے' ریشہ' نام کی اپنی نظم ارسال کی جس سے'' آلَو'' کی قدر بڑھ گئی۔انہیں یہ شمارہ بہت پسند آیا اور اس کے لئے لگاتار لکھتے رہے اور شاید ہی کوئی ایسا شمارہ چھپ چکا ہو جس میں راہی کا کلام، مضمون یا کوئی ذکر نہ ہو۔یہ بات محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر امر مالموہی لکھتے ہیں کہ'' آلَو'' رسالہ نے راہی کو مسلسل لکھنے کے لئے کسی حد تک مجبور کیا ہے۔اپنی شاعری کے علاوہ راہی صاحب نے اس رسالے کے لئے کئی پُر مغز مضامین اور غور طلب مقالے بھی لکھے۔اس طرح'' آلو'' قلیل عرصے میں بامِ عروج تک پہنچ گیا۔اس کا ایک خصوصی شمارہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ کشمیری میں حوالہ جاتی کتب میں شامل کیا

گیا۔ جن لوگوں نے ابتداء میں رسالہ کو اہمیت نہیں دی بعد میں وہی لوگ اپنی نگارشات چھاپنے اور رسالہ حاصل کرنے کے لئے میلوں سفر کرنے لگے۔رسالہ کا معیار اور اسے پُرکشش بنانے کے لئے راہی صاحب نے وقت وقت پر میری رہنمائی کی اور یہ اُن کا بڑھاپن تھا کہ مصروفیات کے باوجود وہ میرے لئے وقت نکالتے تھے۔ اپنا قیمتی وقت نکالنے کے پیچھے دراصل ان کے اس جذبہ کا عمل دخل تھا کہ '' آلوٗ'' کی صورت میں کشمیری زبان کے لئے جو سٹیج کھڑا ہوا تھا وہ قائم ودائم رہے۔

راہی صاحب کے ساتھ تقریباً 25 سال تک میرا رابطہ رہا ہے جس کی وجہ سے مجھے ان کی ذاتی زندگی سے بھی واقفیت حاصل ہے انہوں نے مجھے اپنی ذاتی زندگی کے کئی دلچسپ واقعات سے بھی روشناس کیا۔اتنا بڑا نام ہونے کے باوجود وہ اپنی زندگی بڑی سادگی سے گزارتے تھے۔ جہاں میں نے انہیں گھریلوں کاموں میں مصروف پایا وہاں صحن میں پھولوں کی کیاریوں کو سنبھالنے کے علاوہ سبزی اُگانے کے لئے زمین تیار کرنے میں اپنی نصف بہتر کا ہاتھ بٹاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆

......سید سعدالدین سعدیؔ

عالم واستاد وشاعر ماہرِ تعلیم تھے
(منظوم خراج عقیدت)

حسرتا عالم ہوا پھر باعثِ رنج و ملال
پھر ہوا حکم ِاجل جاری بہ حکمِ ذوالجلال
یعنی مشہورِ زماں اہلِ ادب ،اہلِ قلم
نازشِ شعروسخن ،عالمِ شیریں مقال
حضرتِ رحمٰن راہیؔ چھوڑ کر شہرِ سخن
چل دیئے ملکِ عدم کو، کر گئے ہیں انتقال
یہ خبر جو دفعتاً آئی ہوا کے دوش پر
حلقۂ علم و ادب یہ ہو گیا غم سے نڈھال
عزت وشہرت مقدر میں لکھی تھی بے حساب
پھر لکھا کلکِ ازل نے سانحۂ ارتحال
عالم و استاد و شاعر ماہرِ تعلیم تھے
نظم میں یکتا سخنور، نثر میں تھے با کمال
ہر سخن میں آپ کا اک الگ اسلوب تھا
اپنے ہم عصروں میں یوں ممتاز تھے بے قیل وقال

ہائے وہ ان کا تبسم اور اعجازِ کلام
خندہ پیشانی سے کرتے ہر کسی کا استقبال
سادگی، صدق و شرافت میں کوئی ثانی نہ تھا
کبر اور نخوت سے ہرگز تھا نہ کوئی قیل و قال
پیکر علم و ادب تھے، مالکِ ذہنِ رسا
فکر وفن سے رات دن رہتا تھا ان کو اشتغال
گو خداوندِ سخن محوِ گویائی رہے
یوں کھلے شعر و سخن میں جوہرِ فکر وخیال
آپ کے باعث ادب کو جو ملا بامِ عروج
مرتبہ ایسا ہے ملنا تا قیامت اب محال
محفلِ احباب سعدیؔ ہر طرف ہے سوگوار
یارب اغفرلنا مانگ اب بے قیل و قال

☆☆☆

......پروفیسر رحمٰن راہیؔ

مترجم ......ڈاکٹر ستیش ول

رحمان راہی کی مٹھی بھر کشمیری نظموں کا ترجمہ

جیسے ایک نظم

ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقان کا'

......غالبؔ

لِکھا ہے:

یہاں ایک الگ ہی دنیا کا احساس ہوتا ہے

نہ وہ فصیلِ کوہ، نہ ہانپتے ہوئے پہاڑی جھرنے؛

ہر سُو ریت

ہر دِن دھوپ

گُندمی رنگت والے قدآور لوگ،

سفید لمبے چوغے، شرعی شلوار جیسا پہناوا

عربی بولتے؛

بس کا انتظار کرتے جو من میں آئے تو

سڑک کنارے بچھا دیں چادر

اور ہو جائیں باتوں میں مست
سڑکیں تراشی ہوئیں، سجی سنوری
گھر بھی عالی شان،
ہوا تیز چلتی ہے تو کچرے میں پڑی گندی تھیلیاں
ہر دِن سرِ شام آسمان میں
کوؤں کی طرح اِدھر اُدھر اُڑتی پھرتی

چیزیں بڑی مشکل سے ملتی ہیں،
ہاں، لیکن بنا ملاوٹ--
تیل زیتون کا، ڈریسڈ چکن کھال کے ساتھ،

دودھ خالص دودھ
اور پنیر کا
ہر ٹکڑا کھانے لائق
ہم دونوں بالکل صحیح سلامت ہیں
دونوں کی اپنی اپنی ڈیوٹی
اسپتال ہمارا قابلِ دید
میرے کارڈیالوجی وارڈ میں
طرح طرح کے مریض--
کاروں کو کچھ جہاز کی طرح اُڑاتے
اور کچھ خرسوار؛
آپ کی بہو یہاں بھی کتابوں میں اُلجھی ہوئی ہے

اُس کی لائبریری جیسے آسمان چھو لے گی،
کہتی ہے:
جدید انگریزی، اطالوی، فرانسیسی ادب پر
یہ کتابوں کے ڈھیر......کاش ابّا جی یہاں ہوتے!
ہم ہر دِن صبح سیر کو جاتے، شام کو ویڈیو؛
ہمسائے ہیں مشرق مغرب سبھی اطراف سے آئے ہوئے
وہ ہمارے مہمان، ہم اُن کے!
پتہ ہی نہیں چلتا دِن کا؛
ہم بالکل اچھے ہیں، خیریت سے
پرسوں ہی بینک اکاونٹ بھی کھولا

آپ کبھی پریشان نہ ہونا
میں آپ کے سہارے کی لاٹھی ہوں؛
ہمیں بس آپ کی دعائے خیر ملتی رہے

دستی خط
بمبئی سے پوسٹ ہوا ہے--
سُنتی ہو......مبارک ہو تُم کو
لکھا ہے:
طالی کا بیٹا ہوا ہے
آج آٹھواں دِن ہے
(مانو کہ چودھواں پندرہواں دِن)،

نرسنگ ہوم میں صرف دو رات ٹھہرائی گئیں
یہاں اگر لمحہ بھر کے لئے بھی چلی جائے بجلی
شش جہات میں سب کچھ جل بُجھ جائے گا؛
(سنو، تم بے قرار کیوں ہو؟
زبان کے نیچے چھوٹی سی گولی رکھا کرو)؛
ہم آج کل سب کچھ بھُلا بیٹھے ہیں--
صبح کی سیر، شام کی ویڈیو؛
(ہمسایوں کو کل ہی دعوت پہ بُلانا پڑا ہے)

کہتا ہے:
بینک پر جانا
اور تیسری قسط نکال لانا
کِسی صورت پریشاں نہیں ہونا
لِکھا ہے:
مفصل خط جلد ملے گا
ایک ماہ کے بچّے کی فوٹو دیکھ لینا
اَمی ہی بتائیں گی کہ صورت کس سے ملتی ہے
آپ صرف دو چار نام بھیج دینا
آج کل کے جیسے، پلیز!
ویسے وہ بڑا کیوٹ ہے
(چُلبلا اور چالاک)

جیسے ابھی بول اٹھے گا
ہاں مگر ہنستے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں،

نہ جانے کیوں؟
(کہاں کھو گئی تُم؟
چھوڑو، آج رہنے دو چولہے کی لِپائی)

☆

ٹیلی فون کیا تھا--
مجھ سے بات کر لیتا
تُم ماں ہو اُس کی، تمہاری آواز سُننی تھی اُسے
بہن سے خیر خبر پوچھ لیتا؛
سمندر پار لیبیا
پہاڑوں سے گھرا کشمیر
کیا پتہ اب نمبر لگے گا کہ نہیں؟
تب بیٹی دفتر گئی تھی
تمہیں رشتہ داروں کے یہاں تحفے دینے کی مجبوری،

میں ایک ادبی محفل میں نازُک خیال کے موتی پِرو رہا تھا--
''کشمیری شعرا اور اظہارِ عشق''؛
قصائیوں کا نوکر ملا:

حضرت میں دوڑتا دوڑتا آیا تھا،
دروازے پر تالا پڑا تھا
اور آنگن کے اندر سے کُتے کے بھونکنے کی ڈراونی سی آواز آرہی تھی

☆

عید کارڑ دیکھو؛
یہ رہے فوٹو--
آپ کی بہو کار چلا رہی ہے،
یہ ہے آپ کا چھوٹو......مطلب ڈاکٹر صاحب،
شاید اپنے بیٹے کو باغ میں ٹہلا رہا ہے،
(فوٹو ذرا بڑا اور تھوڑا اور صاف ہوتا)؛
(عینک بدل دینی چاہیے،
بڑے اسپتال میں ملے گا ہی کوئی نہ کوئی
بیٹے کا جانکار)

لِکھا ہے:
بینک کا ایک ڈریفٹ کہتے ہیں مِس پلیس ہو گیا تھا
قسط جلدی ہی پہنچ جائے گی؛
یہاں بازار بے حد مہنگا ہو رہا ہے
مگر چیزیں ملتی ہیں دھکم پیل کے بغیر--
کورین ریڈی میڈ، فرنیچر پر فیوفز
جاپانی، ہر کوئی چیز؛

(سنو ذرا وہ اِن ہیلر پکڑا دو)

کہتا ہے:
کچھ دِن پہلے نیو یارک گیا تھا
(امریکہ گیا تھا بیٹا)،
کر رہا ہوں جدوجہد
واپس لوٹ کر اُسی کیچڑ خانے میں تو نہیں رہیں گے نا،

اور لِکھا ہے:
(تمہیں نیند آ گئی کیا؟)
میری چِٹھی بھی مل گئی ہے اُسے

لِکھا ہے:
ہم تو صبح شام آپ ہی کی باتیں کر رہے ہوتے ہیں،
آپ بے فکر رہنا
ہم تو آپ کے لئے ہی یہاں آئے ہیں
(اوہ ہو......پھر برف باری شروع ہو گئی)

(سنو......وہ میانجی تو نہیں آیا تھا؟)

☆

تار آیا ہے:
ہم نے پھر دو سال کا کنٹریکٹ کر لیا ہے
(اِس کانگڑی میں تو آج آگ ہی نہیں ہے)
(میری والی بھی بُجھ سی گئی ہے)؛

لِکھا ہے:
ایک اچھا سا گروپ فوٹو......رنگین؛
آپ کوئی غم نہ کریں
(اے خدایا رحم،
تیلِ خاکی راشن گھاٹ پر اب آ گیا ہوگا!)

☆

خواب میں دیکھا--
ریگستان کے بیچوں بیچ شُتر مرغ دوڑتا ہُوا
آنکھوں میں مدھم ہوتی سمندری کراہ
بالوں میں ہَوا انڈِ ھال
ملبوسات دھوپ میں اپنے دھاگے سیاہ کرا کے لوٹے
دروازہ اچانک تکلے سے باہر نکل آیا
استقبال کے لئے نکل آئے کُتّے کا ٹرک کے نیچے کچومر نکل گیا

عربی بول رہا تھا کہ کشمیری
کچھ ڈھونڈ سا رہا تھا
سبھی نے اُس سے کہا
شام تک ضرور آئیں گے
جوتوں کے تسمے دانتوں سے کاٹ لئے
اور جوتے کو برآمدے سے دور پھینک دیا

ایک جوتے کے تلوے سے چپکی ہوئی تھیں
سنہری سی کرنیں......میلی کچیلی
میں نے ہانپتے ہانپتے ہی اُسے بار بار پُکارا تھا

وہ گھاس سے گھِرے باغ کے بیچوں بیچ
ننگے پیر کھڑا تھا
کالا پیراہن سا پہنے
اونٹ سا کھڑا
مکان کی چھت کے جھروکے سے نکلا
شش و پنج میں پڑا ابرف کا گالہ دیکھ رہا
ہائے افسوس!

☆☆☆

……پروفیسر رحمٰن راہیؔ

مترجم ……ڈاکٹر ستیش ومل

شیر اور سمندر

دودھ چولہے پر ہے
آگ تیز ہوتی جاتی ہے
یا تو چور کو پھانسی پر لٹکائیں گے
یا وہ بچ نکلے گا
یہ وقت اور یہ موسم، کہاں جاؤ گے؟
یہیں بیٹھ جاؤ
میرے نزدیک

نیم شب جب کھڑکی بند تھی
دروازے بھی بند
کالے کوؤں نے
کوہساروں کے اوپر بھری اُڑان

بہت لمبی سڑک
قدموں کے نشانوں سے پھوٹتا زہر--
ہماری بھی ماں
ہمارے بھی والد
تم نے بھی پتوں میں سے لَو دیکھی
مجھے بھی اُس نقشِ پا نے ڈسا
قافلہ نکلا، دوڑا-- کہرا، غبار
کبھی کبھی میرے گھوڑے کی ٹاپوں میں کوندی بجلی
کبھی کبھی تیری اونٹنی نے

میرے کھجور کے تنوں کو چھیلا
یہ وقت اور یہ موسم، کہاں جاؤ گے
شیر کی یال اُڑ رہی ہے
سمندر شب دہاڑ رہا ہے
ابھی یہیں بیٹھ جاؤ
میرے نزدیک

یہیں چلائیں کیا؟ کٹھ پھوڑوے کو ڈھونڈ نکالیں
سر پر نہیں ٹِکتا ہے دوپٹہ
ٹِکائے رکھ
آنسوؤں کی بوندوں سے کھلتی ہے ہنسی

کِھلائے جا
حبشی طائرسرِ گُلِ خردل کے بدلے
برف سے لطف اندوز ہو رہے ہیں

ایک......ایک......ایک
یہیں قیام کرو
میرے نزدیک!
دودھ چولہے پر ہے
آگ تیز ہوتی جاتی ہے

☆☆☆

……پروفیسر رحمٰن راہیؔ

مترجم ……ڈاکٹر ستیش ومل

بات میں بات

فضا
اندھیرے کنوے میں خامشی اوڑھے ایک سنگِ سفید
ہوا
کھمبے پر ریشمی رسّی کی اُلجھی گانٹھ
کریوا
زبانِ خار نیلی پڑی
صدا
گھوڑی سے آتی شیرنی کو بُو

ہَوس
سانپ سیب کی سُرخی چاٹ رہا

قدم
دُھنکی تلے کی روئی کا لوتھڑا کھولتے آسمانی جہات
سوال
خون کا اُبال کیسے پیدا کرے گلاب؟
جواب
قدر تعویز کی، چمکے الماس کی دھار
اَزل
کانٹوں بھری شاخ پر کھُلی دھاگے کی گُتھّی
ابد
موت، وجد، دِلکش دلآویز رقص
یہ لمحہ ہے کہ ہوا کی لچک دریچے میں
یہ لمحہ ہے کہ فولاد کو کاٹ کر گزرے گی پتّی پھول کی

بھر آئی زمین سے پھوٹ پڑا ایک تاروں بھرا آکاش
ہر راستہ چیخا چلایا،
''ت۔نَ۔نا۔یا۔ہُو......ت۔نَ۔نا۔یا۔ہُو''
ہاتھی کی چھلک آئیں آنکھیں، انگوری بیل رَس سے ہوئی تر
کُتّے بھونکے
چبھا ڈالے چکوروں نے پتّھر کے ٹکڑے
'اُس پُر جوش ندی میں ہانپتا ہوا چراغ'
پانچوں بحور کی لہریں ہوئیں یاقوت

کھینچنے سے بید کا پنجرہ ٹوٹ گیا
اک دُدھیلی ہنسی نیلے آسمان میں اپنی اُڑان پر اِتراتی
نجات کی گھڑی
شب کی دھار
آج کی ہنسی، اَبرُو کا پسینہ

کل کے چشمے کے پاس کا ٹھنڈا سایہ
شیر کی گرج، سمندر کا کنارے کاٹ لینا
شبنم کا ہانپنا
سب ملا کر
پتّھر سے نکال لیتے ہیرا

☆☆☆

……پروفیسر رحمٰن راہیؔ

مترجم……ڈاکٹر ستیش ومل

اُسی کمرے میں

اُسی کمرے میں
جہاں مجھے اتنے دِن ہو گئے تھے
بستر میں ٹھنڈ جھیلتے
دیکھی میں نے دِن ڈھلتے وقت

چپ چاپ
سورج کی ایک کرن
دروازے کی اوٹ میں

فرش پر
کٹے پھٹے جوتے کے پھسپھسے پھندے
روشن کرتے ہوئے
سینڈلی کانٹوں کی گرد میں اٹے ڈھانچے
جگمگ جگمگ کرتے

☆

......پروفیسر رحمٰن راہیؔ

مترجم ......ڈاکٹر ستیش ومل

ہوا

ساری جنگیں نیم ذبح حالت میں چھوڑ کر
ہر سرحد پر کٹا پھٹا سَر
سِرہانے اپنے سمیٹا اور میں نے مُشاہدہ کیا:
اطراف اپنے دھول سے اٹے کندھے جھاڑ رہے
گھڑی کی ٹِک ٹِک
گھڑی کے قلب کی گہرائیوں کی تہہ تک اُتری
پاتال کا سانپ عرش کو چاٹ رہا
بوڑھے کُتے کی آنکھ میں کھِلا معصوم نرِگس ؛

جو سنگ سرہانے تھا میرے، وہ جھاگ میں نہایا
جھاگ ایک چکر میں گھوما
اور میں بھنور میں رقصاں ہُوا
اِسی رقص میں تہہ کی کھوج میں اُترا

اُترتے اُترتے پھر اُسی بھیڑ تک آ پہنچا
جہاں آوازوں کی لاشوں کے بُت
سائیوں کے ملبے تلے غائب ہو جاتے؛

نہ کوئی زیتون کا کوئی طائر ہے
نہ کمر میں چمک رہی کوئی شمشیر ہی
یہاں کسے پُکاروں؟
یا طیش؟
میرا بھی نام سکندر، میں بھی دارا
یا بے چہرہ سوئی ہَوا

☆☆☆

.......پروفیسر رحمٰن راہیؔ

مترجم ....ڈاکٹر ستیش ومل

حمد

آنکھیں جب کھولیں
آس پاس دیکھا
بھبک رہا تھا لامحدود صحرا
ہزاروں نہیں لاکھوں برسوں سے
بے منزل، لاتعلق، دھدھکتی آندھی میں
سمیٹ رہا اپنی پریشانی
گرگٹ کو اپنے ہونے کی آزمائش سے گزرنا پڑا بہرصورت
زبان پر بھی اُبھر آیا کانٹا

شِکم کے سائے سے بھی لَو جنمی
''کاش کہ دھند ہی پردہ کرتی
کاش کہ شبنم کی بوند ہی روشن ہوتی

کاش کہ کوئی کِرم ہی لیتا کروٹ!''
گرگٹ کو اپنے ہونے کی آزمائش سے گُزرنا پڑا
اپنے آس پاس کو آنکھوں میں سمیٹ کر
اپنے ہی رُخسار کے پسینے کی قیمت جان کر
زبان کا تشنہ خار تر کر کے
اپنی ہی داڑھوں سے اپنی کینچل اُتار کر
خوراک بنائی--
حمد کہ اِس نابود میں بھی ہے بود کا قیام؛
کوئی محروم نہیں رہتا!

☆☆☆

……پروفیسر رحمٰن راہیؔ

مترجم……ڈاکٹر ستیش ومل

قعرِ دریا سلسبیل

قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

(غالبؔ)

یہ آگ بھڑکتی رہے، تشنگی بڑھتی رہے
گُلاب تیری سانسیں، شراب ہیں آنکھیں

تخمینہ لگا پائے ہو کیا اُس کریوے پر
میں نے ازل سے ابد تک کتنی ریت اُنگلیوں سے کھنگالی
میری بے کل نظروں نے دیا وہ سیاہ پیغام:
بہت بے اعتبار ہے یہ ابد کا ساگر!

مجھے بھی اِسی طرح ان جانے میں چھلا گیا
کھیل کھیل میں سیاہ غبار نے مجھے گھیر لیا
پتہ نہ تھا کہ گلے لگا کر

بُلبُل ہی ہُد ہُد بن کر کُریدڈالے گی مجھ کو
خوش حال ہرن ایک گھنے جنگل میں
دھوپ میں پھُدکتا اور سایوں سے کھیلتا
نظر نے اُس کو چھلا کہ چشمے کے پانی نے پوچھا:
کون ہے تو اور حیراں نظروں سے کیا دیکھ رہا ہے؟

دل نے سوالوں کی نوکیں دِکھلائیں
(چہرہ مُرجھایا ہُوا، جوابوں کی آنکھیں خالی)
یہ بہار بیلا کس کی دعوت پر ہے آئی؟
کہو کہ آفتاب و ماہتاب کا رشتہ کیا؟

بھوکے کیڑے کو گلابی کوٹھری کس نے عطا کی
کہاں گیا تھا اِک لمحے میں شاہِ سکندر؟

پُر جوش سمندر اور ایک کشتی آوارہ
انجان مانجھی کی سوچوں پر دُھند
لہر جو اٹھی وہ منہ کھولے
بنا جو بُلبلا، بنتے ہی پھوٹا

ضِدی بچّے کا مٹّی کا کھلونا ٹوٹ گیا
در و دیوار نے ٹھہا کے لگائے
گردن میں پھانس لگی، آنکھیں پھوٹ آئیں
پھر نہ ماں ہی ملی اور نہ باپ کو ہی دیکھا

اِدھر نا امیدی، ایک جاڑا اور ویرانی سی چھائی
نہ کوئی موذّن رات کو روشن کرتا
نہ کوئی دیوتا کسی مورتی میں بس جاتا
دعا نہ دل میں، نہ آنکھ میں اب کوئی توقع

جنگلی ہرن کریوے پر کچھ کھوجتا سا
نہ دھوپ میں کوئی گرمی، نہ سائے میں کوئی ٹھنڈک
نہ اُگا کوئی گھاس کا تنکا، نہ کوئی بڑا کانٹا
معلق ہے چہار سُو اب گردِ تشنہ

اسی اندھیرے میں تم نے پھر سے جنم لیا
قلب کی وسعت تمہاری دیکھی تو جان پایا
تم نے جیسے وہی سیب شاخ سے اُتارا
میں نے جیسے وہی خدائی نذر کی

نہ تھا یہ طوفان نوحؑ کا سا
کہ ہم کشتی میں پار جاتے
پُلِ صراط جیسے پار کرنا پڑا، اکیلے
نہ تیرے دِل میں کوئی کدورت
نہ میرے حصّے کوئی شکایت

کھیل کھیل میں یہ ہم آج کہاں پہنچ گئے
دِل میں میرے جنم لے رہی ہے یہ بہار کی چہچہاہٹ

وہ باغِ جنت بے داغ فرشتوں کو ہی مبارک
میرے لئے تیری سیب جیسی سُرخ رنگت ہے کافی
اب کوئی رُکاوٹ نہیں، اب تو دیکھ بے خوف ہو کر
ازل مہرباں ہوا ہے مجھ پر، ابد ہے تابع تمہارے دیکھو
قریب تھوڑا سا اور ہو لے کہ سینہ سینے کا راز داں ہو

کہ عشق کا دم، دل سوزِ خدائی؛
یہ آگ بڑھکے کہ پیاس پھیلے
گلاب سانسیں ہیں یہ تمہاری
شراب ہیں یہ تمہاری آنکھیں

☆☆☆

......ڈاکٹر عرفان عالم

داستانِ گلستان

(تیسری اور آخری قسط)

کھانا کھانے کے بعد ہم سامنے بنے خوش نما باغ کی جانب گئے جہاں ''بابا طاہر عریاں'' کی آرام گاہ ہے۔ اندر جاتے وقت باغ میں دائیں جانب ''امام زادہ عبداللہ'' کا مقبرہ ہے۔ وہاں پر لوگ نماز ادا کر رہے تھے۔ اس مقبرے کے ساتھ ہی وہاں پر وضو خانے اور بیت الخلا کا بھی اچھا انتظام تھا۔ ہم نے یہاں وضو کیا اور نماز ادا کی۔ اس کے بعد ہم نے ''بابا طاہر عریاں'' کے مزار پر حاضری دی۔ یہ مقبرہ بڑی ہی خوبصورتی سے بنایا گیا ہے۔ مقبرے کے اندر 'عارف ربانی ،حکیم صمدانی ،طاہر ہمدانی المعروف بابا طاہر عریاں' کی زندگی اور ادبی خدمات کے حوالے سے چند ایک تختیاں نصب کی گئی ہیں۔

'بابا طاہر عریاں' کے مزار پر فاتح خوانی کے بعد ہم 'حکیم ابنِ سینا' کے مقبرے پر گئے جہاں ہم نے اپنی گاڑی کھڑی کی' وہاں پر اُوپر کی جانب ایک بڑی تختی پر لکھا ہوا تھا ''شرکت مخابراتِ ایران، منطقہ ہمدان''

(Telecomunication Company of Hamadan ,Iran)۔ اِس تختی کے نیچے ایک اور چھوٹی سی تختی جو بالکل ہماری گاڑی کے بالمقابل نظر آ رہی تھی اُس پر لکھا ہوا تھا ''کلیسا کیتھولک'' (Catholic Church)۔ اِس بات سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہمدان میں بھی عیسائی رہ رہے ہیں اور بالکل اسی کلیسا کے سامنے

سڑک کی دوسری طرف ''حکیم اِبن سینا'' کا مقبرہ تھا لیکن مقبرے پر حاضری سے پہلے ہماری نظر سامنے عجیب وغریب (Funny) پتلوں پر پڑی یا تو یہ پتلے کسی خاص چیز کی نمائندگی کرتے تھے یا کسی پر طنز کرنے کے لئے یہاں نصب کئے گئے تھے یا پھر محض لوگوں خاص کر بچوں کی دلچسپی اور تفریح کے لئے رکھے گئے تھے۔ یہاں پر ہم نے بھی شوقیہ چند ایک یادگاری تصویریں پتلوں کے ساتھ بنائیں۔

پتلوں یا بتوں کے حوالے سے میں یہاں یہ بات بتا تا چلوں کہ ایرانی جہاں اِس فن کے بڑے ہی دلدادہ نظر آتے ہیں وہیں اب یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ ثقافت کے ساتھ ساتھ مذہب کا بھی حصہ بنتا جا رہا ہے۔ میں نے وہاں پر کئی ایک مسجدوں میں بھی آیت اللہ خمینی اور آیت اللہ خامنائی کی تصویریں دیکھی۔ اِس کے علاوہ ایران میں اکثر جگہوں پر سنگِ مرمر یا پھر سنگِ سیاہ سے مختلف اہم شخصیات کے صنم تراشے گئے ہیں۔ اِس طرح کے بُت آپ کو وسطی ایشیاء کے مختلف ممالک میں بھی نظر آئیں گے۔ حالانکہ آج کل یہ تصور پوری دنیا میں پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ دراصل ایرانی لوگ فن سنگ تراشی کے ذریعے اُن اعلیٰ شخصیات جنہوں نے سماج یا سماجی علوم میں نمائندہ کردار ادا کیا ہے' ان کے لئے بطور اظہارِ محبت ان کے مجسمے بنانا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ اظہارِ محبت اِن کی ثقافت کا حصہ بنتا گیا۔ حالانکہ یہ شخصیات کی ایسی کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں رکھتی تھیں کہ ان کی یاد میں پتھر کے بُت تراشے جائیں۔ ایسی شخصیات کا اپنا فلسفہ تو اِس کے عین برعکس اور برخلاف ہے۔ اس کے برعکس وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بنائی ہوئی راہ کو ہموار کر کے، آنے والی نسل کے لئے ایک نئی اور کارآمد راہ نکالی جائے۔

یہاں 'اِبن سینا' کے مزار پر بھی تقریباً 'شہرداری، ہمدان' نے 'ابن سینا' کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے مزار کے باہر سڑک کے کنارے سنگ سیاہ پر سنگ سفید کو

تراش کر کے اسے بوعلی سینا کی صورت دی گئی ہے۔ساتھ میں اِس بات کو بھی ظاہر کیا گیا ہے چونکہ بوعلی سیناعلم کے پیامبر ہیں۔اسلئے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بو علی سینا بغل میں ایک ہاتھ سے کتاب اُٹھائے ہوئے اور دوسرا ہاتھ کتاب پر رکھ کر عام لوگوں میں اِس بات کی تشہیر کی جارہی ہے کہ انہوں نے جو علم ہم تک پہنچایا ہے،اب ہم اس کے وارث ہیں اور ہمیں اس علم کی وراثت کو سنبھالنا ہی نہیں بلکہ اس کی تشکیل نو بھی کرنی لازمی ہے۔اگر بتوں سے اس طرح کی تشہیر کی جائے،تو یہ تشہیر کا ایک بہتر طریقہ کار ہے۔شیخ الرئیس ابوعلی الحسن بن عبداللہ بن سینا کے ''رسالتہ الزاوایا'' کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ'صفر(Zero)' کے تعلق سے اِن کے خیالات بالکل مختلف تھے۔اُن کے نزدیک صفر لا متناہی کا درجہ رکھتا ہے۔شاید انہوں نے یہ نظریہ ''لا'' سے لیا ہو۔جہاں تمام اصنام ٹوٹ پھوٹ کر ایک وحدت کے تصور کا اعلان کرتے ہیں۔اِسی طرح کئی ایک جگہ غالب کی یاد میں اُن کا بُت بھی نصب کیا گیا ہے۔لیکن غالب فرماتے ہیں:

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اِس کے بعد جوں ہی میں اندر داخل ہوا میرے سامنے ایک خوبصورت، دلکش اور وسیع وعریض باغ کھل گیا۔اِس باغ کے اندر داخل ہوتے ہی بالکل سامنے لوگوں کی توجہ مرکوز کرنے کے لئے ایک بڑی گول پھلواری بنائی گئی ہے۔اِس پھلواری میں مختلف اقسام کے پھول الگ الگ جگہوں پر مختلف انداز میں لگائے گئے تھے۔پھلواری نے اِس وسیع وعریض باغ کے حسن کو دوبالا کیا تھا۔پھولوں کے ساتھ ساتھ اس باغ میں مختلف اقسام کے سایہ دار درخت جیسے چنار اور کشمیری بید اور دیودار کے طرز کے درخت نظر آرہے تھے۔یہ باغ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔بچے کھیلنے میں مست

تھے۔لوگ بڑے ہی آرام سے دوپہر کی دھوپ میں اس روح پرور فضا میں دنیاداری سے بے پرواگپ شپ میں مصروفِ عمل تھے۔باغ میں ایک جگہ ایک نیا شادی شدہ جوڑا ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے آنے والے کل کے خواب بُن رہا تھا۔ ہر ایک خاندان نے نیچے سرسبز گھاس پر دری بھی بچھائی تھی اور دوپہر کا کھانا، چائے یا پھر دیگر مشروبات لے رہے تھے۔اِس موقع پر بھی کھانے پینے کی چیزوں کو بڑے ہی سلیقے سے سجایا گیا تھا۔اس خوبصورت باغ کے چاروں اطراف ایک کشادہ سڑک تھی جس پر چھوٹی بڑی گاڑیاں تیزی سے دوڑتی نظر آ رہی تھیں۔ چاروں اطراف سڑک (Ring Road) پر واقع ہونے کے باوجود اِس باغ کے اندر مختلف اقسام کے پرندوں کی چہچہاہٹ بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ایسا ہی منظر تھا جیسا کسی دور دیہات میں فجر کی نماز کے وقت پرندوں کی خوبصورت چہچہاہٹ صبح کے رنگوں میں ایک منفرد سماعت کا رنگ بھر دیتی ہے۔میں یہ سماع دیکھ کر دنگ رہ گیا کیونکہ ہمارے یہاں ایسے مناظر دیکھنے کے لئے سنیاس لینا لازمی ہے اور سنیاسی کو بھی یہ منظر صرف صبح کے وقت ہی نصیب ہوسکتا ہے۔پھر کیا وجہ ہے کہ اِس سڑک کے کنارے دوپہر کو بھی ایسے مناظر دستیاب تھے؟ میں جب تک وہاں رہا میں نے چاروں اطراف سے تیز دوڑتی گاڑیوں کے ہارن بجنے کی آواز کہیں سے بھی نہیں سنی اور جب تک راقم ایران میں رہا میں نے کسی بھی گاڑی والے کو بلا کسی جواز کے ہارن بجاتے نہیں دیکھا اور جب مجبوراً ہارن بجائی بھی جاتی ہے اس کی آواز بہت ہی مدھم اور دھیمی ہوتی ہے۔

یہاں پر بیٹھے لوگوں کے لباس اور بات چیت سے معلوم ہورہا تھا کہ اِن لوگوں کا تعلق مختلف جگہوں سے ہے، جیسے ایک خاندان کے مردوں نے بے حد کھلی شلوار پہن رکھی تھی۔اِس کے اوپر ایک سادہ قمیض اور اس پر موٹے کپڑے کا کمر بند پہنا ہوا تھا۔ ایک اور جگہ پر دوسرے خاندان سے وابستہ مرد ایسے ہی لباس میں نظر آ رہے

تھے۔لیکن اس خاندان کے مردوں نے گلے اور گردن پر بڑے ہی سلیقے سے چوڑا کپڑا باندھ رکھا تھا۔لیکن اِن دونوں خاندانوں کے ساتھ جو عورتیں بیٹھی تھیں اُن کے کپڑوں میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔انہوں نے ویسے ہی کپڑے پہن رکھے تھے جیسے ایرانی عورتیں پہنتی ہیں لیکن یہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ کم از کم ہمدان سے تعلق نہیں رکھتی ہیں۔کیونکہ میں نے پایا کہ زنانِ ہمدان اکثر بالوں میں ہلکے بھورے رنگ کا استعمال کرتی ہیں۔ پورے ایران میں جہاں جہاں بھی کسی خاندان سے ملاقات ہوئی ان میں جن کا تعلق ہمدان سے تھا میں نے یہ مشاہدہ کیا کہ اُن کی عورتوں نے ہلکا بھورا رنگ ہی بالوں میں لازماً لگایا تھا۔اِن میں سے کم عمر لڑکیوں نے بالوں کے آدھے حصے کو ہی رنگا تھا لیکن خصوصیت یہ تھی کہ ایک تو ہر صورت میں رنگ لگایا تھا، دوسرے یہ کہ صرف ہلکا بھورا ہی لگایا تھا۔اِس کے علاوہ کسی اور قسم کا رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔شاید یہ طریقہ کار ہمدان کے فیشن کا حصہ ہوسکتا ہے۔حالانکہ انہیں ایسا کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ایک تو یہ کہ ایران کی عورتوں کی خوبصورتی کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں۔دوم یہ کہ پورے ایران میں ہمدان کی عورتیں سب سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ بہرکیف ان کی بات چیت سے پتہ چل رہا تھا کہ یہ فارسی یا عربی نہیں بول رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ 'کردی' زبان بولتے تھے۔گویا ان کا تعلق ایران، عراق یا پھر ترکی کے 'کُرد' علاقوں سے تھا۔ایک اور جگہ ایک خاندان جن کے مردوں نے سراپا خوبصورت سفید چغے پہن رکھے تھے اور سر پر سفید گول ٹوپی پہنی تھی، جس پر ہلکے زرد رنگ سے تھوڑی سی نقش نگاری کی گئی تھی۔اِن کی عورتوں نے سراپا کشمیری عورتوں کی طرح سیاہ رنگ کا عبایا پہن رکھا تھا۔یہ عربی زبان میں بات چیت کر رہے تھے اور اِن کا تعلق عربستان کے ملکِ عمان سے تھا۔ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے یہ باغ مختلف تہذیبوں کا سنگم ہو۔

اس باغ کے ایک کونے پر ایک جگہ ایک ''چائے والا'' بڑے ہی سلیقے سے چائے، مٹھائیاں' بسکٹ اور دیگر مشروبات سیلانیوں کو فروخت کر رہا تھا۔ مجھے اِس چائے والے کی صفائی ستھرائی اور طریقہ نے بہت متاثر کیا۔ میں نے اس چائے والے کا بھرپور جائزہ لیا۔ ایران میں اس چائے والے کے ساتھ ساتھ تمام' چائے والوں'، 'نائی'، 'کفش دوزی'، 'سبزی والے'، 'نانوائی'، 'گوشت فروش' حالانکہ جنگل کی سڑک کے حاشیوں پر جنگلی شہتوت فروخت کرنے والے کے پاس بھی رقم براہ راست ادا کرنے کی سہولیات بذریعہ مشین دستیاب تھی۔ ایران کے اس سفر کے دوران میں نے دیکھا کہ ایران کی ننانوے فیصد آبادی ادائیگی رقم براہ راست انٹرنیٹ سہولیات کے ذریعہ ہی ادا کرتی ہے اور دکاندار کے پاس یہ سہولت بھی دستیاب ہے کہ اگر گاہک جاننا چاہئے کہ اس کے کھاتے میں کیا بچت ہے' وہ جانکاری بھی دکاندار سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ وہاں پر بین الاقوامی بینک کاری کی سہولیات دستیاب نہیں ہیں۔ اِس لئے سیاح اس طرح کی سہولیات سے مستفید نہیں ہو پارہے ہیں۔ لیکن اِس سفر کے دوران ہمارے ساتھ کینیڈا کی ایک خاتون مریم طاہری بھی سفر کر رہی تھی۔ وہ ہمیشہ رقم کی ادائیگی کے لئے 'کارڈ' کا ہی استعمال کر رہی تھی۔ شاید اس نے کسی مقامی جاننے والے سے 'ڈیبٹ کارڈ' حاصل کر کے اپنی سہولیات کے لئے رقم اسی میں ڈالی تھی اور اب بہ آسانی اس سہولیات سے مستفید ہو رہی تھی۔ لیکن یہ بات بتاتا چلوں کہ قومی سطح پر ایران کی بینک کاری کافی مضبوط ہے۔

آرام سے اس باغ میں بیٹھنے کے بعد ہم ''ابن سینا'' (Avicenna) کے مقبرے میں داخل ہوئے۔ یہاں پر بھی اندر جاتے ہوئے نہایت ہی شاندار منفرد اقسام کے گل بوٹے اور خوش نما گلپوش جھاڑیوں سے اِس جگہ کی تزئین کاری کی گئی تھی جس سے یہاں کا منظر مختلف نوعیت کی داستاں بیاں کر رہا تھا۔ کسی حد تک بہت ہی

ہلکے گلابی رنگ کی گلپوش جھاڑیوں کو دیکھتے ہی روح تازہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں مقبرے میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب یہاں کے معروف فارسی شاعر 'عارف غزنوی' (پیدائش 1880ء/ وفات 1933ء) مدفون ہیں۔اُن کی شاعری کا خاصا حصہ نظموں اور گیتوں پر مبنی ہے جس میں قومیت کی جھلک دور سے نظر آتی ہے۔اُن کی لکھی ہوئی نظم ''آزادی کا پیغام'' ایران میں بہت مشہور ہے۔مقبرے میں جانے سے پہلے ایک سیاہ تختی پر سفید سیاہی سے مقبرے کی تاریخ رقم کی گئی ہے کہ ''معماری آرمگاہ بو علی سینا'' کی تعمیر کے بارے میں اِس تختی پر لکھا گیا ہے کہ یہ مقبرہ اسی فن تعمیر کے مطابق تعمیر کیا گیا ہے جو فن مقبروں کی فن تعمیر کے لئے بوعلی سینا کے عہد میں رائج تھا۔مقبرے کی تعمیر قدیم اسلامی ایران ''گنبدِ قابوس'' (Ghabus Dome) کے طرز پر کی گئی ہے۔ اس مقبرے کا نقشہ جناب ''ہاوس ہینگ سی ہون'' (Sihun Mr.Hushang) نے ابن سینا کی ایک ہزارویں سالگرہ کے موقع پر تیار کیا اور اِسے 1951ء میں ایران کی ''انجمن برائے قومی میراث''
(Iranian Association of National Monuments) نے تعمیر کیا ہے۔ یہ مقبرہ اِبن سینا کے دوست ''جناب ابوسعید دخدوک'' کے گھر میں واقع ہے۔ جہاں ابن سینا نے بحیثیت مہمان ایک طویل عرصہ گزارا اور اسی لئے ان کے انتقال کے بعد انہیں یہی دفن کیا گیا۔

اس مقبرے میں ایک میوزیم بھی ہے جس میں سب سے پہلے ایک بند شیشے میں مقبرے کا ٹھوس نقشہ رکھا گیا ہے۔اس کے ساتھ ایک اور بند شیشے میں ابن سینا کی قبر کا کتبہ رکھا گیا ہے۔شاید پہلے یہ کتبہ قبر کی اصل جگہ پر تھا لیکن بعدازاں اسے وہاں سے ہٹایا گیا ہے۔ایران میں راقم نے اکثر قبروں کے اوپر اُونچے کتبے نہیں دیکھے۔ بلکہ قبریں بالکل ہموار ہیں اور اسی طرح اِن پر ہموار سنگ مرمر کے کتبے بچھائے گئے

ہیں۔اِسی طرح کا ہموار کتبہ ابن سینا کی قبر پر بچھایا گیا ہے۔اِس میوزیم کے مختلف حصے ہیں اور ہر حصے میں ابن سینا کے کیے گئے تجربات اور دریافات کے مختلف نمونے رکھے گئے ہیں۔ایک حصے میں مختلف قسم کی ادویات اور الگ الگ قسم کے جراحی آلات واوزار، فشارِخون اورخون یا کسی اور چیز کی جانچ (Test) کرنے کے مختلف آلات بھی نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں۔ جراحی اور جانچ وغیرہ کے یہ اوزار و آلات عصرحاضر کی جراحیوں اور دیگر طبی جانچ میں استعمال ہونے والے آلات سے کافی حد تک ملتے جلتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ابن سینا کی طبی تصانیف باالخصوص معروف طبی تصنیف ''کتاب القانون'' دنیا کی اکثر اہم زبانوں میں ترجمہ ہوکر شائع ہونے کے ساتھ ساتھ ایک طویل وقت تک،تقریباً بیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک مغرب کی اہم طبی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل رہی ہے۔میوزیم میں اکثر جگہوں پر ابن سینا اور اِس کی کتابوں سے لئے گئے کچھ اہم اقتباسات کی تصویریں بھی آویزاں رکھی گئی ہیں تاکہ ان کے کارناموں کی طرف آنے والے لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔ میوزیم میں ان اہم چیزوں کے ساتھ ساتھ بوعلی سینا کی مختلف تصانیف کے قلمی نسخے بھی دستیاب رکھے گئے ہیں۔ان تحریروں کے علاوہ ایک حصے میں ایک چھوٹے سے کتب خانے کی صورت میں ابن سینا کی لکھی گئی یا ان کے بارے میں لکھی گئی عصرِ حاضر میں شائع شدہ مختلف کتابیں نیز ان کتابوں کے مختلف زبانوں میں تراجم اس بات کی ترجمانی کررہے ہیں کہ ابن سینا کی تصانیف کی کتنی اہمیت وافادیت ہے۔

ابن سینا 980ء ایران کے ایک گاؤں ''افنشہ'' میں پیدا ہوئے۔بچپن میں ہی ان کے والدین بخارا ازبکستان چلے گئے جہاں ان کے والد سلطان نوح بن منصور السامانی کی ریاست سے وابستہ ہوگئے۔بچپن ہی سے ذہین تھے۔دس سال کی عمر میں مکمل قرآن حفظ کیا۔ اِس کے بعد فقہ، ادب، فلسفہ اور طبی علوم میں بھی کمالات

دکھانے لگے۔بتایا جاتا ہے کہ اِسی دوران سلطان نوح بن منصور ایک ایسے مرض میں مبتلا ہوئے کہ اِن کا علاج اُس وقت کے معروف معالجین بھی نہ کر سکے لیکن ابن سینا نے سلطان کا علاج کیا اور سلطان صحت یاب ہوگئے۔اس وقت ابنِ سینا کی عمر 18 سال تھی۔اس بات سے خوش ہوکر سلطان نے بطورِ انعام ان کے لئے ایک کتب خانہ بنوایا لیکن وہ صرف دوسال تک ہی اس کتب خانہ کے ساتھ جڑے رہے۔چونکہ سفر میں دلچسپی زیادہ رکھتے تھے۔یوں وہ بیس سال کی عمر میں بخارا سے خوازرم چلے گئے جہاں وہ تقریباً دس سال تک رہے۔خوازرم کے بعد مختلف جگہوں جیسے جرجان، بلخ، ناسا، گورگان، طوس، خاگان، رَے، ہمدان، اصفہان وغیرہ میں باقی ماندہ زندگی گزاری۔1037ء کو 57 سال کی مختصر عمر میں کارہائے نمایاں انجام دے کے بوعلی سینا کا انتقال ہمدان میں ہوا۔

ابن سینا نے جو کتابیں تحریر کی ان میں ریاضی کی کتابیں ''رسالہ الزاویہ''، ''مختصر اقلیدس''، ''مختصر الارتماطیقی''، ''مختصر علم الھیئہ''، ''مختصر المجسطی''، ''رسالہ فی بیان علہ قیام الارض فی وسط السماء''۔ریاضی کے علاوہ انہوں نے طب میں بھی کئی کتابیں تحریر کی جن میں مشہور و معروف طبی تصنیف ''کتاب القانون''، ''کتاب الادویہ القلبیہ''، ''کتاب دفع المضار الکلیہ عن الابدان الانسانیہ''، ''کتاب القولنج''، ''رسالہ فی سیاسہ البدن وفضائل الشراب''، ''رسالہ فی تشریح الاعضاء''، ''رسالہ فی الفصد''، ''رسالہ فی الاغذیہ والادویہ''، ''ارجوزہ فی التشریح''، ''ارجوزہ المجربات فی الطب''، ''الالفیہ الطبیہ''۔اِس کے علاوہ انہوں نے ساز اور موسیقی کے حوالے سے بھی چند ایک مقالے لکھے ہیں، جن میں ''مقالہ جامع علم الموسیقی''، ''مقالہ الموسیقی'' اور ''مقالہ فی الموسیقی'' بھی شامل ہیں۔ان کتابوں سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ابن سینا نے انسانیت کی بقاء کے لئے کس قدر تن دہی سے کام

کرتے ہوئے بالخصوص اسلام اور بالعموم عرضِ ایران کا نام پوری دنیا میں روشن کیا۔

یہاں سے نکلنے کے بعد ہم ''دانش گاہ بوعلی سینا'' Bu Ali Sina (University) گئے جو کہ بالکل قریب میں ہی واقع ہے۔میں نے ہندوستان کی بہت ساری جامعات دیکھی ہیں لیکن ارضی تزئین کاری (Landscape) کے اعتبار سے مجھے کوئی بھی جامعہ ''کشمیر یونیورسٹی'' کے برابر نظر نہیں آرہی تھی۔لیکن ''دانش گاہ بو علی سینا'' کا اِس سلسلے میں کوئی جواب نہیں۔ یہ یونیورسٹی بہت ہی کشادہ، دلفریب منظر نگاری اور طرزِ تعمیر کے اعتبار سے ''کشمیر یونیورسٹی'' سے بھی خوبصورت ہے۔ یہاں پر بھی مرکزی دروازے کے سامنے سنگ سیاہ کو تراش کر کے حکیم بوعلی سینا کا مجسمہ بنایا گیا ہے۔ یہ قدرے اسی مجسمے سے مشابہت رکھتا ہے، جو' شہر دارِ ہمدان' نے ابن سینا کے مقبرے کے باہر نصب کیا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ دانشگاہ کے مجسمہ میں ابن سینا کو بیٹھ کر کتاب پر کچھ تحریر کرتے دکھایا گیا ہے۔اِس کا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ دانش گاہ میں حصول تعلیم ،صبر وتحمل، وقت' محنت ومشقت کے ساتھ ساتھ ذمہ داری کی مانگ بھی کرتا ہے۔

یہاں سے نکلنے کے بعد ہم دانش گاہ سے کچھ ہی دوری پر واقع ایک سیاحتی گاؤں ''گنج نامہ'' گئے۔گنج نامہ جاتے وقت یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہم کشمیر میں گلمرگ کے راستوں سے گزر رہے ہوں۔ راستہ بہت ہی کشادہ اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔راستے کے دائیں جانب پہاڑ اور اِسی پہاڑ کے دامن میں یہ راستہ بنایا گیا ہے اور راستے کے بائیں جانب سے مختلف اقسام کے درخت جن میں خصوصاً اور زیادہ تعداد میں سفیدے کے اونچے درختوں کی ایک نہ ختم ہونی والی قطار اوران درختوں کے بیچ میں کہیں سے ایک اور پہاڑی سلسلہ بھی نظر آ رہا تھا۔سفیدے کے درختوں کی بڑی تعداد کو دیکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ یہاں لوگوں کو بھی ان درختوں کی وجہ سے مارچ اور

اپریل کے مہینے میں زبردست ماحولیاتی بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ کیونکہ کشمیر میں سفیدے کے درختوں سے روئی نکلتی ہے جسے نظام تنفس کے مختلف قسم کے امراض جیسے سانس لینے میں پریشانی نیز نزلہ، زکام، خارش (Allergies) جیسی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اِس کے علاوہ چلنے پھرنے میں بھی کافی دشورای کا سامنا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے سیاحتی رہنما جناب محمد خیریان سے اس بابت پوچھا کہ کیا یہاں بھی آپ کو اس سلسلے میں ایسے ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا' یہاں پر ایسا کوئی بھی مسئلہ اس سلسلے میں سامنے نہیں آیا ہے۔ لیکن ایک بات مجھے یہ نظر آئی کہ وہاں کے سفیدے ہمارے یہاں کے مقامی سفیدوں کی مانند ہی نظر آ رہے تھے۔ ایران میں مجھے کوئی روسی سفیدہ نظر نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے کہ راقم ان علاقوں سے نہیں گزرا ہو جہاں روسی سفیدے لگائے گئے ہوں یا ہوسکتا ہے کہ وہاں کی حکومت نے روسی سفیدے اسی وجہ سے لگانے کی اجازت نہیں دی ہو کہ انہوں نے اس بارے میں پہلے ہی تحقیق کی ہو کہ اسے بعدازاں ماحولیات پر بُرے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔

خیر ہم جلد ہی ایک مختصر وقت میں دانش گاہ بوعلی سینا سے ''گنج نامہ'' پہنچ گئے۔ کشمیر کے ''گلمرگ'' میں کشادہ مرگ زار ہیں اور برف پوش پہاڑ ہیں۔ اِس کے برعکس ''گنج نامہ'' میں پتھریلے اور اونچے پہاڑ ہیں۔ باقی دونوں جگہوں پر قدرے یکسانیت نظر آ رہی ہے۔ جیسے گنج نامہ میں بھی لوہے کی رسیوں پر مشین کے ذریعے چلنے والی 'کار کیبل' کی وہی سہولیات دستیاب ہیں جس طرح کی سہولیات گلمرگ میں ''گنڈولا'' کی صورت میں دستیاب ہیں۔ اِس کے علاوہ گنج نامہ میں خاص جگہوں میں ایک مصنوعی غار ''غارِ ایکوریم دھکدہ گنج نامہ'' (Artifical Aquarium) بھی بنایا گیا ہے جو نہایت ہی خوبصورت ہے۔ ساتھ میں یہاں جہاں بہت سی سہولیات دستیاب ہیں، وہیں کوہ پیمائیوں کے لئے ایک تربیتی کیمپ بھی بنایا گیا ہے جس کا نام

''اردوگاہ'' ہے۔میں نے دیکھا کہ ایران میں اکثر جگہوں پر خاص کر دور دراز دیہات میں ایسی تختیاں نظر آجاتی ہیں جن پر میں نے ''اردوگاہ'' کا نام لکھا ہوا پایا۔دراصل فارسی میں 'اردوگاہ' کے معنی 'تربیتی کیمپ' (Training Camp) کے ہیں جہاں پر کسی چیز کی تربیت دی جائے۔لفظ ''اردو'' کی مناسبت سے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہاں بھی یہ تقریباً وہی معنی دے رہا ہے، جو زبان کے حوالے سے دے رہا ہے۔زبان کے لحاظ سے لفظ ''اردو'' ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی افواج کے ہیں اور فوج کو کسی کیمپ میں ہی رہ کر تربیت دی جاتی ہے۔چونکہ یہ کیمپ نہ صرف انہیں تربیت فراہم کرتا ہے بلکہ اِس کیمپ میں رہ کر یہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی صلاحیت بھی حاصل کرتے ہیں اور فوجی مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے کے بموجب ایک ہی زبان نہیں بولتے بلکہ ان کی الگ الگ زبانیں یا بولیاں ہوتی ہیں۔اس طرح جب یہ ایک کیمپ میں داخل ہو جاتے ہیں، تو وہاں پر وہی الفاظ استعمال کرنے کے لئے ایک دوسرے کے رابطے میں رہنے کی کوشش کرتے ہیں، جو ان کی زبانوں میں قدرے مشترک ہوتے ہیں۔اردو زبان بھی دراصل مشترک الفاظ کی زبان ہے۔ایران میں رہنے کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ فارسی اور اردو میں ہزاروں کیا لاکھوں الفاظ مشترک ہیں اور کئی ایک سطح پر ایک ہی معنی بھی دیتے ہیں۔اِسی طرح اردو اُزبک، اردو تاجک، اردو ترکی ، اردو عربی، اردو انگریزی یا پھر اردو اور دیگر مقامی زبانوں اور بولیوں میں ہزاروں الفاظ مشترک ہیں۔اردو زبان میں دراصل کیمپ کی مانند جذب اور برداشت کرنے کا جو یارا ہے' وہ شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان میں ہو۔ان معنوں میں اردو زبان بھی ایک ایسی تربیت گاہ ہے جس نے سالہا سال ہندوستان کو جوڑے رکھا اور نہ صرف جوڑے رکھا بلکہ ایک تربیت گاہ کی طرح ایسی تربیت کی کہ مختلف زبانوں کے اِس وطن کو ایک ہی مالا میں پروئے رکھا۔آج بھی دنیا کے اکثر ملکوں میں

اردو اِسی تربیت کا کام کر رہی ہے۔ یہ رابطہ بڑھانے میں ایک کارآمد کردار ادا کر رہی ہے بلکہ حقیقت میں ''اردو زبان'' بھی یکساں طور پر ''اردو گاہ'' کی ہی مانند اپنا کردار نبھاتے ہوئے لوگوں کو ایک تہذیب کی تربیت کر رہی ہے۔

''گنج نامہ'' کی یہ 'اردو گاہ' کوہ پیماؤں کو 'کوہِ الونڈ' کو سر کرنے کی تربیت فراہم کرنے میں مصروفِ عمل ہے تاکہ لوگ ''گنج نامہ'' کے کوہستانی راستے سے بھی 'کوہ الونڈ' کی دوسری طرف ایک خوبصورت اور دلکش سیاحتی مقام 'عباس آباد' پہنچ سکے۔عباس آباد ہر موسم میں سیاحوں کے لئے ایک سازگار اور پُرفضا سیاحتی مقام ہے۔ یہ پہاڑی سلسلوں کے درمیان ایک ہموار اور سرسبز اور روح پرور جگہ ہے۔ یہاں ایک دلکش جھیل بھی ہے اور اِسی خوش نما جھیل کے بیچوں بیچ سیاحوں کے ٹھہرنے کے لئے ایک خوبصورت ہوٹل بھی تعمیر کیا گیا ہے، جو اپنے آپ میں ایک منفرد منظر پیش کر رہا ہے۔ یہاں پر شہر ہمدان کو بجلی فراہم کرنے کے لئے پہلا بجلی پروجیکٹ بھی بنایا گیا تھا ہے۔ ہمدان کے شہر سے بالکل قریب ہونی کی وجہ سے ہمدان کے مقامی شہری زمانہ قدیم سے یہاں گرمیوں میں رہنے کے لئے آتے تھے۔ اِس وجہ سے یہ ہمدان کے لوگوں کا گرمائی مسکن بھی کہلاتا ہے۔

ہمدان کے سفر کو میں اپنی زندگی کے بہترین اور خوشگوار ترین یادوں میں شمار کروں گا۔ میں اُن لوگوں کو خوش نصیب سمجھتا ہوں جو ہمدان میں پیدا ہوئے۔ شاید بوعلی سینا کو اس زمانے میں ہمدان میں ہی تجربات کے لئے سازگار ماحول میسر رہا ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے یہاں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اگر بہترین ماحول کی بات کی جائے تو ازبکستان کے بخارا شہر میں انہیں وہ تمام وسائل شاہانہ انداز میں میسر تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں وہ ماحول راس نہیں آسکا؟ یہ ماحول کسی حد تک ایک ادیب یا تاریخ داں کے لئے سازگار ثابت ہوسکتا ہے نہ کہ ایک سائنس داں کے

لئے۔ سائنس دانوں کو کتب خانوں کے ساتھ ساتھ تجربہ گاہوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے اس سلسلے میں اُس زمانے میں ہمدان میں ہی یہ سہولیات دستیاب رہی ہوں۔ دوسری بات یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اُس زمانے میں ایسے لوگوں کی کوئی خاص قدر نہیں تھی اوران کے تجربوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ اس سطح پر بھی شہر ہمدان شاید باقی علاقوں سے ترقی یافتہ تھا اور یہاں پڑھنے لکھنے کا ماحول میسر تھا۔ ساتھ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی قدر کی جاتی تھی جس کی وجہ سے بوعلی سینا نے یہاں ہی اپنے تجربات اور تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہو۔

یہ بات مجھے بعد میں پتہ چلی کہ تہران یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے معروف استاد پروفیسر علی بیات صاحب کا تعلق بھی ہمدان سے ہے۔ اگر یہ بات مجھے پہلے معلوم ہوتی تو میں لازماً اُن کے گھر جاتا تا کہ ہمدان کے رہنے والوں کے رہن سہن کو اور بھی قریب سے دیکھنے کی کوشش کرتا اور شاید پروفیسر علی بیات صاحب کی وجہ سے ہمدان کے وہ مقامات بھی دیکھ سکتا جو سیاحتی اہمیت تو رکھتے ہیں، لیکن برصغیر کے سیاحوں کی نظروں سے اوجل ہیں۔ انشاء اللہ اگر اگلی بار ایران جانے کا موقع ملا تو میں ضرور ہمدان کو دوبارہ دیکھنے کی کوشش کروں گا اور اُن مقامات پر جانے کی بھی کوشش کروں گا جہاں میں اِس بار جا نہ سکا۔

آپ کو یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ ہم نے یہاں سے ''کرمانشاہ'' جانے کا بھی پروگرام بنایا تھا لیکن اسے بھی آخری لمحات پر منسوخ کرنا پڑا۔ بعدازاں مجھے یہ جانکاری ملی کہ تہران یونیورسٹی کے ہی شعبہ اردو کے ایک اور استاد ڈاکٹر علی کاوسی نژاد صاحب کا تعلق ''کرمانشاہ'' سے ہے۔ حالانکہ ہمدان سے کرمانشاہ کی مسافت کچھ زیادہ نہیں اور اُس پر طرہ یہ کہ ہمدان سے کرمانشاہ تک برابر ایک جدید شاہراہ (Express Way) موجود ہے، جہاں سے گزر کر ہم آسانی سے کرمانشاہ پہنچ سکتے

تھے۔میں نے کرمانشاہ کے کچھ خاص سیاحتی مقامات کے بارے میں سنا تھا۔اُن میں خاص کر ''طاق بستان'' ، ''غارِ قوری قلعہ،روانسر''، ''آثارِ باستانی بیستون ،ہرسین''،''تکیہ معاون الملک''وغیرہ شامل ہیں۔

سفرنامہ لکھتے وقت اِس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ جس ملک کے بارے میں آپ لکھ رہے ہوں وہاں کے مذاہب سے وابستہ ہر ایک فرقے کی آپ کو معلومات ہونی چاہئے کہ وہ کس طرح سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔کن چیزوں سے مستفید ہو رہے ہیں اور کن مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ یہ سب چیزیں سفرنامے کا لازمی جز ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ کرمانشاہ میں سنی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد رہائش پذیر ہے۔اِس سلسلے میں راقم ڈاکٹر علی کاوسی نژاد صاحب کی مدد لے سکتا تھا تاکہ وہ سنی مسلمانوں سے ملاقات ممکن بنانے میں معاونت کرتے اور میں یہ جان پاتا کہ وہ کس طرح سے ایران میں رہ رہے ہیں۔حالانکہ جب سے اور جس انداز سے راقم نے ایران کو دیکھا ہے' اِس نتیجے پر پہنچا کہ اگر حکومتِ ایران شہریت دے تو بہتر ہے کہ زندگی وہیں بسر کی جائے۔

دو دن کے ہمدان کے سفر کے بعد آج جولائی 26 کی صبح کو ہم 'قم' واپس پہنچے۔یہاں پہنچنے کے بعد ہم نے تھوڑی دیر تک آرام کیا اور نہا دھو کر تیار ہوئے۔گیارہ بجے کے قریب ہم 'جاپان' سے آئے ہوئے طلباء و طالبات کے ساتھ ''صنایع دستی سعادتمند'' (Saadatmand Crafts) کا دورہ کیا۔جاپان کے یہ طلاب اصل میں ایرانی ثقافت کے بارے میں جاننے کی کوشش میں ہیں۔اِس کے لئے وہ پہلے فارسی زبان کو سیکھ رہے ہیں۔اُن کا ماننا ہے کہ زبان کو سیکھنے کے بعد ہی ہم ثقافت کی اصل روح کو پہچاننے میں کامیاب ہوجائیں گے۔میری نظر میں ان کی یہ بات درست بھی ہے۔اصل میں زبان میں ہی تہذیب پوشیدہ ہوتی ہے اور ہمیں یہ بھی خیال

رکھنا چاہئے کہ ترجمے کی مدد سے زبان میں مضمر اصل جذبات تک نہ ہی پہنچ سکتے ہیں اور نہ انہیں پہچان سکتے ہیں۔ہم کسی بھی زبان کواس لئے سیکھتے ہیں کہ یہ زبان اسی طرح سے ہمارے وجدان اور ہماری بصیرتوں کی رہنمائی کرے تاکہ ہم اس کی اصل روح میں اتر پائیں جس طریقے سے یہ اصل زبان جاننے اور سمجھنے والے کی رہنمائی کر رہی ہے۔کیونکہ دوسری زبان کے ذریعے اصل علوم اور اس کے ماخذات کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ترجمے کی زبان اصل صلاحیتوں سے وسیع معنوں میں عاری ہی ہوتی ہے۔کسی زبان کو پوری طرح سے سیکھنے کے بعد سب کچھ یکسر بدل جاتا ہے۔ہم عام و خاص سے بات کرنے کے نہ صرف اہل ہو پاتے ہیں بلکہ اُس زبان کے اصل متن کو پڑھنے کے بھی قابل ہو جاتے ہیں۔رابندرا ناتھ ٹیگور کا کہنا ہے کہ اگر آپ کو میری تخلیقات سمجھنی ہے،تو اس کے لئے لازمی ہے کہ آپ پہلے بنگلہ زبان کو سمجھیں۔دراصل زبان ہمیں تہذیب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔جاپان اس سلسلے میں اپنے شہریوں کو وظائف بھی فراہم کرتا ہے تاکہ وہ مختلف زبانوں کو سیکھنے کے اہل ہو جائیں۔

''صنایع دستی سعادتمند'' کا کارخانہ وہی طریقہ اپنا رہا ہے جیسا کہ ہمدان سے آتے وقت'لالجین' میں سوفال کے برتن بنانے والے اپنا رہے تھے۔اِس کارخانے کے مالک کا نام جناب سید ابو القاسم سعادتمند ہے۔وہ ایک مخلص انسان ہونے ساتھ ساتھ بڑے ہی شائستہ اور مہذب ہیں۔اُنہوں نے بڑی ہی خوبصورتی سے اپنا مختصر اور اپنے اِس کارخانے کا مدلل انداز میں تعارف پیش کیا۔اس کے بعد ہم نے ایک ایک کر کے اپنا مختصر تعارف دیا۔ایک دوسرے کو جاننے کے بعد اُنہوں نے ہمیں مشروبات اور چائے پیش کی۔سب لوگوں نے اپنی اپنی پسند کے مطابق اسے نوش کیا۔اِس دوران کارخانے میں سامنے نمائش کے لئے رکھی گئی مختلف قسم کی دلکش مصنوعات کو باریک بینی سے دیکھنے کا موقع ملا کہ یہ کس طرح کی مٹی سے تیار کی گئی ہے

اور ایسا محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ مٹی کی مصنوعات ہیں بلکہ اس کی بجائے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ قیمتی پتھروں سے تراشے گئے زیورات ہیں۔ کیونکہ اِنہیں بنانے کے ساتھ ساتھ اِن میں بڑی ہی باریکی سے رنگ بھر دیئے گئے تھے۔ زیادہ تر زیورات میں نیلے (آسمانی) رنگ کا استعمال کیا گیا تھا۔ شاید نیلا رنگ ایران کی عورتیں پسند کرتی ہوں یا پھر زمانہ قدیم میں ایران میں نیلے رنگ کو پسند کیا جاتا رہا ہو۔ اصل میں ابو القاسم سعادتمند صاحب کا مقصد قدیم مصنوعات کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایران کی قدیم طرز زندگی میں مستعمل مختلف روزمرہ کی چیزیں خاص کر زیوارت نیز دیگر مصنوعات کو دوبارہ لوگوں تک جدید مشینوں کی بجائے اُسی طرز پر تیار کیا جائے جس طرز پر زمانہ قدیم میں انہیں تیار کیا جاتا تھا۔

اُنہوں نے ہمیں سامنے لگے ایک بڑے ایل،سی،ڈی پر ''نیلے موتیوں (Blue Pearls) کے بارے میں ایک دستاویزی فلم دکھائی۔ اُن کے بقول یہ فلم اُنہوں نے خود تیار کروائی ہے۔ اس دستاویزی فلم میں بڑے ہی ڈرامائی انداز میں یہ کھایا گیا ہے کہ کس طرح قدیم زمانے میں لوگ نیلے موتیوں کو بڑے ہی شوق سے پہنتے تھے۔ یہ فلم سرامیک سازی کی اہمیت کو اُجاگر کر رہی تھی۔ اس مختصر فلم کو دیکھنے کے بعد جیسے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ سرامیک سازی کی نشاۃ ثانیہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ہمیں ان چیزوں کی قدر کرتے ہوئے، ایسی مصنوعات کو فروغ دینا چاہئے۔ کیونکہ آج کل پلاسٹک یا اِس جیسی مصنوعات کی مانگ بازار میں بڑھ رہی ہے لیکن یہ صنعت ماحولیات پر بُری طرح سے اثر انداز ہو رہی ہے۔ سرامیک سازی کی صنعت کفایتی ہونے کے ساتھ ساتھ ماحول دوست بھی ہے۔ ہمیں ایسی صنعت کے فروغ کی تشہیر انسانیت کی بقاء کے لئے اپنے مفادات سے بالاتر ہو کر کرنی چاہئے۔

یہ دستاویزی فلم دیکھنے کے بعد جناب سید ابو القاسم سعادتمند نے سرامیک

سازی کے فن کے بارے میں سمجھایا کہ اسے کس طرح سے تیار کیا جاتا ہے۔ پھر ہم ایک ایک کر کے اُس کمرے میں گئے جہاں سرامیک کی مٹی رکھی گئی تھی۔ یہ مٹی عام مٹی سے قدرے مختلف محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یہ مٹی تھوڑی سی کھردری لگ رہی تھی۔ ہاتھ میں اُٹھانے سے یوں لگتا تھا کہ جیسے سنگ مرمر کو پیسا گیا ہو۔ میں نے اِس معاملے میں ''صنایع دستی سعادتمند'' کے مالک جناب ابولقاسم سعادتمند سے پوچھا کہ کیا یہ مٹی سنگ مرمر کو پیسنے سے حاصل ہوئی ہے؟ تو اُنہوں نے جواب دیا، ایسا نہیں ہے یہ ایک عام قسم کی مقامی مٹی ہے اور اسے یہاں 'سلسیان' (Ceramic) کہتے ہیں۔ لیکن مجھے ایسا نہیں لگا کہ یہ عام قسم کی مٹی ہے، مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے یہ کسی خاص جگہ کی مٹی ہو سکتی ہے۔ اِس بات کی طرف اب میرا دھیان کچھ زیادہ ہی کھینچنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ انسان بھی تو مٹی ہی سے بنا ہے۔ کیا وہ خاص قسم کی مٹی تھی کہ جب اس میں روح ڈال دی گئی تو اس نے گوشت و پوست کا رنگ اختیار کیا۔ شاید اس مٹی میں نرمی اور کھٹور پن کی آمیزش ہوگی جسے دل بنایا گیا ہوگا اور یہ انسان کا نصیب ہی ہے کہ کس کے حصے میں کون سی مٹی آئے۔ شاید اُس مٹی کو ڈھونڈنا ہی مشکل ہے جسے دماغ کی نشو ونما ہوئی ہو۔ بے شک وہ نور کی عجب مٹی ہوگی اور اُس مٹی میں روشنی، تمنا، آرزو، خواہشات، شرم وحیا اور سب سے بڑھ کر رنگ پوشیدہ ہوں گے جسے آنکھیں بنی ہوں گی۔ آنکھوں کی بصارت کی بدولت ہی دنیا میں سب کچھ ہے۔ یہی وہ شے ہے جو رنگوں کا پیغام انسان کے ذہن و دل تک پہنچاتی ہے۔ حالانکہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے مٹی ہی ہونا ہے! لیکن پھر بھی یہ مٹی ہی میں طرح طرح کے رنگ تلاش کرنے کی چاہ میں ہے؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اِس دنیا کی مٹی میں رنگ بھرنے کا سبب انسان ہے۔ خود مٹی سے بنے انسان ایک ایسی مٹی کا متلاشی ہے جس میں خوبصورت سانچے میں ڈھلنے کی صلاحیت ہو۔

خوبصورت سانچے میں ڈھلنے کی صلاحیت ہر مٹی میں نہیں ہوتی بلکہ خاص قسم کی مٹی میں ہی ہوتی ہے۔جس طرح الگ الگ جگہوں کی مٹی میں پیدوار کی صلاحیت مختلف قسم کی ہوتی ہے۔جنوبی کشمیر کے مقابلے میں شمالی کشمیر کی مٹی میں پیدوار کی صلاحیت بہت ہی کم ہے۔کسی جگہ کی مٹی میں لعل وگوہر پوشیدہ ہوتے ہیں۔لیکن اُسی مٹی میں دال چاول پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔لعل وگوہر انسانی زندگی کے لئے لازمی شرط نہیں۔اس کے برعکس دال چاول انسان کے زندہ رہنے کے لئے لازمی شرط ہے۔اِن معنوں میں ہر طرح کی مٹی اپنی ایک منفرد افادیت رکھتی ہے۔ پرانے زمانے میں ہر گاؤں میں مٹی کے برتن بنانے والے کمہار نہیں رہا کرتے تھے۔اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہر ایک گاؤں کی مٹی برتن بنانے کے اہل نہیں ہوتی تھی۔ اِسی طرح سے اگر دیکھا جائے مشہور چینی موبائل بنانے والی کمپنی ''شائیومی'' (Xuhmi) آج کل اپنے اکثر موبائل فونوں میں سرامیک کے ہی جسم (Body) سے تیار کرتے ہیں جو بہت ہی سخت قسم کے اور بڑے ہی پائیدار ثابت ہو رہے ہیں۔ایسی سرامیک مخصوص علاقوں میں ہی دستیاب ہوتی ہوگی۔اسی طرح چینی مٹی کے برتن بھی ایک خاص قسم کے سرامیک سے تیار کئے جاتے ہیں۔اگر چہ یہ پائیدار نہیں ہوتے لیکن اِس کی یہی ناپائیداری اِسے ایک الگ ہی رنگت عطا کرتی ہے۔نازکی کی اپنی ایک الگ دنیا ہے اور اِس کے الگ خریدار بھی۔ایران میں سوفال کے برتنوں کے لئے 'لال جین' کی مٹی بہت ہی اہمیت کی حامل مٹی ہے اور پورے ایران میں لال جین کے سوفال اپنی ایک الگ معنویت رکھتے ہیں۔آج کل ایران میں اِن برتنوں میں کھانا پینا فیشن بن گیا ہے۔اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ یہ صحت پر مضر اثرات مرتب نہیں کرتے اور ساتھ میں ماحول دوست بھی ہوتے ہیں۔

''صنایع دستی سعادتمند'' کے سرامیک کے کارخانے میں جس کمرے میں مٹی رکھی

گئی تھی، ہم پہلے اُسی کمرے میں گئے۔ یہاں ہم جناب سید ابوالقاسم سعادتمند کے دیئے گئے سرامیک سازی کے اصولوں کے مطابق مٹی گوندھنے لگے۔ مٹی کو اُسی طریقے سے گوندھا جاتا ہے جس طرح سے روٹی بنانے کے لئے آٹا گوندھا جاتا ہے۔ سرامیک سازی کے دوران بڑے ہی احتیاط سے اِس خاص مٹی میں آہستہ آہستہ اور کم مقدار میں پانی ملایا جاتا ہے اور جب تک نہ مٹی اُس سطح تک پہنچ جائے جہاں سے گوندھنے والا مطمئن ہو جائے کہ اب یہ گوندھی گئی مٹی کسی سانچے میں ڈھل سکتی ہے، تب تک اِسے گوندھتے رہنا بہتر ہے۔ ساتھ میں یہ بھی خیال رہے کہ نہ ہی پانی کی مقدار زیادہ اور نہ ہی یہ مقدار کم ہونی چاہئے۔ دونوں صورتوں میں مٹی صحیح شکل دینے کی اہل نہیں ہوگی اور جب آپ کو یہ محسوس ہو جائے کہ مٹی اب صحیح معنوں میں بن کر تیار ہوئی ہے، تو اس کے بعد اسے ایک پالی تھین لفافے میں بھر دیجئے تاکہ ہوا مٹی تک نہ پہنچ پائے۔ اس طرح آپ نے سرامیک سازی کے سلسلے کا پہلا قدم پورا کیا۔

دوسرا قدم یہ ہے کہ ایک اور جگہ جہاں پر کرسیاں اور میز دستیاب ہیں، میز پر چکلا اور بیلن دونوں رکھے گئے ہیں۔ یہ وہی چکلا اور بیلن ہے جو گھروں میں روٹی بیلنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یوں اب آپ پہلے قدم میں بنائی گئی مٹی کو پالی تھین کے لفافے سے باہر نکال کر اسے شکل دینے کی کوشش کریں، لیکن خیال رہے اتنی ہی مٹی باہر نکالیں جتنی مقدار آپ کو درکار رہے۔ یہاں پر جتنی مٹی آپ نے گوندھی گئی مٹی سی باہر نکالی اب اسے دوبارہ روٹی کے مانند دونوں ہتھیلیوں سے گوندھتے رہیں اور اس دوران یہ بھی دیکھیں کہ مٹی کے اس حصے میں کوئی چھوٹی موٹی دراڑیں تو نظر نہیں آ رہی ہیں۔ اگر آپ کو محسوس ہو رہا ہے کہ ابھی اس میں دراڑیں ہیں، تو تمام دراڑیں ختم ہونے تک اسے دوبارہ گوندھتے رہیں۔ دراڑیں بھر جانے کے بعد اسے اب چکلے پر ڈالیں۔ پہلے چکلے اور بیلن دونوں کو غور سے دیکھیں کہ کیا یہ مکمل صاف و شفاف ہیں؟

کہیں ان پر مٹی یا کوئی اور چیز تو نہیں لگی ہے؟ اگر ہے تو پہلے انہیں مکمل طور سے صاف کیجئے اور اس کے بعد اس پر ہلکی سی خشک مٹی ڈالیں، اس کے بعد گوندھی ہوئی مٹی اس چکلے پر ڈالیں پھر بیلن کی مدد سے روٹی کی مانند اسے آرام سے ہموار کریں۔ جب یہ گول صورت میں بن جائے تو اس کا ایک بار پھر جائزہ لیں کہ کہیں اِس میں دراڑیں تو نظر نہیں آ رہی ہیں یا اس میں کسی قسم کی کمی تو محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ اگر ایسا محسوس ہو رہا ہے تو اسے واپس اٹھالیں اور دوبارہ گوندھیں تا کہ اس میں کوئی بھی کمی باقی نہ رہے۔ پھر اسے دوبارہ اسی طرح سے تیار کریں۔ اب یہ تیار گول مٹی تیز دھار دار ٹین یا اسٹیل کے بنے ہوئے اپنی پسندیدہ سانچے میں ڈالیں اور اسے سانچے میں مضبوطی یا مقررہ دباؤ کے ساتھ برابر کریں۔ اِس کے بعد لکڑی، فولاد یا پھر سنگ مرمر کی ایک پتلی اور ہموار صاف و شفاف تختی لیں، اس پر بھی تھوڑی سی خشک مٹی ڈالیں اور جو گوندھی ہوئی مٹی آپ نے سانچے میں ڈالی تھی، اسے آہستہ آہستہ اس سانچے سے علاحدہ کریں، یوں آپ کی بنائی ہوئی شئے تیار ہوگئی۔

یہ مختلف چیزیں تیار ہونے کے بعد یادہ تر نیلے رنگ میں ڈالی جاتی ہیں۔ آپ اپنی پسند کے مطابق بھی رنگ میں ڈال سکتے ہیں۔ مقررہ معیاد ختم ہونے کے بعد جب یہ مکمل طور پر رنگ کو اپنے اندر جزب کر لیں تو انہیں رنگ سے باہر نکال کر سکھایا جاتا ہے اور سکھانے کے بعد انہیں مٹی کے برتنوں کے طرز پر حرارت دے کر ٹھوس کیا جاتا ہے۔ یوں مٹی سے بنے زیورات وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں۔

''صنایع دستی سعادتمند'' کے اس کارخانے میں صرف زیورات ہی تیار نہیں کئے جاتے بلکہ وہ تمام چیزیں بنائی جاتی ہیں جو قدیم ایران میں سرامیک سازی کے ذریعے تیار کی جاتی تھیں۔ حالانکہ اِس میں سے زیادہ تر چیزیں سجاوٹ کی ہی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے ایسی چیزیں بھی دیکھی جو روزمرہ زندگی میں استعمال کی جاسکتی

ہیں۔جیسے کھانے پینے کے مختلف اقسام کے برتن‘ چلنے کے لئے راستے میں بچھائے جانے والی راہ پائے یا تختیاں (Tiles)‘بچوں کے لئے مختلف اقسام کے کھلونے‘ نقش و نگاری سے مزین طرح طرح کی تختیاں‘غرض ہر طرح کی چیزیں دستیاب ہیں۔یہی نہیں بلکہ مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ جس طریقے سے یہ کارخانہ بنایا گیا ہے‘اُس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کو سرامیک سازی کے متعلق تربیت بھی فراہم کی جائے تا کہ آنے والی نسل اس روایتی فن سے غیر مانوس نہ رہ جائے۔اس کارخانے کے دورے کے دوران اُنہوں نے مقامی انداز میں دوپہر کا کھانا بھی بڑے ہی منفرد طریقے پر پیش کر کے مہمان نوازی کا عمدہ ثبوت پیش کیا۔یہ ہمارے لئے اور بھی خوش کُن اور دلچسپ بات تھی۔میں دل کی گہرائیوں سے جناب سید ابوالقاسم سعادتمند کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنہوں ہمیں ’’صنایع دستی سعادتمند‘‘ آنے کی دعوت دی اور ہمیں اپنی اس غیر معمولی تحریک اور سرگرمی کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا‘جس کے ذریعے اُنہوں نے اپنی ثقافت ،قدیم طرز زندگی وغیرہ کو زندہ اور محفوظ رکھنے کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔اس پُرخلوص جذبے کے لئے آپ حقیقی معنوں میں مبارکباد کے حق دار ہیں۔

آج جولائی 27 ہے اور ہمیں تہران کے دو دن کے سفر پر آج روانہ ہونا ہے۔ہم قم سے صبح چھ بجے کے قریب ایک آرام دہ ٹیکسی میں سوار ہوئے جس کا کرایہ تہران تک جو کہ قم سے 150 کلو میٹر کی دوری پر واقع ہے 600 سو ہندوستانی روپیہ مقرر ہوا۔میرے ضلع بانڈی پورہ سے سرینگر کا کرایہ یا پھر سرینگر سے بارہمولہ یا اننت ناگ کا کرایہ۔سرینگر سے ان علاقوں کی دوری تقریباً اوسطا" ساٹھ (60) کلومیٹر تک ہوگی اور اِس مسافت کو مدنظر رکھتے ہوئے‘ یہاں پر عام ٹیکسی والا اس سفر کے لئے کم از کم بارہ سو (1200) روپیہ کرایہ وصول کرے گا۔اس بات سے آپ خود اندازہ لگالیں کہ ایران میں نقل وحمل کتنا سستا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بات بھی آپ کو بتاتا

چلوں کہ کشمیر یونیورسٹی سے میرے گھر تک کی مسافت 60 کلو میٹر ہے۔ میں پچھلے تقریباً دس سال سے اپنی گاڑی میں ہر ہفتے گھر آتا جاتا رہا ہوں اور اِس دوران میں نے سفر کے اوسط وقت کا اندازہ لگایا ہے کہ دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ یعنی وقت اِس سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے البتہ اِس سے کم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سڑکوں کی حالت کا مختصر قصہ یہ ہے کہ اس دوران راقم نے تین نئی گاڑیاں تبدیل کی۔ کیونکہ اِس سڑک پر چلنے کے بعد کسی بھی صورت میں ہر تین سال بعد گاڑی تبدیل کرنی پڑے گی۔ اس کے برعکس قم سے تہران کا 150 کلو میٹر کا سفر ہم نے بڑے ہی آرام سے ایک گھنٹے اور دس منٹ میں طے کیا۔ یوں ہم 7 بج کر 10 منٹ پر تہران پہنچ چکے تھے۔

تہران میں ہم نے یہ طے کیا کہ ہم یہاں کا سفر مقامی میٹرو ٹرین میں کریں گے۔ یوں ہم نے سامنے ہی ایک میٹرو اسٹیشن پر ٹکٹ خریدی۔ ٹکٹ خریدنے کے لئے ہم ایک مختصر قطار میں کھڑے رہے۔ یہ ٹکٹ خریدنے کے بعد ہم نے جائزہ لیا کہ دہلی کے میٹرو کے مقابلے میں یہاں کے میٹرو کی ٹکٹ نہایت ہی سستی ہے۔ اس معاملے میں مختصراً آپ آسان انداز میں یوں سمجھ لیں کہ تہران میٹرو میں کئی ایک بار سفر کرنے کے بعد ہم نے کرایہ کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دہلی میٹرو میں جس سفر کے لئے کرایہ ایک سو (100) ہندوستانی روپیہ ادا کیا' اُسی یکسان نوعیت کے سفر کی لئے آپ کو تہران کے میٹرو میں تیس (30) ہندوستانی روپیہ ادا کرنے ہوں گے۔ اسے آپ خود نتائج نکال سکیں گے کہ کرایہ میں ستر فیصد کیا واضح فرق ہے اور اگر ٹیکسی کے کرایہ یا بس کے کرایہ پر نظر ڈالی جائے تو اس میں تقریباً اَسی فیصد کا تفاوت صاف نظر آ رہا ہے۔ یہ تمام مشاہدات آنکھوں دیکھی اور تجرباتی ہیں، سنی سنائی یا داستانی شماریات نہیں ہیں۔ ٹکٹ لینے کے بعد ہم ایک اسٹیشن پر میٹرو میں سوار ہونے کے لئے انتظار کر رہے تھے' گاڑی دہلی کی میٹرو کی مانند کچھا کچھ بھری ہوئی تھی۔ ہم نے اِس سوچ میں ایک

ٹرین کو جانے دیا کہ شاید آنے والی خالی ہو۔لیکن اگلی گاڑی اسے بھی زیادہ بھری تھی۔اب ہم نے مناسب سمجھا کہ سمجھداری اس وقت نکلنے میں ہے۔اس طرح کچھ ہی وقت میں ہم تہران یونیورسٹی کے مرکزی دروازے کے آس پاس والے میٹرو اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

ہم گاڑی سے باہر آئے اور تہران یونیورسٹی کے نزدیک ہوٹل تلاش کرنے لگے۔ایران کے سفر کے دوران یہ ہماری پہلی غلطی تھی کہ ہم نے پہلے ہی ہوٹل کا انتخاب نہیں کیا تھا۔آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ دوران سفر خصوصاً عصر حاضر میں جب ہمارے پاس پسند کی رہائش تلاش کرنے کے مختلف طریقے دستیاب ہیں' ایسے میں کبھی بھی ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ آپ گھر سے نکلیں اور مذکورہ مقام پر پہنچ کر اپنی رہائش کے انتظامات کریں۔اس سلسلے میں بعدازاں مسائل کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔کبھی کبھار ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ تمام رہائشی مقامات مکمل طور پر پہلے ہی مصروفِ کار ہوں۔اُس پہ طرہ یہ کہ اگر کسی کے پاس کمرہ خالی ہو بھی تو وہ مسافر کی مجبوری کو دیکھ کر منہ مانگے دام طلب کرسکتا ہے۔ایسے میں مسافر آخر کار زیادہ کرایہ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور خاطر خواہ موزون رہائشی جگہ بھی ہاتھ نہیں آتی۔ایران میں ہم جہاں بھی گئے رہائش کا بہتر انتخاب پہلے سے ہی کر کے رکھا لیکن تہران آنے سے پہلے اس بات کا خیال نہیں رہا۔ صبح کے آٹھ بجے سے نو بجے تک ہم ہوٹل ڈھونڈتے رہے۔اکثر ہوٹل خالی نہیں تھے اور اگر کسی ہوٹل میں کمرہ دستیاب بھی تھا تو منتظمین ایک رات ٹھہرنے کا کرایہ کم سے کم چھ ہزار روپیہ طلب کر رہے تھے۔

آخر کار ایک جگہ بیٹھ کر انٹرنیٹ پر ہوٹل تلاش کرنے لگے۔کئی ایک ہوٹلوں کو فون کرنے کے بعد 'خیابانِ لالہ زار' کے مقام پر ایک ہوٹل کے منتظمین سے بات ہوئی جس کا نام ''ہوٹل مرکزی ایران'' تھا۔انہوں نے ایک رات ٹھہرنے کا کرایہ چار ہزار

روپیہ طلب کیا۔حالانکہ یہ رقم ہمارے بجٹ کے منافی تھی ۔مانا کہ یہ تہران ہے لیکن ہمارے یہاں بھی تو دہلی ہے۔تہران حقیقت میں ایران کا مہنگا ترین شہر ہے۔آخر کار دس منٹ میں ہم ہوٹل پہنچ گئے ۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کا ہوٹل تھا۔رہائش کے بہترین انتظامات تھے۔ پہلے ہم نے ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ناشتہ کیا۔ناشتہ بہت ہی لذیذ تھا اوراس ریسٹورنٹ میں کھانے پینے اور بیٹھنے کی بہترین سہولیات دستیاب تھیں۔آرام سے ناشتہ کرنے کے بعد ہم اپنے کمرے میں گئے اورتھوڑی دیرتک بیٹھ کر اِس بات کا احتساب کرنے لگے کہ آج ہم سے یہ غلطی کیونکر سرزد ہوئی کہ پہلے ہی ہوٹل منتخب کر کے محفوظ کیوں نہیں کیا۔ بہرحال سفر میں ایسے واقعات کے لئے انسان کو ہردم تیار رہنا چاہئے اور پریشان ہونے کی بجائے فوراً مشورہ کر کے مسئلے کا حل تلاش کرنا بہترین طریقہ ہے۔لیکن سفر کا یہ بھی بہترین اصول ہے کہ فوراًاحتساب کیا جائے تا کہ آگے آنے والے معاملات صحیح طریقے سے انجام کو پہنچیں۔ایران جیسے ملک میں اس بات کا خاص خیال رکھنا اورزیادہ اہمیت کا حامل ہے۔کیونکہ یہاں آپ کو بین لاقوامی بینک کاری کی سہولیات دستیاب نہیں ہیں۔ایسے میں جو رقم آپ کے پاس دستیاب ہے اُسی پر اکتفا کرنالازمی ہے۔

تقریباًایک سے ڈیڑھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہم نے نہا دھوکر کپڑے بدلے اور جس مقصد کے لئے تہران آئے تھے اس کی طرف روانہ ہوئے۔ ہمیں ’’واحد شہید بہشتی دانشگاہِ فرہنگیان، تہران‘‘

Wahid Shaheed Bahishti Teacher Education (University) دوپہر بارہ بجے پہنچنا تھا۔ہم نے بذریعہ موبائل ایپ ایک ٹیکسی کا انتخاب کیا۔ہم ہوٹل سے باہر کیا نکلے کہ ہوٹل کے مرکزی دروازے کے بالکل سامنے ٹیکسی ہماراانتظار کررہی تھی۔اس بار جیسے ایران کا نظام نقل وحمل قدرے تبدیل ہوگیا

تھا۔آج ٹیکسی کی ڈرائیور ایک خاتون تھی ،جس کی عمر تقریباً پچاس سال تھی ۔ ہندوستان میں آج تک میں نے کسی بھی خاتون کوٹیکسی چلاتے نہیں دیکھا۔ مجھے منٹو کا افسانہ ''لائسنس'' یاد آیا۔ آج میں نے پہلی بار ایران میں کسی خاتون کوٹیکسی چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔لیکن ہمارے ایک ساتھی جو عرصہ دراز سے ایران میں تعلیم حاصل کررہے ہیں' انہوں نے کشمیری زبان میں کہا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، یہاں تو اکثر عورتیں ٹیکسیاں چلاتی ہیں۔ چلئے خدا کا شکر ہے کہ 'دیر آید درست آید' کے مصداق آج ایک خاتون ڈرائیور کے ساتھ سفر کرنے کا موقع نصیب ہوا۔اس خاتون ڈرائیور نے سیاہ رنگ کا عبایا یا چادر پہنی تھی اور سر پر باضابطہ اسکارف لگایا تھا اور ہاتھوں میں سفید دستانے پہن رکھے تھے۔ جہاں تک اِس کی عینک کا تعلق تھا وہ سجاوٹ یا سورج کی شعاعوں سے بچنے کے لئے نہیں بلکہ عینک کی بناوٹ سے یوں محسوس ہورہا تھا شاید اُس کی نظر کو مدنظر رکھ کر کسی ماہر امراض چشم نے تجویز کی ہوگی۔نظر کی عینک کو مدنظر رکھتے ہوئے ،میرے ذہن میں یہ سوال دستک دے رہا تھا کیا یہ خاتوں صحیح طریقے سے اِس ہوشربا آمد ورفت میں گاڑی چلاسکتی ہے؟ میں نے سب سولات کا ایک ہی مختصر جواب دیا۔ٹیکسی کی یہ خاتون ڈرائیور بڑی ہی خوبصورتی اور ہنرمندی سے گاڑی چلارہی تھی۔ کیونکہ صحیح راستے کی نشاندہی کے لئے وہ اپنے موبائل کے ایپ سے بھی بار بار مستفید ہورہی تھی اور موبائل بھی اُسی جگہ دیکھتی جہاں گاڑی کو چند پل رکنا پڑتا۔اس طرح کچھ ہی دیر میں ہم ''واحد شہید بہشتی دانشگاہِ فرھنگیان، تہران'' پہنچے۔

یہاں پر ڈاکٹر حبیب صاحب کے دوست اور ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب ہمارا انتظار کررہے تھے۔ڈاکٹر حبیب صاحب اور ڈاکٹر اسمائل صاحب کی دوستی اصل میں برقیاتی دوستی (e_Friendship) کے طرز کی دوستی ہے۔دونوں تعلیم وتربیت کے اسکالر اور استاد ہیں۔اصل میں دوستی کی داستان یہ ہے کہ حبیب صاحب نے اسماعیل

عظیمی صاحب کا کوئی تحقیقی مقالہ علم وادب کے کسی معروف بین الاقوامی رسالے میں دیکھا اور اِسے بہت متاثر ہوئے۔یوں ڈاکٹر حبیب نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ برقیاتی خط (Email) سے جو روابط شروع ہوئے تھے وہ وٹس ایپ کے ذریعے براہ راست ترسیل میں بدلتے ہوئے آہستہ آہستہ گہری دوستی میں تبدیل ہوگئے۔دراصل برقیاتی ترسیل نے جو عالمی گاؤں کا تصور دیا اسے روابط تیزی سے بڑھنے لگے ہیں۔لیکن سماجی ذرائع ابلاغ نے اِس میں ایک نئی روح پھونک دی۔اگر ہم ڈاکٹر اسماعیل صاحب اور ڈاکٹر حبیب صاحب کی طرح سماجی ذرائع ابلاغ سے اور دیگر برقیاتی ویب گاہوں سے استفادہ کرتے ہوئے ایک دوسرے سے جڑ جائیں،تو یہ بین الاقوامی سطح کی برقیاتی علمی دوستی میں تبدیل ہوکر ایک تحریک کی صورت میں عملی طور علمی انقلاب لانے میں ایک اہم کردار داد کرسکتی ہے اوراس طرح کی دوستیوں سے ایک نئے اور سازگار ماحول کا باب بھی کھل جائے گا۔

ہم ڈاکٹر اسماعیل عظیمی کے ساتھ اندر چلے گئے جہاں ادارے کے ناظمِ اعلیٰ، نائب ناظم اعلیٰ اوران کے دیگر ساتھی ہمارا انتظار کررہے تھے۔انھوں نے ہماری اس طرح سے پذیرائی کی جیسے ہماری شناسائی برسوں کی تھی۔ایسا محسوس ہی نہیں ہورہا تھا کہ ہم آج پہلی باراس یونیورسٹی میں آئے ہیں۔پہلے ہم نے ایرانی روایت کے مطابق چائے لی اور چائے پینے کے ساتھ ساتھ تعلیم کے اہم امور پر گفتگو کرتے رہے۔گفتگو بڑی دیر تک بڑے ہی سلیقے اور خوشگوار ماحول میں جاری رہی۔انھوں نے ہمیں اپنے نظام تعلیم خصوصاً 'اساتذہ کی تعلیم وتربیت' سے متعلق آگاہی فراہم کی اور ہم نے بھی انھیں اپنے نظام تعلیم کے بارے میں مدلل طریقے سے معلومات بہم پہنچائی۔اس علمی اور سیر حاصل گفتگو کا محاصل میری نظر میں یہ ٹھہرا کہ ایران اساتذہ کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے بہت ترقی کرچکا ہے اور اگر ہمیں کبھی اس مقام تک پہنچنا ہے تو ہمیں بھی

ایران کے تعلیمی طرزِ عمل کے نظام کو اختیار کرتے ہوئے اپنے نظام تعلیم کی مکمل طور سے تشکیل نو کرنی ہوگی۔ ایران میں اساتذہ کی تعلیم وتربیت کا نظام قدرے مختلف ہی نہیں بلکہ ہم سے کافی ترقی یافتہ بھی ہے۔ ہمارے یہاں تقریباً اس طریقے کو عملانے کی فی الحال کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ اس میں مالیاتی امور کا گہرا عمل دخل ہے۔

پہلے میں یہاں پر قارئین کو ایران کی تعلیم کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کروں گا تاکہ بعدازاں ہم اپنے موضوع کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔ ہمارے یہاں تعلیم پانچ بنیادی حصوں میں تقسیم کی گئی ہے، وہ اس طرح سے ہیں (1) ابتدائی (Primary)۔ اول سے پانچویں تک اور اب اس تعلیم میں اول جماعت سے نچلی جماعتوں والی تربیت یا کھیل کود والی سطح بھی شامل حال ہے جو سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر رائج ہے، جیسے سرکاری سطح پر آنگن واڑی اور غیر سرکاری سطح پر کینڈر گارٹن (KinderGarten) میں نرسری وغیرہ۔ (2) وسطانوی (Middle) سطح کی تعلیم چھٹی جماعت سے آٹھویں جماعت تک تسلیم کی جاتی ہے۔ (3) ثانوی (Secondary) سطح نویں اور دسویں جماعت کو کہیں گے۔ (4) اعلیٰ اور بارویں جماعتیں اعلیٰ ثانوی (Higher Secondary) گیارہویں تک تسلیم کی جاتی ہے اور (5) اعلیٰ تعلیم (Higher Education) اس تعلیم کو کہیں گے جو ہم بارہویں جماعت کے بعد حاصل کرتے ہیں اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہوتی۔ میں ایرن کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں بات کرنے کی کوشش نہیں کروں گا البتہ جس بات سے ہمیں غرض وغایت ہے وہ یہ کہ وہاں پر 'ثانوی' اور 'اعلیٰ ثانوی' کو 'ثانوی' ہی کہا جاتا ہے اور وہاں ثانوی تعلیم نویں جماعت سے شروع ہوکر بارہویں جماعت پر اختتام پذیر ہوتی ہے اور اس کے بعد بالکل ہماری ہی طرح اعلیٰ تعلیم کی شروعات ہوجاتی ہے۔

اب ہم اپنی بات کی طرف واپس آجاتے ہیں، وہ یہ کہ وہاں کے اساتذہ کی تعلیم و

تربیت کا نظام ہمارے یہاں سے کس طرح مختلف ہے۔ ہمارے یہاں اساتذہ کو منتخب کرنے کا جو طریقہ برتا جا رہا ہے اس کے بارے میں آپ سب واقف ہیں۔ یہاں پر اساتذہ کے انتخاب میں عام طور پران پیمانوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ کیا اُمیدوار نے بی۔ایڈ کی ڈگری حاصل کی ہے یا نہیں؟ جہاں اُمیدوار دستیاب نہ ہوں، جیسے پسماندہ طبقات کی فہرست میں، تو ایسے موقعوں پر کبھی کبھار بی۔ایڈ کی ضرورت کو بھی محسوس نہیں کیا جاتا ہے۔ اِس بات پر بھی غور فرمائیں کہ یہاں پر خواہش مند اُمیدوار کو اُستاد منتخب کرتے وقت اُسے عرف عام میں جنرل لائن (General Line Teacher) کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مذکورہ اُستاد ہر فن مولا ہے اور ہر ایک موضوع (Subject) پڑھانے کا اہل ہے۔ مثال کے طور پر انتخاب کے وقت ہر ایک اُمیدوار نے بی۔ایڈ کرنے کے ساتھ ایک تو 'نباتیات' میں اور دوسرا 'اردو زبان' میں 'ایم۔اے' (ماسٹرس) کی ڈگری حاصل کی ہو اور ہر صورت میں اِس فہرست میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ یہی دو ڈگریاں رکھنے والے لوگ ہیں۔ یوں سلیکشن کمیٹی نے میرٹ کی بنیاد پر بس ان ہی امیدواروں کو منتخب کر لیا۔ چونکہ یہ 'جنرل لائن' اُستاد ہیں، انہیں استاد منتخب ہونے کے بعد جو بھی سبق پڑھانے کے لئے دیا جائے گا وہ انہیں پڑھانا ہی ہوگا۔

اِس کے برعکس ایران میں اساتذہ کو منتخب کرنے کا طریقہ ہم سے بالکل منفرد، جداگانہ اور پیشہ ورانہ ہے۔ وہاں پر پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اسکولوں میں کس مضمون کے اساتذہ کی ضرورت ہے۔ پھر اس حوالے سے وہاں اساتذہ کو منتخب کرنے کے لئے بارہویں جماعت سے کامیاب ہوئے امیدواروں کا ایک قومی سطح کا ٹیسٹ لیا جاتا ہے، جس سے وہاں ''کنکور'' کہا جاتا ہے جو بالکل اُسی طرز پر ہوتا ہے، جس طرز پر ہمارے یہاں لئے جانے والے قومی ٹیسٹ جسے یہاں عرف عام میں (NAET)

(National Assesment & Evaluation Test) کہا جاتا ہے۔
اس مجوزہ ٹیسٹ کے ذریعے خواہش مند امیدواروں کو مختلف مضامین میں منتخب کیا جاتا ہے اور پھر انہیں مکمل چار سال تک ''واحد شہید بہشتی دانشگاہِ فرہنگیان، تہران''
(Wahid Shaheed Bahishti Teacher Education University) کے مختلف کیمپسوں اور اس سے منسلک کالجوں میں ان منتخب امیدواروں کو بچوں کو پڑھانے کی تربیت دی جاتی ہے جو ہمارے یہاں کے بی۔ایڈ سے کئی صورتوں میں یکسانیت رکھتا ہے اور جب یہ اس امتحان میں کامیاب ہو جائے تو پھر انہیں مختلف اسکولوں میں تعینات کیا جاتا ہے اور آپ کو اس سلسلے میں یہ چونکا دینے والی بات بھی بتاتا چلوں کہ جس دن سے یہ تربیت کے لئے یونیورسٹی میں داخل ہو جاتے ہیں، اسی دن سے ان کی تنخواہ بھی واگذار ہو جاتی ہے۔مگر ان امیدواروں کے لئے شرط یہ ہوتی ہے کہ انہیں پہلے پانچ سال دور دراز دیہات میں لازماً خدمات انجام دینی ہوں گی۔ یہ بات ان کے منتخب ہونے کی بنیادی شرائط میں درج ہوتی ہے۔اب آپ خود نتیجہ اخذ کیجئے کہ ایران اور ہمارے درمیان تعلیم و تربیت کے میدان میں کتنی بڑا خلا پایا جاتا ہے اور ہم اس نظام سے کتنے پیچھے ہیں۔یہ ایک مشکل بات ہے۔کیونکہ جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ اس کے پس پشت دراصل مالیاتی امور کارفرما ہیں۔کیونکہ اگر ایسا طریقہ اپنانا ہے تو ہم اپنے اساتذہ کا انتخاب اس طریقے سے کر سکتے ہیں، جیسے ایم۔بی۔بی۔ایس اور دیگر پیشہ ورانہ کورسز کے لئے امیدواروں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔مگر شرط یہ ہے کہ کیا ہم انہیں تعلیم و تربیت دینے کے دوران تنخواہ دینے کے اہل ہو جائیں گے۔ایک بڑی عمارت تعمیر کرنا یا اسکول میں کمپیوٹر لگانے کو ہم جدید تعلیم کی حصولیابی نہیں کہیں گے بلکہ اسکول میں تجربہ گاہ، کمپیوٹر گاہ، کتب خانہ اور کلاس وغیرہ میں ماہرین کا ہونا تعلیم کی صحیح حصولیابی سمجھی جائے گی۔

تربیت یافتہ اور پیشہ ورانہ انسانی وسائل سے ہی مسائل کا حل تلاش کرنے کی اہلیت پیدا کی جا سکتی ہے۔یہ طریقہ کار ایران نے آج سے تیس سال قبل اپنایا ہے۔ ہندوستان ایران کے مقابلے میں بہت بڑا ملک ہے۔ہم بھی اس مقام کو آسانی سے پاسکتے ہیں۔

''واحد شہید بہشتی دانشگاہِ فرھنگیان، تہران'' اور ایران کی تعلیم وتربیت کے بارے میں بات ہورہی تھی کہ ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا۔ہم نے ادارے کے وضوخانے میں وضو کیا اور ساتھ والے نماز خانے میں ظہر کی نماز ادا کی۔اس کے بعد ہم واپس اسی کمرے میں پہنچے اور انہوں نے ہمارے لئے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ہم سب نے کھانا کھایا۔کھانا بڑا ہی لذیذ تھا۔یہاں میں اس سلسلے میں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ دانشگاہ میں ملازمین کے لئے دوپہر کا کھانا بنانے کی سہولیات بھی دستیاب ہیں۔کھانا کھانے کے بعد ہم نے یونیورسٹی کے مختلف شعبے دیکھے۔آخر پر ہم ایک کلاس میں گئے جہاں پر ریاضی کے پروفیسر منتخب اساتذہ کو ریاضی پڑھا رہے تھے۔اِن اساتذہ کے ساتھ ہم نے کچھ وقت گزارا اور درس وتدریس کے حوالے سے مفصل گفتگو کی۔اِس کے بعد ہم نے تمام تدریسی اور غیر تدریسی عملے کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اپنا قیمتی وقت مصروفیات کے باوجود ہمارے ساتھ گزارا۔تقریباً دن کے تین بجے کے قریب ہم وہاں سے نکلے اور نکلتے وقت یونیورسٹی کے احاطے میں شہید بہشتی کے سیاہ پتھر سے تراشے گئے مجسمے کے سامنے ڈاکٹر اسماعیل اعظمی کے ساتھ تصویریں بھی بنائیں۔

دن کے تین بجے سے شام تک ہم تہران کے خوبصورت بازاروں میں گھومتے رہے اور مختلف چیزوں کی قیمتیں جاننے کی کوشش میں لگے رہے۔یوں محسوس ہورہا تھا کہ قم کے مقابلے میں تہران میں چیزوں کی قیمتیں قدرے زیادہ ہیں۔یہ بات پہلے

بھی تہران آتے وقت ہمارے سفری رہنما جناب حبیب نے ہمیں بتائی تھی کہ اگر آپ کو چیزیں خریدنی ہیں تو آپ قم سے ہی خریدیں۔ کیونکہ ایک تو آپ وہیں پر ٹھہرے ہوئے ہیں، دوسرے یہ کہ تہران کے مقابلے میں قم میں چیزوں کی قیمت کم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تہران میں تاجر اپنے نفع کے علاوہ چیزوں پر زیادہ سے زیادہ اضافی خدمات (Service Charge) شہر کی مناسبت سے بڑھا رہے ہیں۔ ہم نے ہر طرح سے اس بات کی جانچ کی۔ ہم ایک دکان پر گئے جہاں سفری بیگ فروخت کیا جارہا تھا۔ ان کے پاس مختلف قسم کے بیگ تھے لیکن اس سے پہلے ہم نے قم میں بھی سفری بیگوں کی قیمت جاننے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ بیگ مختلف نوعیت اور معیار کے تھے لیکن ہمیں یوں لگا کہ جیسے قم کے مقابلے میں یہاں پر بیگ بہت مہنگے تھے۔ ایسے ہی ہم 'آئس کریم' کھانے کے لئے ایک دکان پر گئے۔ ہم نے مختلف قسم کی 'آئس کریم' کی قیمت کو جانچا۔ یہاں پر ہمیں محسوس ہوا کہ قیمت میں بھاری فرق واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح دوسرے دن ہم نے دوپہر کا کھانا ایک مقامی ریسٹورنٹ میں کھایا تو یہاں بھی قیمتیں قم کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ بات یہیں پر نہیں ٹھہرتی۔ باقی ماندہ اشیاء جیسے کپڑا، بنے بنائے کپڑے، خشک میوہ اور دیگر مصنوعات ان سب کی قیمت قم کے مقابلے میں کچھ زیادہ محسوس ہورہی تھی۔ اب آپ کے ذہن میں یہ سوال دستک دے رہا ہوگا کہ ہوسکتا ہے کہ قم کے مقابلے میں تہران کے بازاروں میں معیار اچھا ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے۔ کچھ جگہوں پر ہم نے ایک ہی معیار کی چیزیں بھی دیکھی۔ لیکن قیمت میں ایک واضح فرق محسوس ہورہا تھا۔ یہاں تک کہ ہوٹلوں کے کرائے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جس معیار کا ہوٹل آپ کو قم میں ایک ہزار ہندوستانی روپیہ میں مل سکتا ہے، اُسی معیار کا ہوٹل آپ کو تہران میں تین ہزار روپے میں مل جائے گا۔ بند مصنوعات (ڈبے یا لفافے میں بند چیزیں)، برقیاتی

اشیاء(Electronic Items) جیسے موبائل فون وغیرہ، سگریٹ، ادویات جیسی اشیاء کی ایک ہی قیمت ہر جگہ دستیاب ہے۔

نقل وحمل میں بھی واضح فرق دکھائی دے رہا تھا۔اکثر اوقات ہم نے پایا کہ اگر گاڑی قم کی ہے تو تہران کی گاڑی کے مقابلے میں کم قیمت طلب کرے گی۔لیکن ایک بار ایسا بھی ہوا کہ تہران کے گاڑی والے نے قم کی گاڑی والے کے مقابلے میں ہم سے کم قیمت طلب کی۔آپ کو یہ بات بھی بتا تا چلوں کہ اگر آپ اب قم میں ہیں اور گھر کے لئے کسی چیز کی خریداری کرنے جا رہے ہیں تو اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ آپ خریداری وہیں سے کریں جہاں سے بہتر چیزیں دستیاب ہوں۔جیسے حضرت فاطمہ معصومہ یا امام عسکری مسجد کے آس پاس والے بازار میں آپ کو سستی چیزیں ضرور ملیں گی لیکن ان کا معیار اچھا نہیں ہوتا ہے۔خاص کر خشک میوہ خریدنے کے حوالے سے خبر دار رہیں۔وہاں آپ کو خشک میوہ بہت ہی سستے داموں ملے گا لیکن وہ معیاری نہیں ہوتا ہے۔آپ وہاں سے تھوڑا سا میوہ خریدیں اور پھر وہی میوہ دوسری جگہ سے بھی لیں اور پھر اسے بڑے احتیاط سے جانچنے کی کوشش کریں' آپ کو لذت اور معیار کے اعتبار سے ان میں کافی تفاوت نظر آئے گا۔دیکھنے میں دونوں ایک جیسے ہی نظر آئیں گے۔ حالانکہ اِسی بازار کے قریب تھوڑا سا اندر کی جانب کچھ ایسے بازار بھی ہیں جہاں پر بہتر چیزیں خاص کر کپڑے اور خواتین کی چادریں موجود ہیں۔چونکہ آپ ایک ملک سے دوسرے ملک چیزیں لے جانے والے ہیں' ایسے میں ہوسکتا ہے کہ کبھی کبھار کسٹم بھی اِن اشیاء پر مسولات لگا سکتا ہے۔اس لئے بہتر ہے کہ چیزیں اچھی ہی لائیں اور ساتھ میں دکاندار سے بل بھی طلب کریں، جو سفر کی ایک اہم شرط ہے۔

ادویات کے معاملے میں یہ بات آپ کو بتانا لازمی سمجھتا ہوں کہ ایران میں ادویات کافی سستی ہیں۔اتنی سستی کہ میں نے پہلی بار ادویات لیتے وقت یہ سوچا کہ

ہوسکتا ہے کہ دوا فروش نے قیمت غلط بتائی ہے۔کیونکہ ہندوستان میں یہی دوا کافی مہنگی دستیاب ہے۔ میرے طبیب نے جو ادویات مجھے تجویز کی ہیں' اُن کی قیمت ہندوستان میں ایران کے مقابلے میں پچاس فی صد سے بھی زیادہ ہے اور کئی ادویات میں تو مجھے پچھتر فی صد سے بھی زیادہ کا فرق محسوس ہوا۔جیسے میں ایک ایسی دوا روزانہ لیتا ہوں جس کے اندر ''رزوواسٹاٹین'' (Rosuvastatin) نامی سالٹ ہے۔ جو دوا میں ہندوستان میں لیتا ہوں اُس کا نام ''کرسٹر 20'' (Crester 20mg) ہے جو یہاں کی مشہور ومعروف دوا ساز کمپنی ''ایسٹرا زینکا'' (Astra Zeneca) تیار کرتی ہے اور اس کے دس قرصوں (Tablets) کی قیمت 336 روپیہ ہے۔ وہیں میں کبھی کبھی اِس کی جگہ ایک اور داوئی بھی لیتا ہوں جو ''سن فارما لائبارٹریز'' نامی مشہور کمپنی نے بناتی ہے اور جس کا نام ''روزوواس۔ 20'' (Rosuvas 20) ہے جس کے دس قرصوں کی قیمت بازار میں 497روپیہ ہے۔ یہ ہندوستان میں بہترین دواساز کمپنیاں ہیں۔اس سلسلے میں کسی بھی عام کمپنی کا بنایا گیا یہی سالٹ بازر میں دس قرصوں کی قیمت کے حساب سے کم از کم 275/= روپیہ تک دستیاب ہوسکتا ہے۔اب دیکھئے یہی دوائی میں نے ایران سے بھی خریدی اور جس کا نام ''رزورکسین۔20'' (Rosurexin 20mg) ہے۔ اُن کے بقول وہاں کی ایک بہتر اور اعلیٰ دواساز کمپنی ''اکٹوورکو'' (Actoverco) نے تیار کیا ہے اور اس کے دس قرصوں کی قیمت ہندوستانی کرنسی کے مطابق 51/= روپیہ ہے۔ یہاں میں صرف اس دوائی کی ہی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ ہر ایک دوائی جس کی قیمت معلوم کی وہ ہندوستان کے مقابلے میں کافی کم قیمت میں دستیاب تھی۔جیسے میں ایک اور دوائی روزانہ لیتا ہوں اور جس کے سالٹ کا نام ''میٹفورمین'' (Metformin) ہے اور اِس سالٹ کی جو دوائی میں ہندوستان میں لیتا ہوں اُس کا

نام ''ایکس میٹ ۔ایس آر۔500 ''(SRXmet 500mg) ہے جو یہاں ''گلین مارک''(Glenmark) نامی معروف دوا ساز کمپنی تیار کرتی ہے اور اُس کے پندرہ قرصوں کی قیمت/=28 روپیہ اور 37 پیسہ ہے۔کبھی کبھار میں اس حوالے سے اسی داوئی کی دوسری ایک قسم جو کہ ''مائکرو لیبس لمیٹڈ'' Micro Labs (Limited) نامی ایک مقامی کمپنی تیار کرتی ہے جس کا نام ''میلمیٹ۔ایس آر۔500'' (Melmet SR 500) ہے جس کے بیس قرصوں کی قیمت بازار میں 40روپیہ اور 10 پیسے ہے۔یہاں میں یہ بات دہرانا چاہتا ہوں کہ اِس حوالے سے کسی بھی عام وخاص دوا ساز کمپنی کی بنائی گئی یہی دوا بازر میں دس قرصوں کی قیمت کم ازکم/=20 روپیہ تک ہوسکتی ہے۔یہاں بھی اب آپ تفاوت کا مظاہرہ دیکھئے کہ یہی دوائی میں نے ایران سے لائی اور جس کا نام ''میٹفورٹکس''(Metfortex 500) ہے جو وہاں کے دوا فروش کے مطابق ایران کی ایک بہترین دوا ساز کمپنی ''تہران شیمی'' نامی دوا ساز کمپنی نے بنائی ہے اور اس کے دس قرصوں کی قیمت ہندوستانی کرنسی کے مطابق سات 8 روپیہ ہے۔یہاں میں صرف ان دوائیوں کی بات ہی نہیں کرتا بلکہ ہر ایک دوائی جس کی میں نے قیمت معلوم کی وہ ہندوستان کے مقابلے میں کافی سستی تھی۔

خیر تہران میں خوب گھومنے کے بعد ہم سات بجے کے قریب واپس خیابانِ لالہ زار کے ''ہوٹل مرکزی ایران'' پہنچے اور کچھ دیر بیٹھنے اور وضو کرنے کے بعد ہم نے موبائل ایپ سے ایک بار پھر ٹیکسی کا انتخاب کیا۔کیونکہ ہمیں آج عشائیہ پر ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب نے دعوت کی تھی۔ہوٹل سے کیا باہر نکلے کہ ٹیکسی حاضر تھی۔ہم ڈاکٹر صاحب کے گھر کے قریب ہی ٹیکسی سے اُترے اور ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب کا انتظار کرنے لگے۔جب تک ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب پہنچتے۔تب تک ہم خشک اور

سبز میوؤں کے بھاؤ معلوم کرنے میں مصروف ہوئے۔ یہاں پر زیادہ تر میوہ فروش اخروٹ فروخت کر رہے تھے۔ اخروٹوں کی قیمت آٹھ سو روپیہ فی کلو تھی، یہ کشمیری اخروٹوں کی مانند ہی نظر آ رہے تھے۔ کشمیر میں بھی اخروٹوں کی تقریباً یہی قیمت ہے۔

مجھے اخروٹ دیکھ کر کشمیر کے مشہور شاعر حکیم منظور یاد آ گئے۔ اردو شاعری میں خوبصورت آنکھوں کے لئے بادم سے بہتر تشبیہہ نہیں سوجھتی لیکن اس کے برعکس اخروٹ کا نصیب ایسا کہاں۔ حالانکہ اگر غذائی اہمیت دیکھی جائے تو اخروٹ کی شان بھی کچھ کم نہیں۔ شعری مناسبت سے اخروٹ کی خوبیاں اگر کسی کو نظر آئیں تو وہ حکیم منظور ہی ہیں۔ انہیں کشمیری اخروٹوں کی بنیادی ساخت کو دھیان میں رکھتے ہوئے محسوس ہوا کہ ہم انہی روایتی لفظوں کو نئے معنوں میں زیادہ خوبصورتی کے ساتھ برت سکتے ہیں اور وہ اس تجربے میں اتنے کامیاب ہوئے کہ حکیم منظور کی منفرد اور الگ لفظیات سامنے آنے لگی۔ لفظ 'اخروٹ' کا استعمال، وہ بھی اس کی اصوات کے ساتھ ،سخت درد کو ایک نئے انداز میں برتنے کے مترادف ہے۔ شاید حکیم منظور کو ایرانی اخروٹ کے لہجے کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ وہ ان سے یہ سوال لازماً کرتے کہ کشمیری اخروٹ کے ٹوٹنے پھوٹنے کے وقت تمہارے اخروٹ کا لہجہ کیوں نرم پڑ جاتا ہے؟

تمہارے آموں پہ کیا گزرتی ہے جانتا ہوں
لہو ہیں اخروٹ میرے، موسم کی سازشوں سے
نئی سماعت کے زاویئے سب، تمہارے منظورؔ بس تمہارے
تمہارا اخروٹ جیسا لہجہ دلوں میں موصول ہو گیا ہے
کس لئے اخروٹ کے چھلکوں سے رِستا ہے لہو
کون رکھتا ہے یہاں اس کی خبر میرے سوا

اسی دوران ڈاکٹر اسماعیل اعظمی صاحب ہمیں لینے آئے۔ ہم ان کے ساتھ ان

کے گھر کی طرف چل دیئے۔وقت شام کے آٹھ کے قریب قریب کا تھا۔آفتاب اپنا منہ چھپانے کی کوشش میں تھا۔البتہ ابھی پوری پردہ داری بھی نہیں ہوئی تھی۔تہران کی سڑکوں کا کوئی جواب ہی نہیں اور شام کے اس خوبصورت عالم میں تہران کی یہ راہیں اور بھی حسین نظر آرہی تھیں۔جیسے یہ کوئی رومانوی رقص پیش کررہی ہوں۔ہر کوئی اپنے کاروبار اور اپنے کام میں مگن تھا۔اِسی دوران ہم ایک چوراہے پر پہنچے جہاں بیچ چوراہے پر ایک خوبصورت نوجوان جوڑا،جن کی عمریں اُنیس بیس،قد وقامت میں قیامت کی تاثیر،لباس میں عجب یکسانیت تھی۔لڑکے نے جینس کی شلوار اور لڑکی نے جینس کی قمیض پہنی تھی۔جہاں لڑکے کی سیاہ اور لمبی داڑھی اس کے چہرے پر نور بکھیر رہی تھی وہیں لڑکی نے اپنی زلفیں اسکارف میں چھپانے کے باوجود اپنی لٹکتی لٹ جو کمر پر لڑکے کے دونوں ہاتھوں اور بازوؤں کو گھڑی کے پینڈولم کی مانند جھولتی ہوئی ہر لمحہ چھوتی جارہی تھی۔دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے،ایک دوسرے کو سینے سے لگائے لب بوسی میں یوں مست تھے کہ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے ہم ''شکاگو'' کی سڑکوں پہ چل رہے ہوں۔ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔لیکن منظر اتنا دلکش تھا کہ پھر انہیں کی طرف دیکھنے لگے۔ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب نے نہ ان کی طرف غور فرمایا نہ ہماری طرف توجہ کی بلکہ وہ فوراً ہم سے آگے بڑھ گئے۔جب تک نہ ہم سے یہ سڑک اوجھل ہوگئی' ہم مڑ مڑ کے نظارہ جمال کرتے رہے۔مجھے فلم ''راجہ ہندوستانی'' کا وہ یادگار منظر یاد آرہا تھا' جہاں لب بوسی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور میں گھر والوں کے سامنے شرمندہ ہوا۔ایک تو میں کچا پکا نمازی اور اس پہ طرہ یہ کہ نماز کا وقت نہ ہونے کے باوجود میں نے اُٹھتے ہوئے کہا کہ نماز کے لئے دیر ہورہی ہے۔لیکن 'شہزادہ ایرانی' کو کون بتا تا کہ یہ چوراہا ہے' پالم کھیت' نہیں۔راہ گیر بھی دل رکھتے ہیں،اُن کے بھی جذبات ہوتے ہیں اور دوم یہ ''جمہوریہ ایران''

نہیں بلکہ ''اسلامی جمہوریہ ایران'' ہے۔

شیریں فرہاد کی داستانیں اس سرزمین سے وابستہ ہونے کے بموجب، یہاں ایسے دیوانے نظر آ ہی جائیں گے جو عشق میں پہاڑ کا سینہ چیر سکتے ہیں۔ ایسے میں اُنہیں 'چوراہے' سے کیسا ڈر۔ اس طرح کا واقعہ میرے لئے ایران کے سفر کے دوران پہلا اور آخری تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ حکومت ایران ایسے واقعات کی طرف توجہ نہیں دیتی۔ کیونکہ اس کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے؟ وہ یہ کہ پرویز نے فرہاد کو سمجھانے کی بارہا کوششیں کی۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اسے پربت کاٹ کر نہر سے پانی لانے کو بھی کہا گیا اور اس نے کر کے دکھایا۔ اس لئے ایسے دیوانوں کے ساتھ الجھنے سے بہتر ہے کہ دور ہی رہا جائے۔ غالب اِس بابت فرماتے ہیں:

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

دراصل میں نے ایران میں ایک بات کا جائزہ لیا کہ یہاں پر حکومت نے بہ زور بازو اصلاحات کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مثلاً پردہ کرنا وہاں کے آئین کی شق میں شامل ہے۔ لیکن جہاں آپ اکثر عورتوں کو باپردہ دیکھیں گے، وہیں پر آپ کو عورتوں کی ایک بڑی تعداد بے پردہ بھی نظر آئے گی جن پر کسی بھی طرح کی زورزبرستی نہیں کی جاتی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس سلسلے میں ایران کی حکومت تھوپے جانے والے طریقہ کار پر عمل درآمد کرنے میں یقین نہیں رکھتی بلکہ وہ عوام کے اندر ذہنی بیداری میں ہی یقین رکھتی ہے۔ اس کے برعکس افغانستان میں ایک مدت تک زبردستی عورتوں کو پردہ کروانے کی کوشش کی گئی یا مردوں سے داڑھی رکھوائی گئی جو آخرکار ایک لاحاصل

طریقہ ثابت ہوا۔اس سے بدترین انداز میں کئی ایک ممالک جن میں خاص کر وسطی ایشاء کے مسلماں ممالک یا پھر ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے' جہاں زبردستی عورتوں کو بے پردہ رہنے کی تلقین کی گئی۔ یہ طریقہ کار بھی کارآمد ثابت نہ ہوسکا لیکن اس کے برعکس ایرانی حکومت ایرانیوں کے ذہن ودل پر حکومت کرتی ہے۔وگرنہ جتنی اور جیسی بین الاقوامی معاشی پابندیاں ایران پر اس وقت عائد کی گئی ہیں جن میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اگر اس کے نصف جیسی پابندیاں کسی اور ملک پر ہوں تو وہ ٹوٹ کے بکھر جائے گا۔لیکن اس کے باوجود ایران نے اپنے عوام کو ہر صورت میں خوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔ان بین الاقوامی پابندیوں کے باوجود میں نے وہاں پر جس طرح کی سیاحتی سرگرمیاں عروج پر دیکھی' ایسی سرگرمیاں مجھے ہندوستان میں کسی بھی جگہ نظر نہیں آرہی ہے۔اس کی ایک اہم وجہ امن امان اور صفائی ہے۔وہیں دوسری وجہ نظم ونسق اور اشیاء کی قیمتوں کا اعتدال میں ہونا۔تیسری وجہ سیاحت کے لئے بنیادی ڈھانچہ،جس کی وجہ سے ایران آہستہ آہستہ بین الاقوامی سیاحت کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔چوتھا زیارتی سفر، پانچواں ایرانی خودسیر وسیاحت کے کافی دلدادہ ہیں۔میں نے اپنے سفر کے دوران وہاں کے باغات، نیز سیر وسیاحت کے لئے وقف مقامات کو کھچا کھچ بھرا دیکھا اور پایا کہ ایرانی ہمیشہ رات کا کھانا گھر میں تیار کر کے باہر کھاتے ہیں۔ میں ان قارئین جو سیر وسفر میں دلچسپی رکھتے ہیں، انہیں اپنے تجربوں کی بنیاد پر مشورہ دیتا ہوں کہ ایران سیاحت کے لئے ایک بہترین جگہ ہے اور اگر آپ کسی ملک کے سفر پر جانے کی سوچ رہے ہیں تو ایسے میں اولین ترجیح ایران کو دیں۔

اسی دوران ہم ٹہلتے ٹہلتے ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب کے گھر پہنچے۔یہ عمارت چار منزلوں پر مبنی تھی۔ تیسری منزل میں ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب رہائش پذیر تھے۔اِس عمارت کے بنیادی دروازے پر چار برقیاتی گھنٹیوں کے بٹن نصب کئے گئے

تھے۔اس عمارت کی ہر جانب ایسی ہی دیدہ زیب عمارتیں بڑے ہی سلیقے سے تعمیر کی گئی ہیں۔ یہ عمارتیں سنگ مرمر سے کچھ زیادہ ہی جاذب نظر دکھتی ہیں۔ عمارتوں کے درمیان کشادہ اور صاف وشفاف سڑکوں پر تارکول کے بجائے ایک ہی قسم کے دار چینی رنگ کے سلسیان کے راہ پائے بچھائے گئے تھے۔ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب نے ان برقی بٹنوں میں سے تیسرا بٹن دبایا۔ چند لمحات کے بعد اندر سے بڑے دروازے کے چھوٹے سے اسپیکر پر فارسی زبان میں آواز آئی کہ کون ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے فارسی کے بجائے ترکی زبان میں جواب دیا کہ میں ہوں۔ بعدازاں ہمیں پتہ چلا کہ یہ دونوں میاں بیوی اصفہان کے اس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں ترکی زبان بولی جاتی ہے۔اس طرح دونوں میاں بیوی کی مادری زبان ترکی ہے۔یوں یہ جب آپس میں بات کرتے ہیں تو یہ اپنی مادری زبان میں ہی بات کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھی امتیاز احمد نے بتایا کہ ان کی فارسی زبان میں بھی اصفہانی لہجہ صاف ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔حالانکہ ہم اس بارے میں کسی بھی طرح کی واقفیت نہیں رکھتے ہیں۔

بہر حال جوں ہی انہوں نے جواب دیا کہ میں ہوں ؛تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔ یہ ایک بہترین جدید طرز عمل ہے کہ آپ کو یہ جانکاری حاصل ہو جائے کہ کون آ رہا ہے۔ یہاں ایران میں اکثر دروازوں پر سمعی اور بصری آلات نصب کئے گئے ہیں تا کہ آپ آنے والے کے بارے میں باخبر رہیں۔ اس طرح دروازہ کھلنے کا نظام بالکل محفوظ اور کارآمد ہے۔ ہندوستان میں ابھی تک عام سطح پر یہ نظام رائج نہیں ہوسکا ہے۔ یہاں ہم نے لفٹ کا سہارا نہیں لیا بلکہ ہم سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل تک پہنچ گئے۔ جناب عظیمی صاحب نے ہلکے سے دروازہ کیا کھٹکھٹایا کہ دروازہ اندر سے فوراً کھولا گیا۔ اندر سے مسکراتی ہوئی ایک پری صورت شخصیت نے دلکش آواز میں دروازہ کھولتے ہی کہا ’سلام ۔۔سلام‘۔ یہ ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب کی شریک حیات

محترمہ بیوزہرہ شکر اللہی صاحبہ تھیں جن کا اسم گرامی بالکل ان کے قد وقامت کی طرح نہایت ہی نازک تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے ہمارا تعارف کروایا۔ انہوں نے بڑے ہی احترام اور عزت سے ہمیں اندر آنے کو کہا۔ ہم حیران رہ گئے کہ وہ انگریزی بھی سمجھتی اور بول سکتی ہیں۔ جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ ترکی میں بات کر رہی تھیں ‘ وہیں انہوں نے جناب امتیاز احمد کے ساتھ فارسی زبان میں بات کی اور ہمارے ساتھ انگریزی زبان میں کما حقہ اہلیت کے سات گفتگو کی۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں جہاں ایران میں اکثر و بیشتر عام وخواص فارسی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں بول اور سمجھ سکتے ہیں‘ وہیں یہ گھریلو خاتون محترمہ بیوزہرہ شکر اللہی صاحبہ تین بین لاقوامی سطح کی زبانوں میں بات چیت کرنے کے ساتھ ساتھ ایک خاتون خانہ بھی ہیں۔ اسی بیچ ایک کمرے سے ان کا ہنستا کھیلتا مگر نہایت شرمیلا تقریباً پانچ سے چھ سال کی عمر کا چھوٹا سا بیٹا ‘ارشا‘ ہمارے سامنے آیا اور ہمیں سلام کیا۔ شرمیلا ہونے کے باوجود وہ ہم سے جلد ہی گھل مل گیا۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ محترمہ بیوزہرہ شکر اللہی صاحبہ نے ایسی چائے پلائی کہ تمام تھکن یکسر دور ہوگئی۔ چائے پینے کے بعد ہم نے فوراً مغرب کی نماز (جو اَب قضا ہو چکی تھی) ادا کی۔

اصل میں ہمارا مقصد بھی تھا کہ ہم ایران میں کسی کے گھر جا کے وہاں کی طرزِ زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کریں۔ ہم ایران سے وابستہ دونوں طرح کی زندگیوں کا نزدیک سے مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ ایک شہری زندگی ، دوم دیہاتی زندگی۔ یہاں ہم شہری زندگی کا مشاہدہ کر رہے تھے کہ ایران کے شہر کے لوگ کس طرح سے زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کے بعد ایران کے حوالے سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔ جیسے راقم نے ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب سے ایک سوال یہ پوچھا کہ ان حالات میں جب آپ بین الاقوامی پابندیوں کے حصار میں جی رہے ہیں‘ ایسے میں

آپ کی زندگی کتنی مشکل ہے؟ ان کا جواب بھی باقی ایرانیوں کی طرح تھا کہ ہماری زندگیوں پر اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہے اور ہم ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔ چونکہ ان کا تعلق تعلیم و تربیت سے تھا، اس لئے ہم نے تعلیم و تربیت کے حوالے سے کئی ایک سوالات پوچھے۔ وہیں ہم نے یہ سوال بھی کیا کہ آپ اپنے بیٹے 'ارشا' کا اندارج کس اسکول میں کرائیں گے؟ ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب نے پوچھا 'کس اسکول میں' سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ تو ڈاکٹر حبیب نے کہا کہ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کس نجی اسکول میں۔ ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب نے بنا کسی جھجک کے فوراً جواب دیا 'سرکاری اسکول میں'۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کے بعد ہم نے اُن سے پوچھا کہ اِس کی کیا وجہ ہے؟ ہندوستان میں تو لوگ نجی اسکولوں کو ہی ترجیحی دیتے ہیں تو انہوں نے اس کا بھی فوراً جواب دیا کہ دراصل ایران کے نجی اسکول، سرکاری اسکولوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سرکاری اسکولوں میں ہر طرح کی سہولیات دستیاب ہیں۔ کشادہ جگہ ہے، بہترین عمارتیں ہیں، کھیلنے کے لئے اعلیٰ انتظامات ہیں، اچھے اساتذہ ہیں، مفت تعلیم میسر ہے۔ ایسی سہولیات ایران کے نجی اسکولوں میں دستیاب نہیں ہیں اور اس پہ طرہ یہ کہ نجی اسکولوں میں آپ کو بھاری فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب تعلیم و تربیت کے ماہر ہیں' اس لئے وہ اس بارے میں بخوبی اور گہری واقفیت رکھتے ہیں۔

لیکن انہوں نے ہم سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ اپنے بچوں کو کہاں پڑھاتے ہیں؟ اور اگر پوچھتے تو ہم کیا جواب دیتے؟ ہندوستان میں تو ایسے معاملات میں الٹی گنگا بہتی ہے۔ یہاں تو سرکاری اسکولوں کی حالت اتنی خراب ہے کہ غریب سے غریب تر شہری بھی اپنا پیٹ کاٹ کے بچوں کا اندارج نجی اسکولوں میں کرواتا ہے۔ یہاں سرکاری اسکولوں میں کشادہ جگہ کیا، بچوں کو بیٹھنے کے لئے جگہ نصیب نہیں ہوتی ہے۔ حالانکہ

یہاں نجی اسکولوں کے برخلاف بہترین اساتذہ ہونے کے باوجود سرکاری اسکولوں کے نتائج اتنے خراب آجاتے ہیں کہ سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ بے شک ایران اور ہندوستان کے نظام تعلیم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ ہم یہاں بھی ایران سے مات کھا گئے۔ ہم ایران سے کسی ایک میدان میں جیتنا چاہتے تھے! لیکن ایسا ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔

اقبال فرماتے ہیں:

مرید ہندی

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خون
علم حاضر سے ہے دین زار و زبوں!

پیر رومی

علم را بر تن زنی مارے بود!
علم را بر دِل زنی یارے بود!

اصل میں دماغ کے علم پر دل کے علم کو ترجیح دینی ہے۔ وہیں سے تہذیب بنتی ہے۔ چونکہ ہم اب تک دل کے علم پر دماغ کے علم پر ترجیح دیتے آئے ہیں، یوں ہماری تہذیب بننے کی بجائے بگڑنے لگی۔ تہذیب کے اندر بگاڑ پیدا ہونے کے بموجب ہماری تہذیب میں 'بد' کی علامت اس طرح شامل ہوئی کہ ہماری آنکھوں پر ایسا پردہ طاری ہوتا چلا گیا کہ ہمیں اس 'بد' کے اندر 'نیک' کے عناصر نظر آنے لگے۔ یوں یہ بد نیک میں ایسے تبدیل ہوتا گیا کہ ہمیں بد اور نیک کی تمیز کا اندازہ لگانا اتنا مشکل ہو رہا ہے کہ ہم نیک کو بد اور بد کو نیک کہہ رہے ہیں۔ صحت مند اقدار کی بازیافت سے پہلے ہمیں ماضی کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے جو جاندار اور صحت مند چیزیں ہمارے اسلاف ہمارے لئے چھوڑ جاتے ہیں یا ہمارے سپرد کرتے ہیں یا جن کی ہم نقل کرتے

ہیں وہی روایت ہے اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب روایات کا دوسرا نام ہے۔تہذیب کو ہم انسانیاتی (Anthropological) معنوں میں انسان کا سماجی ورثہ کہہ سکتے ہیں۔حالانکہ اِس تہذیب میں وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی رونما ہوتی ہیں۔لیکن تہذیب کے اعتبار سے یہ تبدیلیاں اعلیٰ صفات کی ہوں تو ان میں بگاڑ نظر نہیں آئے گا۔اسے پانے کے لئے لازمی ہے کہ انسان تاریخی شعور رکھتا ہو اور وہ تاریخی شعور ایرانیوں کے پاس ہے۔انہوں نے کسی بھی چیز کی آنکھ بند کر کے تقلید نہیں کی ہے۔اگر چہ ان کی تاریخ میں رزتشتیت پوشیدہ ہے،لیکن انہوں نے اسے اس طریقے سے زندہ رکھا ہے کہ نہ ہی اسلام کی روح اثر انداز ہوئی ہے اور نہ ہی تاریخی حقائق مسخ ہوئے۔

بہرحال'ایک طویل معلومات افزا گفتگو کے بعد آخر کار کھانے کے لئے دسترخوان بچھایا گیا۔ہمیں معلوم ہوا کہ ترکی زبان میں دسترخوان کو دسترخوان ہی کہا جاتا ہے۔دیکھتے ہی دیکھتے یہ دسترخواں جیسے جنت کی نعمتوں سے بھر دیا گیا۔دراصل تہذیب ہر ایک چیز سکھاتی ہے۔اس کا اندازہ دسترخواں پر بچھائی گئی کھانے کی مختلف اشیاء کو سلیقے سے رکھنے سے ہی معلوم ہو جاتا تھا۔ایک پلیٹ میں سفید چاولوں کو زریں چالوں کے بیچ میں بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ متوازی انداز میں رکھا گیا تھا اور سفید چاولوں کے اوپر انار کے دانوں کا جیسے چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔دو الگ الگ پلیٹوں میں بکرے کے گوشت کے بُنے ہوئے کباب اور مرغے کے گوشت کو بُنا گیا تھا۔ایک طرف بُنے ہوئے ٹماٹر اور دوسری طرف ہلکے بُنے ہوئے انگور رکھے گئے تھے۔دو الگ الگ چھوٹی ٹوکریوں میں مختلف قسم کی روٹیاں رکھی گئی تھیں۔ایک دوسرے بڑے سے پلیٹ میں سلاد کی صورت میں مختلف قسم کی تازہ سبزیاں خوب صورتی سے کاٹی گئی تھیں۔اسی طرح میٹھی دہی پر خشک پودینے سے ضرب کا نشان لگایا گیا تھا اور ایک

منفرد پھلوں کا رس بھی سامنے گلاس میں رکھا گیا تھا جس پر سجاوٹ کے لئے ایک چھتری نما چھوٹا سا دانت خلال رکھا گیا تھا۔کھانے کی سب سے بڑی عمدگی یہ تھی کہ کھانا بنانے ، بچھانے حتیٰ کہ برتن اُٹھانے کے دوران ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب کی شریک حیات محترمہ بیوزہرہ شکراللہی صاحبہ نے کبھی بھی اپنے شوہر سے کسی بھی طریقے کی مدد طلب نہیں کی ۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ اپنے شوہر کو ہمارے ساتھ گفتگو کرنے کے دوران کسی بھی صورت میں پریشاں نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ اگر ڈاکٹر صاحب نے اٹھنے کی کوشش بھی کی تا کہ وہ ان کی مدد کریں۔لیکن اُن کی بیگم نے منع کرتے ہوئے اُن کی توجہ اس طرف مبذول کروائی کہ 'بہتر یہی ہے کہ آپ اس وقت اپنے مہمانوں کے ساتھ مشغول رہیں'۔

میں بارہا ان کی اس طرز زندگی کو دیکھ کر 'چشم بددور' کا ورد کر رہا تھا۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظر خوشی اور محبت کی بھی لگ جاتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی ابھی ایسی شائستگی زندہ ہے،شاید یہ ایرانی تہذیب کا ہی اثر اور ورثہ ہے۔کھانا کھانے کے بعد انہوں نے مختلف قسم کے میوے لائے۔حالانکہ ہم نے کافی کھانا کھایا تھا۔لیکن اُن کے اصرار پر ہم نے اپنی طبیعت اور مرضی کے مطابق میوے لئے۔میں نے سیب لیا، باقی لوگوں نے انگور، کیلا، انار، ناشپاتی، خوبانی وغیرہ جسے جو پسند آیا اس نے وہ کھا لیا۔آپ یہ نہ سمجھیں کہ کھانے پینے کا اختتام ہوگیا۔میوہ کھانے کے بعد جب ہم نے رخصت طلب کی تو ڈاکٹر اسماعیل عظیمی صاحب کی شریک حیات نے ہمیں روکا اور کہا کہ میں نے چائے بنائی ہے۔حالانکہ اب کھانے پینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔لیکن ایرانیوں کی مہمان نوازی اور خلوص کے سامنے کیا کہا جا سکتا تھا۔بہر کیف' انہوں نے چائے لائی۔یہ یہاں کی مقامی چائے تھی۔ جسے یہاں پر ''چائے تُرش'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس کا ذائقہ ہلکا سا کھٹا تھا اور اس کا رنگ ایک دم

گلابی۔ 'چائے ترش' کے ساتھ انہوں نے تہران کی مشہور شیرینی (Pastry) لائی جس کا منفرد ذائقہ تھا۔ ذائقوں بھرے کھانوں کا یہ سلسلہ کسی طرح سے اختتام کو پہنچا اور ہم تقریباً رات کے بارہ بجے وہاں سے نکلے۔ لیکن نکلتے وقت بھی انہوں ہم تینوں کو الگ الگ مٹھائیوں سے بھرے بیگ پیش کئے۔ حالانکہ ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ نہ لیں لیکن ان کی محبت اور خلوص کے سامنے ہم ایک بار پھر ناکام ہو گئے۔ دل چاہتا کہ ایک بار پھر کبھی زندگی میں اگر ایران گئے تو ڈاکٹر اسماعیل عظیمی اور محترمہ بیو زہرہ شکرالٰہی کے گھر ضرور جائیں۔ کیونکہ وہ ذائقے زبان سے جانے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔

آج اتوار 28 جولائی کا سفر میرے لئے ایران کا اہم ترین سفر تھا۔ آج ہم تہران یونیورسٹی کے غیر ملکی زبانوں کے ادارے میں گئے جہاں ہمیں ''شعبہ اردو'' کا جائزہ لینا تھا۔ دراصل ایران جانے سے پہلے ہی اگر میں نے کسی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو وہ شعبہ اردو، دانشگاہ تہران کے اساتذہ ہیں، جنہوں نے میری صحیح رہنمائی فرمائی جن کے رابطہ نمبرات مجھے اپنے رفیق کار ڈاکٹر الطاف انجم صاحب نے مہیا کئے۔ ان میں پروفیسر محمد کیمرثی صاحب، صدر شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی، پروفیسر آغا علی بیات صاحب، پروفیسر وفا یزدان منش صاحبہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حالانکہ میں نے تہران یونیورسٹی کی ویب گاہ پر رابطے ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی لیکن وہاں پر مکمل رابطے نہیں دیئے گئے تھے، یوں تمام اساتذہ کے رابطے موصول نہیں ہو پائے۔ خاص کر آج کی دنیا میں ویب گاہوں پر رابطے کی تمام معلومات مکمل طور مہیا ہونی چاہئے۔ اگر یونیورسٹی کی ویب گاہ پر یہ تفصیلات رکھنے کی گنجائش نہیں ہے تو ایسی عوامی شخصیات کو اپنے رابطے عوامی ذرائع ابلاغ پر خاص کر محققوں کے لئے مہیا رکھنے چاہئے۔ خاص کر وہاں پہنچ کر مجھے ڈاکٹر علی کاوسی نژاد صاحب سے مل کر یوں محسوس ہوا

کہ اگر ان سے پہلے رابطہ ہوا ہوتا تو شاید ہماری اور بہتر رہنمائی ہوئی ہوتی، شاید میں نے کرمانشاہ کا بھی سفر کیا ہوتا۔ پروفیسر محمد کیمرثی صاحب کو میں نے پہلے کئی ایک پیغامات ارسال کیئے، لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر ایران پہنچ کر جب میں نے ان سے رابطہ قائم کیا تو کسی محترمہ نے واپس جواب دیا جو فارسی کے بجائے کسی اور ہی زبان میں بات کر رہی تھیں جو میری سمجھ سے بالاتر تھی اور اسی دوران میرے موبائل میں بچی رقم ختم ہوئی، میں حیران رہ گیا کہ جس شخص نے مجھے موبائل کا ایرانی 'سم' فراہم کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ ایک مہینے تک یہاں ایران میں کسی سے بھی بات کر سکتے ہیں۔

مجھے کس سے بات کرنی تھی! بس صرف میری خواہش تھی شعبہ اردو، دانشگاہ تہران کے اساتذہ کے ساتھ رابطہ قائم رہے۔ بہر حال میں نے اس شخص کو کسی دوسرے نمبر سے فون ملایا تو انہوں نے مجھے پہلے یہ ہدایت دی کہ پہلے آپ اس نمبر کی جانچ کریں، کہیں یہ نمبر ایران سے باہر کا تو نہیں؟ دوسری بات تب تک میں آپ کے سم میں دوبارہ رقم جمع کرواتا ہوں۔ جب میں نے پہلی ہدایت کے تحت نمبر کی جانچ پڑتال کی تو پایا کہ میں نے اِس نمبر میں 98+ کی بجائے 91+ کا اندارج کیا تھا جس کے بموجب میرا رابطہ صحیح جگہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ جب تک میں نے 91+ کی جگہ 98+ درج کیا تب تک میرے نمبر کے کھاتے میں رقم بھی جمع ہو چکی تھی اور میں نے فوراً پروفیسر محمد کیمرثی صاحب کو فون۔ پہلے میں نے اپنا تعارف دیا انہوں نے بڑی خوش اسلوبی اور گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور کہا کہ محترم میں اس وقت مشہد شریف میں ہوں اور راقم سے ملنے کی کوشش کریں گے۔ چونکہ ہمارے پروگرام میں مشہد شریف جانا بھی شامل تھا' اس لئے میں نے ان سے کہا، اگر ممکن ہوسکا تو وہاں بھی ملاقات ہوسکتی ہے۔ یہ واقعہ رقم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں قارئین کو بتاتا چلوں کہ جب آپ

سفر پہ نکلے تو چھوٹی چھوٹی چیزوں کا بھی دھیان رکھنا لازمی ہے۔اگر میں نے نمبر کا اندراج کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا ہوتا کہ میں اس نمبر کے ساتھ ایرانی ٹیلیفون کوڈ کی بجائے ہندوستانی ٹیلیفون کوڈ کا غلط اندارج کر رہا ہوں ،تو میں بہت سی پریشانیوں سے بچ سکتا تھا۔میں اس بات سے پریشان تھا کہ موصوف پیغام دیکھنے کے باوجود میرے پیغامات کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہیں!؟ اسی طرح سے کئی اور سوالات ذہن میں پیدا ہو رہے تھے! کیونکہ ایران میں دراصل یہی لوگ میری ترسیل کو صحیح معنوں میں سمجھ سکتے تھے۔

زبان بھی عجیب شے ہے۔یہ ان باہمی عناصر کا مجموعہ ہے جو ایک مکمل انداز اور منظّم ربط کے ساتھ مطلوبہ مقاصد کو ایک خاص تسلسل سے جاری رکھتے ہوئے ایک ایسے معاشرے، جس میں کئی ایک جگہ مختلف رنگ ہونے کے باوجود تسبیح کے دانوں کی مانند اسے ایک ہی دھاگے میں ایک نظم کے تحت باندھ کر رکھنے کی اہل ہوتے ہیں۔ سماج یا معاشرہ زبان سے بنتا ہے۔اس بات کے لئے یہ تعریف لازمی نہیں کہ وہ خاص جماعت جو انسانوں کے ایک ایسے گروہ پر مبنی مخصوص قوانین کے تحت اور ایک آب وہوا، رسم ورواج، نظام، آداب کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہو اور انہی خصوصیات کے اردگرد ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہو۔ایسا ہو بھی سکتا ہے لیکن ایسی کوئی حد بندی ضروری نہیں۔اصل میں معاشرہ اجتماع سے بنتا ہے۔جدید شہروں میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے باوجود زندگی اجتماعی بن نہیں پاتی ہے۔اس کے برعکس دیہات میں گھر دور دور ہونے کے باوجود زندگی یکجا نظر آتی ہے۔آج کے دور کا معاشرہ مختلف الجہات معاشرہ ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ ترسیل ہے۔آپ کے تعلقات اس سے زیادہ بہتر ہیں جو ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود آپ کی بات سمجھتا ہو اور آپ سے بات کرنے کا اہل ہو۔زبان میں نفسیات ہی نہیں اور بھی اہم بنیادی عناصر کار

فرماہوتے ہیں جیسے فلسفیانہ، سماجی اور معاشی عناصر وغیرہ۔ جبکہ زبان کی ترسیل کے لئے مرسل کا ہونا لازمی ہے اور اگر آپ ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں آپ کا مرسل ہی نہیں تو یہ آپ کا معاشرہ نہیں کہلا سکتا۔ زبان کا عمل دو افراد کے باہمی ترسیلی ربط کے اردگرد گھومتا ہے۔ ان معنوں میں ایران میں میرا معاشرہ اور سماج تہران یونیورسٹی کا شعبہ اردو ہی ہوسکتا تھا۔ اس کے قطعاً یہ معنی نہیں کہ ہر اردو بولنے والے کا معاشرہ تہران یونیورسٹی کا شعبہ اردو ہی ہوسکتا تھا۔ مجھے ایران میں کئی ایک اردو بولنے والے بھی ملے لیکن یہاں میرے سماج کی ہم آہنگی کا سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب میرے لئے اور میری نظر میں ایران میں تہران یونیورسٹی کے شعبہ اردو پر ہی اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ ایران میں ''اردو'' کو فارسی زبان میں کیمپ کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ اردو زبان کا شانِ نزول بھی یہی ہے کہ وسطی ایشاء کے مختلف حکمرانوں کی افواج میں متنوع قوموں کے فوجی شامل تھے جنہیں بات چیت کے لئے کسی ایک زبان کی ضرورت تھی، یوں انہوں نے مختلف زبانوں سے لئے گئے الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی زبان کی بنیاد ڈالی اور یہ زبان مختلف ناموں سے پہچانی جانے لگی۔ ''تزک بابری'' میں بابر نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے اور اکبر کے عہد میں ''اردوئے معلیٰ''، ''اردوئے علیا''، ''اردوئے بزرگ'' اور ''اردوئے لشکر'' جیسے مرکبات کا استعمال بھی کیا جانے لگا تھا۔ یہاں تک کہ اکبر کے درباری تاریخ نویس ابوالفضل نے ''آئین اکبری' میں ایک کیمپ کو ''اردوئے ظفر قرین'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اسی طرح ترکوں اور منگولوں نے بھی ''اردو'' کا لفظ کیمپ یا شہر کے لئے ہی استعمال کیا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں چنگیز خان کی باقیات رکھی گئی ہیں اس جگہ کو بھی ''اردوس'' کہتے ہیں۔ یہ مشابہت ہوسکتی ہے۔ کہنا مطلوب ہے کہ اردو فارسی سے

بہت قریب ہے۔ایران میں سڑکوں پر لکھی ہوئی تختیاں یا لوگوں سے بات چیت کے دوران الفاظ کی ایسی بازگشت ہوتی تھی کہ یوں لگتا تھا یہ تو میری ہی زبان ہے۔پھر میں اسے کیوں نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔ویسے ہی جیسے میں عربی پڑھ سکتا ہوں لیکن اسے سمجھنے سے قاصر ہوں۔اگر چہ اردو کے لسانی اور اسلوبیاتی ڈھانچے کو دیکھا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ زبان فارسی سے ہی نکلی ہے۔ایسے میں کیا دانشگاہ تہران کا شعبہ اردو غیر ملکی زبانوں کی فہرست میں شامل ہو کر خارجی زبانوں کے ادارے سے منسلک ہونا چاہیئے تھا؟! یہ میرے لئے ایک بڑا سوال ہے۔دوم' مجھے اس سفر کے دوران تہران اور قم میں چند ایک اشخاص ایسے بھی ملے جنہوں نے میرے ساتھ اردو میں بات کی !میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا ہم ایران کے سیستان بلوچستان سے تعلق رکھتے ہیں،تو میں نے ان سے یہ سوال کیا کہ آپ نے اردو کہاں سے سیکھی؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو بھی بولتے ہیں۔حالانکہ اس بات سے بھی انکار نہیں کہ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو تھی،لیکن تھی اردو ہی اور خیالات کی ترسیل آسانی سے ہو جاتی تھی۔سوم' میں نے اردو سے وابستہ دنیا کی کئی ایک دانشگاہوں کے اساتذہ صاحبان سے بات چیت کی ہے لیکن جس لہجہ اور اعتماد کے ساتھ شعبہ اردو، جامعہ تہران کے اساتذہ مجھ سے بات کر رہے تھے۔میں پریشان ہو گیا کہ یہ زبان کیونکر یہاں خارجی زبان کی فہرست میں شامل ہے۔اردو زبان تو اصل میں فارسی کی زائیدہ ہے۔حکومت ایران کو اس بابت سوچنا چاہیئے اور اردو کے فروغ کے لئے اہم اقدامات اٹھانے چاہیئے۔کم از کم ایران کی ہر ایک یونیورسٹی میں شعبہ اردو ہونا ہی چاہیئے۔میں اپنے بچپن میں ریڈیو زاہدان سنتا تھا جہاں سے اردو زبان میں بڑے ہی معیاری پروگرام پیش کئے جاتے تھے۔لیکن اب ایک طویل عرصے سے وہ Tune In نہیں ہو پاتا ہے۔شاید

بند ہو چکا ہو۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں ایک طویل عرصے سے گونا گوں مصروفیات کے باعث صحیح معنوں میں ریڈیو نہیں سن پا تا ہوں۔ اگر ریڈیو زاہدان کی اردو نشریات منقطع کی گئی ہیں تو ایسے میں ایران اردو کی ایک بڑی آبادی کو اپنے آپ اور اپنی میراث سے دور کر رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر ایران اردو کو فروغ دے تو اسے ایران کے خارجہ امور اور زیادہ سازگار ہوں گے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ جولائی 28 کا سفر میرے لئے ایران کا ایک اہم اور یادگار سفر تھا۔ تہران کے خیابانِ لالہ زار کے 'ہوٹل مرکزی ایران' سے ہم نے ایک ٹیکسی بذریعہ موبائل ایپ ایک بار پھر محفوظ کر لی اور ہم تہران یونیورسٹی کے مرکزی دروازے پر پہنچے۔ میں نے پروفیسر علی بیات صاحب کو فون کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ کو تہران یونیورسٹی کے خارجی زبانوں کے ادارے پہنچنا ہے جو وہاں سے قدرے دور ہے۔ سفر میں کبھی یہ بھی ہوتا کہ مسافر مکمل طور سے تصدیق نہیں کرتا کہ مجھے جانا کہاں ہے جس سے کئی بار پھر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے ٹیکسی والے کو یہی پتہ دیا تھا۔ اگر راقم نے پروفیسر علی بیات صاحب سے ہوٹل سے نکلنے سے پہلے صحیح پتہ حاصل کیا ہوتا تو وہ پیغام ارسال کر دیتے اور ہم ٹیکسی والے کو صحیح پتہ بتاتے۔ آج کل یہ اتنا آسان ہے کہ اگر آپ کے پاس انٹرنیٹ کی سہولیات دستیاب ہیں تو وہ وٹس ایپ کے ذریعے مکمل گوگل نقشہ ہی ارسال کر دیا جاتا ہے، جسے پہنچنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔

خیر دوسری ٹیکسی لے کر آخر کار ہم تہران یونیورسٹی کے غیر ملکی زبانوں کے ادارے پہنچ گئے۔ یہاں پر ایک خوش رو نوجوان، جس نے بڑے مربع خانوں والی سفید سیاہ رنگ کی قمیض اور اس پر بہت ہی چھوٹے یکساں مربع سفید خانوں والا ہلکے بھورے رنگ کا کورٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے بہت ہلکے اور کسی حد تک گھنگرالے مگر سیاہ

مائل لہراتے بال اور ہنستا ہوا دلکش چہرہ تھا، وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ میں نے ذہن میں سوچا کہ یہی صاحب یہاں اردو کے استاد ہوں گے۔ اردو دنیا میں دو طرح کے اساتذہ ملتے ہیں یا تو آنے والے شخص جیسے وجیہہ لوگ یا مجھ جیسے نکٹھو جو اپنا چہرہ بنا بنا کر بھی بنا نہیں پاتے اور خفا آئینے سے ہو جاتے ہیں۔ میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ آنے والے اسی منظّم وجیہہ شخصیت نے کہا۔۔سلام۔۔۔ہم نے جواب میں وعلیکم السلام کہنے کی بجائے السلام علیکم ہی کہا۔ بنا کسی تعارف کے وہ ہم سے گلے ملے، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ادارے میں گرما کی چھٹیاں ہونے کے بموجب کوئی بڑی دوڑ دھوپ نہیں تھی، دوسرے یہ کہ آپسی تعارف اردو زبان میں ہو رہا تھا، اس لئے وہ سمجھ گئے کہ یہی لوگ کشمیر سے آئے ہیں۔ ہم نے انہیں اپنا تعارف کرایا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا تعارف کراتے، راقم نے ان سے پوچھا، کیا آپ پروفیسر علی بیات صاحب ہیں؟! تو انہوں نے فوراً جواب دیا کہ پروفیسر علی بیات صاحب اوپر آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور میں ڈاکٹر علی کاوسی نژاد ہوں۔ میں نے معذرت ظاہر کی کہ آپ کا موبائل نمبر راقم کے پاس نہیں تھا۔ اسی بیچ ہم لفٹ کے ذریعے دوسری منزل تک پہنچے جہاں پروفیسر علی بیات صاحب انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے اپنا تعارف دیا اور ان کے دفتر میں بیٹھ گئے۔

میں نے محسوس کیا کہ میں اس وقت دو تہذیبوں کے سنگم پر پہنچ چکا ہوں۔ برصغیر میں اردو صرف زبان کا ہی نام نہیں بلکہ یہ ایک تہذیب تصور کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی بھی دو رائے نہیں کہ فارس اور فارسی زبان ایک عظیم تہذیب کا نام ہے۔ ان معنوں میں فارسی اور اردو زبانیں خالی بول چال کی حد تک محدود نہیں، بلکہ ان کے پس پشت ایک تہذیب، ایک ثقافت، ایک ورثہ، ایک سرمایۂ ادب موجود ہے اور یہ زبانیں صدیوں کی میراث کی امین ہیں۔ اس بات سے ہر ایک واقف ہے کہ زبان ہی

تہذیب وتمدن کا سب سے بڑا اظہار ہے۔ فارسی زبان جس تہذیب میں پروان چڑھی ، اردوزبان نے بھی اسی تہذیب کی راہ اختیار کی۔ اس طرح فارسی زبان کی رہنمائی اور سائے میں جب اردوزبان پڑھائی جارہی ہو، اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ سماں کیا ہوگا اور اس ادارے کا معیار کیا ہوگا۔ میں اس وقت اس ادارے کے بام ودر کو تکتا رہ گیا اوران کو چھونے لگا۔ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں اس وقت زبانوں کے ایک مقدس مقام پر کھڑا ہوں۔ یہ ادارہ میرے لئے کسی بھی زیارت سے کم نہیں تھا۔

ڈاکٹر علی بیات صاحب اور ڈاکٹر علی کاوسی نژاد صاحب سے ایران میں اردو کی صورت حال اور شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی کی ادبی کارکردگی کے تعلق سے جاننا چاہا تو انہوں نے کھلے دل سے مفصل جواب دیا۔

میرا پہلا سوال ایران میں اردو زبان کی تاریخ کے حوالے سے تھا جس کا پروفیسر علی بیات صاحب نے مدلل جواب کچھ یوں دیا:

برصغیر ہندوپاک میں مسلمانوں کی مشترکہ زبان اور شاید اس خطے کے لوگوں کے اکثریت کی مشترکہ زبان اردو ہی ہے جو ایران میں ایک طویل مدت تک غیر معروف رہی۔ ایران میں اردوزبان کو روشناس کرانے والوں میں ایک اہم نام سید محمد تقی فخر داعی گیلانی ہے۔ انہوں نے 1905ء میں ہندوستان کا سفر کیا اور پندرہ سال تک وہاں قیام کیا۔ اس دروان مختلف علماء اور دانشوروں سے اُن کی ملاقاتیں رہیں اور کچھ عرصہ وہ علی گڑھ میں فارسی، عربی اور فلسفہ پڑھاتے رہے۔ اس دوران انہوں نے شبلی نعمانی کی ''شعر العجم''، ''الکلام''، ''سوانح مولانا روم''، ''کتاب خانہ اسکندریہ'' وغیرہ جیسی چند اہم کتابوں کا اردو سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح انہوں نے سرسید احمد خان کی ''تفسیر القرآن'' کو بھی فارسی کا جامہ پہنایا۔ یوں انہوں نے

بیسویں صدی کے آغاز میں، ایران میں فارسی زبان کے ذریعے اردو زبان کی اہم کتابوں کو متعارف کرایا۔ اِن کے بعد ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی کا نام اس سلسلے میں بہت اہم ہے۔ وہ 1947ء میں تشکیل پاکستان کے بعد، کلچرل قونسلر کے طور پر، پاکستان کے سفارت خانہ، تہران میں تعینات ہوئے۔ مطالعہ پاکستان اور اقبالیات ان کے پسندیدہ موضوعات میں شامل تھے۔ ادبی ونجی محفلوں میں اردو زبان کو پاکستان کی قومی زبان کے طور پر متعارف کرانے اور اقبال کے فارسی وارد و کلام کی توضیح وتفسیر سے اردو زبان یہاں کے حلقوں میں کسی حد تک متعارف ہوتی رہی۔ اس سلسلے کی ایک اور اہم کڑی ڈاکٹر شہریار باحید رنقوی مرحوم ہیں، جن کی ''اردو- فارسی لغت'' اپنے دور کو مدنظر رکھتے ہوئے، بڑا اہم کارنامہ شمار کی جاسکتی ہے۔ مرحوم کچھ عرصہ اصفہان یونیورسٹی اور دانشگاہ تہران سے بھی وابستہ رہے اور اس دوران بہت سے علمی وتحقیقی مقالات لکھے جو ایرانی اور پاکستانی جرائد و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی خدمات کے سلسلے میں دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب آگے جا کر 1991ء میں شعبہ اردو، دانشگاہ تہران کا قیام عمل میں آیا تو ان ہی کے ذاتی کتب خانے' جس میں اردو زبان میں منتخب ادبی اور علمی کتابیں شامل تھیں، غیر ملکی زبانوں کے کالج کے مرکزی کتب خانے کی زینت بنی۔ یہ کتابیں ڈاکٹر شاہد چوہدری کے ذریعے مرحوم کی بیوہ سے اس کتب خانے کے لئے خریدی گئیں۔

میرا دوسرا سوال تہران یونیورسٹی میں اردو زبان کی تعلیم کے حوالے سے تھا؟ اِس بابت پروفیسر علی بیات صاحب نے کچھ یوں فرمایا:

دانشگاہ تہران کا ایک مشہور کالج، فارسی زبان وادب کے کالج میں بی-اے اور ایم-اے فارسی، کی سطح کے طالب علموں کے لئے اردو زبان میں ایک اختیاری مضمون کے طور پر ابتدائی اور بنیادی واقفیت کی حد تک کئی برسوں تک پڑھائی جاتی

تھی۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سید شہر یار با حیدر نقوی کے مطابق،''1955ء میں تہران یونیورسٹی میں، اردو کا شعبہ قائم ہوا۔فارسی زبان وادب کے کالج میں سینکڑوں طالب علم بڑے شوق سے اردو کی تعلیم میں مصروف رہے۔جب سے اس شعبہ کا افتتاح ہوا ہے، اہل علم کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے''۔ یوں دانشگاہ تہران میں، اردو اور اس کی طرف توجہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔لیکن بدقسمتی سے ڈاکٹر صاحب کی کوششوں کے باوجود، مذکورہ کالج میں یہ شعبہ مستقل طور پر جاری نہ رہ سکا اور بہت جلد گوشہء گمنامی میں چلا گیا۔اس وقت کے نصاب میں اردو کے حروف تہجی کا تعارف کے علاوہ عام اور سادہ فقرے کی مشق کی جاتی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ طالب علم اردو سے متعلق واقفیت حاصل کر لیتے تھے۔ڈاکٹر شہر یار با حیدر نقوی مرحوم اور ایران میں مقیم پاکستانی اساتذے کے علاوہ پاکستان سے آئے ہوئے پی ایچ-ڈی فارسی کے اسکالر وغیرہ' ایرانی طالب علموں اور دیگر خواہشمند افراد کو اردو زبان پڑھاتے تھے۔یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا۔لیکن بالآخر 1990ء میں ایرانی اور پاکستانی حکومتوں کے درمیان سرکاری سطح پر ایک باقاعدہ معاہدہ ہوا، جس کی رُو سے یہ طے پایا کہ بی۔اے۔آنرز کی سطح پر دانشگاہ تہران میں اردو زبان وادب کا شعبہ قائم کیا جائے۔مذکورہ معاہدے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (NUML) سے جناب ڈاکٹر مہر نور محمد خان ایران پہنچے اور ان کی محنت اور کوششوں سے نصاب مرتب ہوا۔1991ء میں یونیورسٹیوں میں داخلے کے لئے ملک گیر سطح پر امتحان (جو ایران میں ''کنکور سراسری'' کے نام سے مشہور ہے) میں اردو زبان وادب بھی نئے مضمون کے بطور متعارف ہوا۔یوں باقاعدہ طور اسی سال کے دسمبر کے آخری دنوں میں جب تہران یونیورسٹی میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا، دس طالب علموں کو اس نئے شعبے میں اردو زبان کی تعلیم کے لئے داخلہ ملا-ان پہلے دس طالب علموں میں میرا (پروفیسر علی بیات

کا) بھی انتخاب ہوا۔اس وقت سے اب تک سالانہ پندرہ اور بیس کے درمیان طالب علم بی۔اے آنرز اردو کی کلاسوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے اس شعبے میں داخلہ لیتے ہیں۔اس دور کے اساتذہ میں ایک بہت اہم استاد مرحوم ڈاکٹر شاہد چوہدری بھی شامل تھے۔انہوں نے ڈاکٹر مہر نور محمد خاں صاحب کے ساتھ مل کر دوسال تک بڑی محنت اور دلچسپی کے ساتھ منتخب طالب علموں کو اردو زبان وادب کی تعلیم دی۔بعدازاں اگرچہ وہ ایک اور ادارے کے ساتھ منسلک ہو گئے،لیکن ان کی علمی وادبی خدمات نیز ان کی تصانیف سے ایران کے اردو کے طالب علم اور اساتذہ نے کافی استفادہ کیا۔اس سلسلے میں ان کی دو اہم کتابیں ''فرہنگ واژہ ہای فارسی درزبان اردو'' اور "دستور کامل وآموزش زبان اردو برائے فارسی زبانان" قابل ذکر ہیں۔ڈاکٹر مہر نور محمد خان کی پاکستان واپسی کے بعد ڈاکٹر محمد سلیم اختر جو فارسی اور تاریخ کے استاد تھے بطور وزیٹنگ پروفیسر شعبے میں تشریف لائے اور پانچ سال تک خدمات انجام دینے میں مصروف عمل رہے۔ان کی کوششوں سے 1991ء سیشن والے دو طالب علموں کو 1997ء میں پاکستان میں ایم-اے اردو کی سطح میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔شعبہ اردو کے دانشوروں اور اساتذہ میں ڈاکٹر زیب النساء علی خان بھی شامل ہیں جن کا تقرر شعبے میں 1993ء میں ہوا۔انہوں نے 1998ء میں ڈاکٹر محمد سلیم اختر کی پاکستان واپسی کے بعد 2009ء تک شعبے کی صدارت کے فرائض انجام دیئے اور مستقل اساتذہ کی غیر موجودگی میں تن تنہا اور اکثر اوقات جزوقتی اساتذہ کے تعاون سے اردو زبان کی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔انہوں نے فارسی زبان وادب میں دانشگاہ تہران سے پی۔ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کا تعلق پاکستان سے ہے لیکن قریباً چالیس سال سے ایران میں مقیم ہیں۔تحقیقی امور،خاص کر لغت شناسی میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔2009ء میں،میں نے ڈاکٹر زیب النساء علی خان کی زیر

نگرانی ایک اردو-فارسی لغت ''زیب اللغات'' کے نام سے ترتیب دی۔ان کی کتابوں میں ''تصحیح انتقادی تذکرہ مجمع النفائس از سراج الدین علی خان آرزو'' ''ضرب المثل ہائے اردو-فارسی'' شامل ہیں۔اس کے علاوہ ''جامع اللغات سلطانی سہ زبانی اردو، فارسی اور ہزارہ'' نامی لغت بھی شامل ہے۔اس لغت کو ہزارہ اکادمی کوئٹہ نے 2014ء میں طلائی تمغہ سے بھی نوازا ہے۔

جنوری 2004ء میں اردو زبان و ادب کے ممتاز استاد جناب پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب اردو چیئر اور مطالعہ پاکستان کے استاد کے بطور شعبے میں تشریف لائے۔ان کی وجہ سے شعبے کی علمی فضا میں خاصی رونق آ گئی۔انہوں نے تین سال تک مسلسل درس و تدریس کے ساتھ ساتھ شعبے کے طالب علموں کے لیے اردو زبان میں گفتگو کرنے کا ایک سازگار ماحول بھی فراہم کیا۔اس کے علاوہ پاکستانی ناشروں سے کتابیں خرید کر شعبے کے کتب خانے کے علمی و ادبی سرمایہ میں بھی خاصہ اضافہ کیا۔ شعبے کے اساتذہ کے لیے بھی ان کا دورانیہ عہد زریں ثابت ہوا۔اس دور میں طالب علموں کے ساتھ ساتھ اساتذہ بھی ان کے علمی کمالات سے مستفید ہوتے رہے۔اس سلسلے میں میرے (پروفیسر علی بیات کے) ساتھ ساتھ شعبے کے دو اور اساتذہ ڈاکٹر محمد کیومرثی صاحب اور ڈاکٹر وفا یزدان منش صاحبہ نے بھی پروفیسر تحسین فراقی صاحب کی نگرانی میں اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے لکھے-یہاں میں ایک اور بات کا ذکر کرتا چلوں کہ 2007ء سے پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی کی پاکستان واپسی سے اب تک یہ چیئر خالی ہے اور حکومت پاکستان کی طرف سے اس کے لئے عملی اقدام نہیں اٹھائے گئے۔

میرا ایک اور اہم سوال شعبہ اردو کی تعلیمی سرگرمیوں کے حوالے سے تھا؟ جس کا وضاحتی جواب پروفیسر علی بیات صاحب نے کچھ یوں بیان کیا:

اس وقت شعبہ اردو دانشگاہ تہران میں دو سطحوں پر اردو زبان وادب کی تعلیم جاری ہے۔اول بی-اے آنرز اردو زبان وادب، دوم ایم -اے اردو زبان وادب۔ واضح رہے کہ ایرانی جامعات میں بھی بی اے آنرز کی تعلیم کا دورانیہ چار سال میں اور آٹھ سمسٹروں میں مکمل ہوتا ہے۔شروع میں جو نصاب اس کے لئے بنایا گیا تھا، جب سے ایرانی الاصل اساتذہ نے شعبے میں اپنے فرائض باقاعدگی سے سنبھالے ہیں، تب سے اس نصاب کو نئے سرے سے بنانے کی کوششیں جاری رہی ہیں اور ممکنہ حد تک اس میں ترمیم واضافہ کرنے کی کوشش بھی جاری ہے۔وزارت تعلیم' اسلامی جمہوریہ ایران کے قانون کی رُو سے ہر پانچ سال میں جامعاتی نصابوں کی تحدیث لازمی ہے۔اس کی رُو سے شعبہ اردو میں بھی ہماری یہ کوشش رہتی ہے کہ شعبے کی علمی ضروریات کے پیش نظر اور اپنے وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، پاکستانی اور ہندوستانی جامعات کے اردو شعبوں کے نصاب کی مدد سے اس شعبے کے نصاب میں بھی ضروری تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں۔آخری ترمیم کی رو سے بی۔اے آنرز اردو زبان وادب کے نصاب میں جو قابل غور تبدیلیاں کی گئی ہیں۔وہ کچھ اِس طرح سے ہیں:

آٹھ سمسٹروں میں سے، پہلے چار سمسٹروں کو زبان کی تعلیم کے لئے مخصوص رکھا گیا ہے۔اس دوران قواعد اردو بھی تین سمسٹروں میں پڑھانا لازمی ہے۔ساتھ میں اردو بول چال اہم ہے، جس میں طالب علموں کے اردو حروف والفاظ کے سننے، تلفظ، اور حروف کی ادائیگی پر زور دیا جاتا ہے۔اسے ہم عملی اردو (Functional Urdu) کا نام دے سکتے ہیں۔قواعد کی رُو سے طالب علموں سے سیدھے سادے مضامین لکھوائے جاتے ہیں۔اس طرح طالب علم مختلف الفاظ کو اردو محاوروں اور روزمرہ استعمال ہونے والے الفاظ اور جملے لکھنے اور بولنے کے اہل ہو جاتے ہیں۔اس کے ساتھ چوتھے سمسٹر سے ترجمے کے بنیادی اور ابتدائی اصول وقواعد کی تعلیم دی جاتی

ہے۔یوں طالب علموں کو سادہ متن اردو سے فارسی میں اور فارسی سے اردو میں ترجمے کے اصول کی تعلیم دی جاتی ہے۔اس کے ساتھ طالب علموں کو پاکستانی اور ہندوستانی اسکولوں میں مروجہ نصابی کتب کے بعض مضامین کے منتخب حصے ان چاروں سمسٹروں میں کلاسوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ پانچویں سمسٹر سے آٹھویں سمسٹر تک طالب علموں کی زبان آموزی کا دورانیہ مکمل ہوتا ہے اور وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ اردو ادب کے نظم ونثر کا تفصیلی مطالعہ کرسکیں۔نظم کی ابتدائی اصطلاحات کی تعریف سے لے کر اس کے قدیم وجدید اصناف اور اردو شاعری کے کلاسیکی اور جدید دور کی شاعری کے منتخب حصے پڑھائے جاتے ہیں۔نثر میں بھی یہی رویہ اپنایا جاتا ہے۔ابتدا میں طالب علموں کے لئے نثر اور اسالیب نثر کی اصطلاحات کی وضاحت کی جاتی ہے اور اس کے بعد قدیم وجدید عہد کے اہم نثر نگاروں اور فن پاروں کے منتخب حصے پڑھائے جاتے ہیں۔اس کے ساتھ تاریخ ادب اردو اور ادبی متون کے اعلیٰ نمونے پیش کئے جاتے ہیں اور اس طرح آٹھویں سمسٹر کے آخر تک طالب علم بڑی حد تک اردو زبان وادب سے واقف ہو جاتے ہیں۔2009ء تک شعبے میں صرف بی۔اے آنرز کی سطح میں اردو زبان وادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔لیکن شعبے میں 2009ء سے ایم-اے اردو کا بھی باقاعدہ آغاز ہوا ہے اور مسلسل ہر سال چھ طالب علموں کو داخلہ ملتا ہے۔اس سطح کے چار سمسٹر ہوتے ہیں۔ پہلے تین سمسٹروں میں اعلیٰ سطح میں اردو زبان و ادب کے مطالعہ اور مشق کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔اس مرحلے کی نصاب سازی میں بھی پاکستانی اور ہندوستانی جامعات میں موجودہ ایم-اے کے نصاب کے علاوہ ایم۔فل اردو کے نصاب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔کلاسیکی اور جدید دور کے اہم اسالیب نظم ونثر کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔نیز تحقیق وتنقید سے بھی طالب علموں کو واقف کرایا جاتا ہے۔کلاسیکی شاعری میں، ولی دکنی، میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ حیدر علی آتش،

غالب،مومن اور ذوق کی شاعری شامل ہے۔جدید دور کے شعرا میں ن۔م راشد، مجید امجد، میراجی، فیض احمد فیض اور دیگر اہم شعرا شامل ہیں۔اقبالیات الگ مضمون کے طور پر بڑی تفصیل سے پڑھایا جاتا ہے۔اس میں تصوراتِ اقبال کا مطالعہ ان کے فارسی اور اردو کلام کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔فارسی اور اردو کلام کے کچھ منتخب حصے بھی پڑھائے جاتے ہیں۔تنقید اور اصول تنقید کی تفصیل سے تعلیم دی جاتی ہے۔نثر میں بھی وہی اصول کاربند ہے۔افسانوی اور غیر افسانوی نثر کا کلاسیکی عہد سے لے کر جدید دور کے اہم نثری اسالیب تک تفصیل سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔تقابلی ادب ایک اہم مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے جس میں تمام طالب علم خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔ آخری سمسٹر میں ہر طالب علم کو ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایم۔اے اردو کا نصاب ترتیب دیتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ دانشگاہ تہران سے فارغ التحصیل طالب علموں کو پاکستانی اور ہندوستانی یونیورسٹیوں میں داخلہ کے وقت کسی بھی طرح کی کمی کا احساس نہ ہو۔اس لئے اپنی یونیورسٹی کے معیار اور بنیادی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں کچھ حصے باہر کی یونیورسٹیوں کے ایم۔فل اردو کے نصاب سے بھی اپنے شعبے کے ایم۔اے اردو کے نصاب میں شامل کئے گئے ہیں۔چونکہ پاکستان کی اکثر جامعات میں بی۔اے کی تعلیم دو سال اور ہندوستان کی زیادہ تر جامعات میں یہی تعلیم تین سال کی ہوتی ہے اور دانشگاہ تہران میں یہ دورانیہ چار سال میں مکمل ہوتا ہے۔بی۔ اے آنرز کا نصاب تیار کرتے ہوئے مذکورہ جامعات کے ایم۔اے اردو کی سطح کے نصاب کے بیشتر حصے شامل کئے گئے ہیں۔یوں بی۔اے آنرز کے ایرانی طالب علم زبان سیکھتے ہوئے، پاک وہند کے جامعات میں موجود ایم-اے اردو کے نصاب میں شامل بیشتر مواد کو بھی پڑھتے ہیں۔اس پر مزید یہ کہ ایم-اے اردو میں بھی ہمارے

طالب علموں کو پاکستانی اور ہندوستانی جامعات کے ایم۔فل کا نصاب مکمل طور پر پڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور یوں شعبے کے فارغ التحصیل طالب علم ہندو پاک کی یونیورسٹیوں میں براہ راست پی ایچ-ڈی میں حصہ لینے کے اہل ہو جاتے ہیں۔جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ ایم۔اے اردو میں منتخب مضامین پر ایک مقالہ تحریر کرنا لازمی ہے' شعبے کی ضروریات اور طالب علموں کی اہلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے، مقالے کے لئے موضوعات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ طالب علم اساتذہ سے مشورہ کر کے اپنی مرضی کے مطابق کسی ایک موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔اگرچہ یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہتی ہے کہ ایسے مقالے لکھے جائیں، جن سے شعبے میں تحقیق کے لئے سازگار ماحول بنا رہے۔ یہاں پر میں چند ایک اہم مقالات کا ذکر کرنا لازمی سمجھتا ہوں:

مقالے کا عنوان	مقالہ نگار	نگران
علامہ اقبال اور پروین اعتصامی کی مکالماتی نظموں کا تقابلی اور تنقیدی جائزہ۔	فرناز زالزادہ	ڈاکٹر علی بیات
انتظار حسین کے منتخب افسانوں کا تنقیدی مطالعہ	فاطمہ فخر الدین	ڈاکٹر محمد کیومرثی
اردو میں فارسی کے چند منتخب الفاظ کا تقابلی جائزہ	زہرا آذرخش	ڈاکٹر علی بیات
فارسی بولنے والوں کو اردو قواعد کی تعلیم	لیلا غالبی	ڈاکٹر محمد کیومرثی
مثنوی معنوی میں مولانا روم کی کلیلہ و دمنہ اور پنچ تنترہ سے اثر پذیری؛ ایک مطالعہ	سیمین جوادی	ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی
سعادت حسن منٹو اور صادق ہدایت		

کے افسانوں کا تقابلی مطالعہ	مہدیہ نژاد شیخ	ڈاکٹر محمد کیومرثی
پریم چند کے افسانوں میں استعمار دشمنی ،وطن پرستی کا احساس اور کمزور طبقے کی زندگی کی عکاسی	محمد علی ذاکری	ڈاکٹر محمد کیومرثی
ترقی پسند تحریک کی افسانہ نگاری کا موضوعاتی مطالعہ	منیرہ نژاد شیخ	ڈاکٹر وفا یزدان منش
ایران کے بارے میں لکھے گئے سفرناموں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ	معصومہ شریفیان	ڈاکٹر علی بیات
فارسی سے اردو میں اور اردو سے فارسی میں ترجمے کے دوطرفہ اصول	رویا جوادی	ڈاکٹر علی بیات
شیخ محمود شبستری کے گلشن راز اور علامہ اقبال کے گلشن راز جدید میں افکار کا تقابلی مطالعہ	یونس رضائی عارف	ڈاکٹر علی بیات
اردو اور جدگالی لہجے میں صوتی اور نحوی اشتراکات کا تقابلی مطالعہ	سمیرا سپاہی	ڈاکٹر وفا یزدان منش

راقم نے شعبے کی تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے جب پروفیسر علی بیات صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے فوراً جواب دیا کہ اس سلسلے میں شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی ہر سال کئی علمی وادبی نشستوں کا اہتمام کرتا آرہا ہے۔ ان نشستوں میں ہندو پاک اور ایرانی محققوں اور دانشوروں کو دعوت دی جاتی ہے۔ نومبر میں تمام ایرانی یونیورسٹیوں میں ایک ہفتہ ''ہفتہ پروہش'' کے نام سے منعقد ہوتا ہے۔ اس میں ہر ایک شعبہ اور اساتذہ گزشتہ سال کے دوران اپنی

کارکردگی نیز اپنی علمی وادبی تحقیقات کو سامنے رکھ کر اس پر سیر حاصل گفتگو کرتا ہے۔ باقی یونیورسٹیوں اور شعبوں کی طرح شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی بھی ان تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے کئی ایک شعرا اور ادیب شعبہ اردو کے طالب علموں کے ساتھ تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور ومعروف شاعر جناب افتخار حسین عارف صاحب بھی یہاں تشریف لائے جو اس وقت تہران میں موجود ای۔سی۔او (ECO) ممالک کے کلچرل سنٹر کی سربراہی کر رہے تھے۔ وہ کئی بار شعبے میں تشریف لائے اور طالب علموں سے ملے۔ اس کے علاوہ شعبہ نے ایک بین الاقوامی سہ روزہ سمینار ''علامہ اقبال اور اتحاد دنیائے اسلام'' کے عنوان سے 5 مئی 2010ء کو منعقد کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شعبے کے اساتذہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ ملک سے باہر منعقد ہونے والے قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں حصہ لیں۔

راقم نے شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی میں تدریسی عملے اور ان کی ادبی زندگی کے حوالے سے جب پوچھا تو پروفیسر علی بیات نے اس کا جواب کچھ یوں دیا۔ ''1999ء سے میں اور ڈاکٹر محمد کیومرثی صاحب شعبے میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت شعبے میں پانچ ایرانی اساتذہ باقاعدہ گی سے درس وتدلیس سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر محمد کیومرثی اس وقت شعبہ کے صدر ہیں۔ ان کے ساتھ میں (ڈاکٹر علی بیات)، ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی، ڈاکٹر وفا یزدان منش، ڈاکٹر علی کاوسی نژاد شامل ہیں۔ یہاں پر میں آپ کو یہ تفصیل بھی فراہم کرنا چاہتا ہوں کہ شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی کے اساتذہ نے کس طرح کا علمی اور ادبی کام اب تک انجام دیا ہے۔ پہلے میں اپنے حوالے سے بات کرنے کی کوشش کروں گا کہ میں نے کون کون سی کتابیں تصنیف کی یا ترتیب دی ہیں۔

ا۔ ''مطالعہ بیدل در پرتو افکار برگساں'' (ترجمہ) اقبال اکادمی، پاکستان

2000ء (2006ء میں یہ کتاب ایران سے ''حقیقت و حیرت، مطالعہ بیدل در پرتو اندیشہ ہای برگسون'' کے نام سے ''پرنیان خیال'' نامی ایک ایرانی ناشر نے بھی چھاپی ہے)

۲۔ زیبِ للغات فرہنگ واژہ نامی توصیفی اردو بہ فارسی''، مجمع ذخائر اسلامی، قم ایران 2010ء

۳۔ ''نہضت تشکیل پاکستان'' (ترجمہ) مرکز مطالعات آسیای، جنوبی دانشگاہ پنجاب، لاہور، پاکستان 2009ء

۴۔ ''پنجرای بہ سمت باغ گمشدہ'' (ترجمہ منتخب اشعار افتخار عارف) نشر ثالث، تہران 2012ء

ڈاکٹر محمد کیومرثی صدر شعبہ اردو نے جو کتابیں ترتیب دی یا تصنیف کی ہیں اُن کی تفصیلات کچھ اِس طرح سے ہیں:

ا۔ ''معاصر ایرانی شاعری''، ترجمہ، تیس شعر از شاعران معاصر ایران بہ زبان اردو، 2006ء، لاہور

۲۔ ''اردو فارسی افسانہ، تجزیاتی و تقابلی مطالعہ'' شاہ عبداللطیف بھٹائی یونیورسٹی، پاکستان، 2008ء

۳۔ ''گفتگو در سکوت/ ترجمہ شعر معاصر اردو "انجمن شاعران ایران، ۲۰۱۱ 2011ء

ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی کی تصنیف کردہ کتابیں اس طرح سے ہیں:

ا۔ ''فرہنگ تلمیحات اشارات اساطیری' داستانی 'تاریخی 'مذہبی در زبان و ادبیات اردو- ہندی۔ بہ فارسی''، مجمع ذخایر اسلامی قم، 2010ء

۲۔ ''منتخب نغمہ خداوندی گیتا''، مجمع ذخائر اسلامی، 2012ء

ڈاکٹر وفا یزدان منش کی نے جو کتاب ترتیب دی ہے اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔

نوسرایان اردو در سدہ بیستم، آیندہ دانش، تہران 2014ء

ڈاکٹر علی کاوسی نژاد صاحب شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ جب ان سے ایران میں اردو زبان وادب کی موجودہ صورت حال کے تعلق سے جاننا چاہا تو انہوں نے اس حوالے سے ایک مدلل اور مفصل معلومات بہم پہنچائیں۔ ڈاکٹر علی کاوسی نژاد نے کہا کہ اردو اور فارسی زبان میں بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے اور اردو زبان کی نثر اور نظم فارسی زبان وادب سے متاثر ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی بڑی یونیورسٹیوں میں فارسی زبان و ادب کے شعبے قائم کیے گئے ہیں اور فارسی زبان وادب کی تعلیم وتدریس کے لیے بہت سے استاد مصروف ہیں اور بڑے انہماک اور تن دہی سے فارسی زبان وادب کی تعلیم کی طرف توجہ دی جارہی ہے اور یہ سب کچھ فارسی زبان وادب اور ایرانی ثقافت وتمدن کو برصغیر میں عام کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کے برعکس پورے ایران میں صرف تہران یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کا شعبہ قائم ہے اور ایران کی دوسری یونیورسٹیوں میں اردو شعبہ کا قیام عمل میں نہیں آیا۔ اردو زبان جہاں پاکستان کی قومی زبان ہے وہیں یہ زبان ہندوستان میں بھی ایک بڑی آبادی کی مادری زبان ہے۔ جو لسانی یکسانیت اردو اور ہندی کے درمیان ہے شاید ہی کسی اور زبان میں ایسی یکسانیت پائی جاتی ہو۔ لیکن ایران میں اردو زبان وادب کی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ عام ایرانی لوگ اردو زبان کو فارسی دری یا پشتو زبان سمجھتے ہیں۔ دراصل پاکستانی اور ہندوستانی حکومتوں کی طرف سے اردو زبان کی ترویج و اشاعت پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ پاکستان میں ''مقتدرہ قومی زبان'' اور ہندوستان میں ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کے ادارے قائم ہیں۔ ان اداروں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اردو زبان وادب کی ترویج وترقی پر خاص توجہ دیں اور ہمسایہ ممالک کی

یونیورسٹیوں اور اداروں میں اردو زبان کے شعبے قائم کرانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

پہلوی دور حکومت میں اصفہان یونیورسٹی میں مرحوم ڈاکٹر سید باحیدر شہریار نقوی کی کوششوں سے اردو زبان و ادب ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا تھا اور اس زمانے میں اس کی خوب ترقی ہوئی۔ چنانچہ بعد میں تہران یونیورسٹی میں اردو زبان شعبہ فارسی میں ایک اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جانے لگی۔ 1991ء میں پاکستانی اور ایرانی اساتذہ کی مدد سے تہران یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا باقاعدہ آغاز کیا گیا اور دور حاضر میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کی سطح پر اردو پڑھنے والے ایرانی طالب علموں کو اردو زبان و ادب کی تعلیم دی جارہی ہے۔ گزشتہ برسوں میں اصفہان یونیورسٹی اور فردوسی یونیورسٹی میں شعبہ اردو قائم کرانے کی ابتدائی کوششیں بھی کی گئیں۔ لیکن پاکستانی حکومت کی طرف سے اس کی حمایت نہیں کی گئی اور یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔

ایران کے مذہبی اہمیت کے شہروں میں پاکستانی اور ہندوستانی نژاد لوگ مقیم ہیں اور ان شہروں میں خاص طور پر مشہد اور قم میں لوگ زیارات کی غرض سے وہاں کا رخ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ان شہروں میں اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے اور بعض اداروں نے اپنی ویب گاہوں پر بھی اردو زبان کو شامل کیا ہے اور زائرین کی رہنمائی اور سہولت کے لیے اردو زبان میں ہدایات براہ راست دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ مزارات نیز زیارتوں کے احاطے میں بھی زائرین کی سہولت کے لیے اردو زبان میں تختیاں آویزاں رکھی گئی ہیں۔ فارسی سے اردو میں مذہبی کتب و مضامین کا ترجمہ کیا جاتا ہے اور یہ اکثر وہ لوگ سرانجام دیتے ہیں جو اہل زبان ہوتے ہیں اور بہ یک وقت اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ ایران میں موجود جامعہ المصطفیٰ جیسی بین الاقوامی یونیورسٹیوں میں برصغیر ہند و پاک کے طلبا و طالبات ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح پر دینی اور مذہبی تعلیمات حاصل کررہے ہیں اور اپنا تحقیقی مقالہ اردو زبان

میں جمع کرواتے ہیں، یوں اردو زبان کی ایک طرح سے اشاعت ممکن ہو پاتی ہیں۔ یہ تحقیقی مقالات بعد میں کتابی شکل میں شائع ہو کر سامنے آتے ہیں اور اردو بولنے والوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

طبی ماہرین ترجمہ کے ذریعے علم طب سے متعلق بعض اردو کتابوں کا فارسی اور فارسی کا اردو میں ترجمہ کرتے ہیں اور برصغیر ہندو پاک کے ماہر طبیب ایران آ کر بیماروں کے علاج معالجے میں مصروف عمل ہوتے ہیں اور انہیں عوام سے روابط پیدا کرنے کے لئے مترجمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ان معنوں میں بھی اردو زبان کی ترویج ممکن ہو پاتی ہے۔اس کے علاوہ ایرانی طبیب بھی برصغیر ہندو پاک کے طبیبوں کی معلومات اور تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔بعض تحقیقی اور طبی مراکز میں بھی علم طبابت پر لکھی گئی اردو کتابوں پر تحقیق کی جاتی ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔اس سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ایرانی ذرائع ابلاغ اور نیوز ایجنسیوں میں اردو زبان سے خاصی مدد لی جاتی ہے۔مہر نیوز، تسنیم نیوز اور ارنا نیوز ایجنسیوں میں اردو زبان میں خبریں، رپورٹیں اور تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں اور یوں ایران میں موجود سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات سے برصغیر ہندو پاک کے اردو شائقین باخبر رہتے ہیں۔ایرانی ذرائع ابلاغ میں اردو زبان کو خاصی اہمیت دی جا رہی ہے۔اس کے علاوہ بین الاقوامی سحر اردو ٹی۔وی میں بھی تمام پروگرام اردو زبان میں نشر کئے جاتے ہیں۔اس شعبے میں شامل ماہرین ایران، پاکستان اور ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ایران کے سیاسی، معاشی، معاشرتی حالات سے باخبر رہنے کے لیے تجزیئے اور تبصروں پر مبنی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جن میں ماہرین بہت مدلل اور خوبصورت انداز میں اپنے تجزیئے پیش کرتے اور ایرانی تجزیہ کاروں کو بھی شامل کرتے ہیں جس کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی شامل کیا جاتا ہے۔

اس حوالے سے ایک اور بات میرے ذہن میں آ رہی ہے وہ یہ کہ اسلامی جمہوریہ ایران کے دارالحکومت تہران میں اسلامک انسائیکلو پیڈیا فاؤنڈیشن (بنیاد دائرہ المعارف اسلامی) میں برصغیر پاک و ہند کا شعبہ قائم ہے اور اردو ادب سے متعلق معروف و مشہور شخصیات کی سوانح اور فن پر مضامین لکھوائے جاتے ہیں جو اس انسائیکلو پیڈیا میں شامل کئے جاتے ہیں۔اس مرکزی کتب خانے میں اردو زبان وادب کی کتابیں اردو قارئین اور محققین کے لیے دستیاب رکھی گئی ہیں۔کئی برسوں سے اس مرکز میں اردو زبان کی باقاعدہ کلاسوں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔البتہ یہ کلاسیں صرف ابتدائی اردو سکھانے کی غرض سے شروع ہو گئی ہیں۔ اس مرکز سے شائع شدہ انسائیکلو پیڈیا آف دے اسلامک ورلڈ (دانشنامہ جہان اسلام) میں اردو زبان وادب پر مبنی تحقیقی مقالات فارسی زبان میں شامل کیے جاتے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کے تحقیقی مضامین کے زمرے میں آتے ہیں۔

یہاں میں آخر پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ برصغیر ہندوپاک کی اکثر یونیورسٹیوں میں شعبہ فارسی قائم ہے۔ان یونیورسٹیوں میں فارسی پڑھانے میں اساتذہ کی بڑی تعداد مصروف عمل ہے جن میں بعض اساتذہ ایران کی یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ ہیں لیکن اس کے برعکس پورے ایران میں صرف تہران یونیورسٹی میں اردو شعبہ قائم ہے اور پاکستان اور ہندوستان کی حمایت کے بغیر یہ شعبہ بہ مشکل آگے چل سکے گا اور یہ اندیشہ بھی ہے کہ آئندہ چند برسوں میں یہ شعبہ بند ہو جائے۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے اداروں کو باخبر رہنا چاہیے کہ اگر اس سلسلے میں اچھی حکمت عملی سے کام نہیں لیا گیا تو تہران یونیورسٹی میں قائم اردو کا یہ شعبہ آنے والے وقت میں بند بھی ہوسکتا ہے۔

راقم نے اپنی تازہ تصنیف ''اقبال: معروضی تجزیئے اور سائنسی مباحث'' کی ایک

ایک جلد پروفیسر آغا علی بیات صاحب اور ڈاکٹر علی کاوسی نژاد صاحب کو پیش کی۔ انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس ناچیز کی تصنیف کو دل سے قبول فرمایا۔ مجھے امید ہے کہ یہ دونوں شخصیات اس کتاب کے مطالعے کے بعد میری خامیوں کو سامنے لاتے ہوئے میری رہنمائی فرمائیں گی تاکہ میں دوبارہ طباعت کے وقت ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرسکوں۔

ہم لفٹ کے ذریعے ادارے کی نچلی منزل میں گئے جہاں ادارے کا وسیع کتب خانہ موجود ہے جس میں مختلف زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کا بھی ایک الگ، بڑا اور خوبصورت حصہ تھا۔ یہاں مختلف موضوعات پر بہترین کتابیں بڑے ہی سلیقے سے دستیاب رکھی گئی ہیں۔ میں نے اپنی مذکورہ کتاب کی دو کاپیاں ادارے کے کتب خانے کے اردو کے حصے کو بھی پیش کی تاکہ طالب علم بھی اس کتاب کا مطالعہ کر پائیں۔

بعد ازاں پروفیسر آغا علی بیات صاحب اور ڈاکٹر علی کاوسی نژاد صاحب ہمیں کتب خانے کے اس حصے میں لے گئے جہاں دانشگاہ تہران کے غیر ملکی زبانوں کے ادارے کے مختلف شعبہ جات سے وابستہ اساتذہ کی مختلف زبانوں میں تصنیف کردہ کتابوں میں سے کسی ایک کتاب پر ہر ہفتے یہاں پر بحث ہوتی ہے۔اس بات نے مجھے بہت ہی متاثر کیا۔اس سے ایک دوسرے کی زبانوں میں لکھے گئے ادب کے دریچے وا ہو سکتے ہیں اور مختلف زبانوں کے ادب تک رسائی بھی آرام سے ممکن ہوسکتی ہے۔ جب آپ باقی زبانوں کے ادب سے واقف ہوں تو اس سے آپ کے ذہن کے دریچے کھلنے کے ساتھ ساتھ آپ جس زبان میں لکھتے ہیں،اس کے ادب تک آپ کے ذریعے یہ بات جب پہنچ جائے تو اس کو پڑھنے والے بھی مستفید ہوں گے۔آپ جانتے ہیں کہ انگریزی زبان و ادب سنسکرت ، فارسی ،عربی ،فرانسیسی، لاطینی یا پھر یونانی زبان کے سامنے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے تھے لیکن انگریزی زبان کے ادیبوں

نے دوسری زبانوں خاص کر فرانسیسی، عربی، لاطینی، یونانی زبانوں سے اکتساب فیض حاصل کرتے ہوئے، آج انگریزی زبان کو دنیا کی ایک اہم ترین زبان اور ادب میں شامل کرنے کے اہل بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح اردو زبان نے جہاں عربی اور فارسی زبانوں کے سرمایہ ادب سے اپنا عمارت تعمیر کی، وہیں انگریزی ادب نے اردو ادب کو جدید ادب کے گر بھی سکھائے۔ یوں جب ایک ادیب مختلف زبانوں کے ادیبوں کی صحبت میں بیٹھا ہو، تو ایسے میں ادب کی غیر معمولی تشکیل کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ اردو پڑھانے والوں تک یہ بات پہنچ سکتی ہے کہ دوسری زبانوں کے ادب لکھنے والے کیا سوچتے ہیں اور بعض دیگر اہم سماجی مسائل کی طرف ان کا ادب کیا رائے اور رویہ رکھتا ہے۔ دانشگاہ تہران کے غیر ملکی زبانوں کے ادارے کی طرح ہر دانشگاہ سے وابستہ مختلف ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے شعبہ جات کو اسی طرح کے پروگرام منعقد کرانے چاہیئے تا کہ ایک دوسرے کی زبانوں کے ادب میں ہو رہی سرگرمیوں کا تبادلہ ہو پائے بلکہ یہ طریقہ کار بغیر دنیا گھومے بین الاقوامی سطح کے ایک تعلیمی اور ادبی تبادلہ خیال کے لئے راہ ہموار کر سکتا ہے۔

دانشگاہ تہران کے شعبہ اردو کے اساتذہ سے مستفید ہونے کے بعد ہم دن کے تین بجے وہاں سے نکلے اور ادارے کے باہر چند ایک یادگار تصویریں کھینچی۔ ایران میں ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ وہاں کی یونیورسٹیوں تک رسائی ایسی ہی ہے جیسے یہاں کے پارلیمنٹ تک۔ ہم نے چاہا کہ ہم تہران یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے اور باقی حصوں کو دیکھیں جو ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس لئے پروفیسر علی بیات صاحب نے اپنی طرف سے ایک تحریری دستاویز اپنے دستخط کے ساتھ بنا کر دی تا کہ ہماری رسائی ان تعلیمی اداروں تک ممکن ہو پائے۔ ڈاکٹر علی کاوسی نژاد صاحب نے خود ایک ٹیکسی لائی اور ہمارے لاکھ منع کرنے کے باوجود خود ہی اس کی رقم بھی ادا کی اور بہت

مصروف ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ آئے اور ہمیں تہران یونیورسٹی کے مختلف حصے دکھائے۔تہران یونیورسٹی کا مرکزی کتب خانہ مختلف حصوں پر مشتمل تھا اور ہر حصے کا نام کسی عظیم اور معروف تعلیمی ہستی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ان حصوں میں ایک حصہ ''تالارِ اقبال لاہوری'' کے نام سے بھی منسوب کیا گیا تھا۔ہم نے یہاں بھی چند ایک تصویریں کھینچی۔جامعہ تہران ایران کی سب سے اہم اور اعلیٰ درجے کی جامعات میں شمار کی جاتی ہے۔یہ جامعہ ایک وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔ہم دانشگاہ تہران کے شعبہ اردو کے تمام اساتذہ خصوصاً پروفیسر آغا علی بیات صاحب اور ڈاکٹر علی کاوسی نژاد صاحب کا تہہ دِل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے گرما کی چھٹیوں کے باوجود اپنی تمام گھریلو اور دیگر اہم مصروفیات بالائے طاق رکھ کر ہمدان اور کرمانشاہ کے طویل سفر طے کئے اور ہمارے لئے تہران یونیورسٹی آئے۔یہ میرے لئے خصوصاً باعثِ سعادت وافتخار رہے۔

آج جولائی 29 کا دن ہم نے قم میں گزارا اور یہاں کے بازاروں میں گھومنے کے ساتھ ساتھ نزدیک ہی کچھ دوری پر واقع ایک آتش کدہ نویس کے علاوہ مشرق میں واقع ایک جھیل 'دریاچہ حوضِ سُلطان' پر گئے۔اِس کے علاوہ قم کے شمال سے ہوتے ہوئے مغرب میں واقع 'حوضِ سلطان' سے بہت ہی بڑی جھیل ''دریاچہ نمک'' کی طرف بھی گئے۔

جولائی 30 کا سفر ہم نے صبح کے پانچ بجے شروع کیا۔آج کے سفر کے لئے ہمیں اپنے سفری رہنما جناب محمد خیریان کے ساتھ ''دریائے خذر'' (Caspian Sea) جانے کا فیصلہ کیا جو ایران کے انتہائی شمال کے صوبہ 'مازندران' کے 'کلاردشت' میں واقع ہے۔قم سے نکلتے ہوئے ہم نے تہران کی شاہراہ اختیار کی اور حسن آباد کے مقام پر کرج کا راستہ اختیار کرتے ہوئے کلاردشت کی راہ اپنائی۔کرج سے نکلتے ہی راستہ

انتہائی پُر خطر نظر آنے لگا۔ کیونکہ یہ مختلف پہاڑی سلسلوں کو چیرتے ہوئے کلاردشت جاتا ہے۔ حالانکہ یہ راستہ سرینگر جموں شاہراہ سے بہت پیچیدہ ہے۔لیکن اسے ہم سرینگر جموں شاہراہ کے مقابلے میں پُر خطر راستہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ راستہ بہت ہی کشادہ اور صاف وشفاف ہے اور اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ محسوس ہی نہیں ہورہا ہے کہ یہ خطروں سے پُر ہے بلکہ اس کی بجائے اس راہ پہ چلتے چلتے سیاح اس کے رنگ بدلتے نظاروں سے لطف اندوز ہوجاتے ہیں اور راستے کے جس طرف بھی گاڑی کو حادثے کا خطرہ لاحق ہونے کا امکان ہے، اس طرف کو محفوظ بنانے کی کافی کوشش کی گئی ہے جس کا تصور ابھی سرینگر جموں شاہراہ پر نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے سیاحتی رہنما محمد خیریان کو یوں محسوس ہورہا تھا کہ شاید یہ لوگ پہلی بار ایسے راستوں کا نظارہ کررہے ہیں۔ جب ہم نے ان سے کہا یہ تو ایک بہترین راستہ ہے تو وہ عش عش کرتے رہ گئے۔انہوں نے سوچا کہ شاید ہندوستان میں ایسے پُر خطر راستے نہیں ہوں گے۔

شروعات میں ہی محسوس ہورہا تھا کہ یہ مختلف جہات کا سفر ہے۔تقریباً صبح کے آٹھ بجے کے قریب کرج سے ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد ہم نے سڑک کے کنارے ایک خوبصورت اور دلکش ریسٹورنٹ پر ناشتہ کیا۔ ''شب نشین'' نامی یہ ریسٹورنٹ تیز وتند رَواں دَواں دریائے کرج کے کنارے پُر فضا جگہ پر مقامی تمدن اور ثقافت کو مدنظر رکھتے ہوئے تعمیر کیا گیا تھا۔ مجھے دفعتاً اپنے بچپن کا گاؤں یاد آ گیا۔ جیسے اسی کشمیری طرز تعمیر کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہ ریسٹورنٹ بنایا گیا ہو۔ دھان کے گھاس کی چھت اور اسی گھاس سے بنائی گئی رسیوں کو دھات کے کھمبوں پر ایسے لپیٹا گیا تھا جیسے یہ رسیوں کا ہی کھمبا اُگ آیا ہو۔ جہاں اندر بیٹھنے کے لئے آرام دہ کمرے نظر آرہے تھے، وہیں دریائے کرج کے کنارے بیٹھنے کے لئے آرام دہ چارپائیاں تھیں جن پر مقامی قالین بچھائے گئے تھے تاکہ سیاحوں کو پُر فضا اور پُر رونق ماحول میں

بیٹھنے کا موقع میسر رہے۔حالانکہ ابھی صبح کا ہی وقت ہوا تھا۔لیکن اس کے باوجود یہاں الگ الگ چار پائیوں پر کئی ایک جوڑے ناشتے کے ساتھ شفاف حقوں میں پانی میں دھوئیں کو دھو کے تمبا کو کے کش ایسے لے رہے تھے جیسے بے پروا بادل کہیں برسنے کو جا رہے ہوں۔

شب نشین کی صبح نشینی کے بعد ہم گاڑی میں بیٹھ کر خوبصورت وادیوں میں، دریاؤں، جھیلوں، جنگلوں کو دیکھتے دیکھتے یہ ورد کرتے رہے کہ بے شک اللہ خوبصورت ہے اور بس وہی ایسی خوبصورتی تخلیق کر سکتا ہے۔ایک جگہ ہم رُک گئے جہاں بجلی اور آبپاشی کے لئے ایک بڑا ڈیم تعمیر کیا گیا تھا جس کا نام ''امیر کبیر'' ڈیم تھا۔میں نے بہت سی جگہوں پر امیر کبیر کا نام لکھا ہوا دیکھا۔یہ امیر کبیر کون تھے؟ یہ امیر کبیر وہی امیر کبیر تو نہیں جو ہمدان سے کشمیر اسلام پھیلانے کے لئے آئے تھے! لیکن محمد خیریان نے اس کی تصحیح کردی۔

یہاں سے نکلنے کے بعد ہم بہت ہی خوبصورت علاقوں سے گزرتے رہے۔کئی ایک جگہ لوگ قدرتی طور پہاڑوں سے اترتے ہوئے پانی جو کہ پھوارے کی مانند سڑک کے کنارے منظر کو اور بھی دلکش بنا رہا تھا اور لوگ ان ہلکے پھلکے آبشاروں کے نیچے مستی کر رہے تھے۔ہم نے چلتے چلتے وقفے وقفے پر تختیوں پر ''تمشک جنگلی'' لکھا ہوا پایا۔دراصل یہ جنگلی شہتوت تھے۔ایک جگہ ہم نے بھی ان جنگلی شہتوتوں کو خریدا۔یہ شہتوت بڑے ہی رسیلے، باہر سے سیاہ اور اندر سے سرخی مائل، ویسے ہی جیسے کشمیری شہتوت ہوا کرتے ہیں۔یوں ہنستے کھیلتے ہم 'کلاردشت' کے ایک دور دراز قصبہ 'کردی چھال' پہنچ گئے جو بہت ہی دیدہ زیب تھا۔دکانیں اور سڑکیں نہایت ہی سلیقے اور عمدگی سے تعمیر کی گئی تھیں۔قریب میں ایک نجی یونیورسٹی اور نجی پیشہ ورانہ طرز کا ایک کالج نظر آ رہے تھے۔ہم نے یہاں 'وحید فقیہ' نامی شخص کے گھر کے ایک حصے کو شب نشینی کے لئے

کرائے پر لے لیا جو نہایت ہی شاندار اور دیدہ زیب تھا۔ گھر کے مرکز میں ایک بڑا سا کمرہ تھا، جسے ہم لابی کہتے ہیں اور اس بڑے کمرے کے ایک طرف کھلا کچن جس میں کھانا پکانے کی تمام جدید سہولیات دستیاب تھیں۔ لابی کے دوسری طرف آرام کرنے کے لئے ایک کمرہ تھا۔ اس کمرے کے ساتھ ہی باہر غسل خانہ اور بیت الخلا کی سہولیات الگ الگ موجود تھیں۔ لابی میں نیچے دلکش ایرانی قالین اور دو تین آرام دہ صوفے بھی لگے تھے۔

ہم نے اپنا سامان رکھا اور نہا دھو کر پاس ہی میں ایک مقامی ریسٹورنٹ ''ریستوران محلی'' کھانا کھانے کے لئے منتخب کیا۔ ایران کے چھوٹے بڑے شہروں اور دیہات میں عورتیں خصوصاً کم عمر لڑکیاں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرنے میں مصروفِ عمل ہوتی ہیں۔ جہاں بڑے شہروں میں خواتین دکانوں، خصوصاً کھانا کھانے کی دکانوں پر بڑی تعداد میں کام کر رہی ہیں' وہیں کئی ایک دیہات میں خواتین کو میں نے سبزیاں اور میوے فروخت کرنے میں منہمک دیکھا۔ ہندوستان میں بھی میں نے کئی ایک جگہ دیکھا کہ مچھلیاں عورتیں ہی فروخت کرتی ہیں۔ ہوسکتا ہے ایران میں بھی ایسا ماحول پایا جاتا ہو۔ لیکن میری نظر سے ایسا منظر نہیں گزرا۔ حالانکہ تاشقند کے چہرسو بازار اور سمرقند کے اکثر بازاروں میں بھی وہاں کی عورتیں ہی مچھلیاں فروخت کرتی ہیں۔ اصل میں اس کے پیچھے عملی طور پر اگر دیکھا جائے کہ مرد مچھلیاں پکڑنے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعد ازاں عورتیں ان مچھلیوں کو فروخت کرنے کے لئے بازار میں نکلتی ہیں۔ بہر حال اس ریسٹورنٹ کی خاص بات یہ تھی کہ مالکہ ایک خاتون تھی اور کمال یہ کہ جہاں اس کے ریسٹورنٹ پر ملازم کام کرتے تھے وہیں یہ خاتون بھی ان کے شانہ بہ شانہ کام کرنے میں مصروف تھی بلکہ یہ اپنے ملازمین سے زیادہ کام کرتی نظر آ رہی تھی۔ جہاں یہ خریداروں کے تمام معاملات خود دیکھتی تھی،

جیسے انہیں کیا چاہیئے یا رقم کی ادائیگی وغیرہ' وہیں کھانا خریداروں تک پہنچانے میں بھی ملازمین کی رہنمائی اور مدد بڑی خوش اخلاقی سے کرتی نظر آرہی تھی۔

ایران میں ہمارے سفری رہنما جناب محمد خیریان کے کہنے پر ہم نے اس ریسٹورنٹ میں جو کھانا طلب کیا' اس میں پہلے کھانے کا نام محمد خیریان کے مطابق ''با قالی قاتوق'' ہے۔''با قالی قاتوق'' ایک قسم کی لذیذ دال ہے جس میں انڈا ملایا گیا تھا۔اس کے ساتھ ہم نے ایک اور قسم کا کھانا مانگا جس کا نام ''ترش وارش خرشت'' تھا۔ سادگی سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کھانا پالک اور مرغے پر مبنی کھانا تھا۔لیکن اِس میں ہلکا سا کھٹا پن محسوس ہو رہا تھا، جس نے اس کی لذت میں اور بھی اضافہ کیا تھا۔اس کے علاوہ ہم نے اپنی پسند کے مطابق چاول روٹی اور دہی لے لیا۔دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم نے ''ریستوران محلی'' کی مالکہ کے ساتھ چند ایک تصویریں بھی بنائی۔

یہاں سے نکلنے کے بعد ہم نے سیدھے دریائے خذر (Caspian Sea) کا رخت سفر باندھا جو کہ یہاں سے 35 کلومیٹر کی دوری پر واقع تھا اور جس مقام پر ہمیں پہنچنا تھا اس کا نام عباس آباد تھا۔ یوں ہم نے عباس آباد کے جنگلوں کی خوبصورت مگر خوف ناک راہ اپنائی۔جنگل بہت ہی گھنے تھے اور ان جنگلوں سے گزرتے وقت دھوپ اور چھاؤں کا ایک دلفریب رقص ہمارے ساتھ محوِ سفر تھا۔جنگل بھی عجیب وغریب منظر پیش کر رہا تھا۔اس کے باوجود کہ ہم دونوں جنگل کے قریبی علاقوں کے رہنے والے ہیں، کئی ایک جگہ جنگل اتنا سنسان دکھائی دے رہا تھا کہ انسان کے اندر ایک طرح کا خوف طاری ہوجاتا تھا۔حالانکہ راستہ بہت محفوظ تھا۔جگہ جگہ پر کھانے پینے کی دکانوں کے علاوہ سیلانی آرام کرنے میں مست تھے۔اس سنسان جنگل میں تقریباً بیس سے پچیس کلومیٹر چلنے کے بعد ہم نے ایک جگہ خوبصورت دکان پر چائے پینے کا ارادہ کیا۔ہم نے یہاں 'کافی' خود بنائی۔لیکن دکاندار سے مقامی

بُنی ہوئی مکئی لے لی۔ جسے یہاں ’بَلال‘ (بَ لال) کہا جاتا ہے، یہ نہایت ہی لذیذ تھی۔شاید اس پر بُننے کے دوران یا بعد میں مکھن لگایا گیا تھا،جس سے اس پر چکناہٹ یا رسیلا پن آ گیا تھا۔ کچھ دیر یہاں بیٹھنے کے بعد ہم سیدھے دریائے خذر کی طرف بڑھ گئے۔جب ہم یہاں پہنچے اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔سمندر کی ایک الگ خوبصورتی ہوتی ہے، لیکن دریائے خذر کی جو خوبصورتی ہے اس کا جواب نہیں۔ یہ ایران اور اس کے ہمسایہ مما لک کے درمیان ایک اہم آبی راہداری ہونے کے بموجب اقتصادی طور ریڈھ کی ہڈی تسلیم کی جاتی ہے۔دریائے خذر سے جن مما لک کی آبی سرحدیں ایران کے ساتھ ملتی ہیں ان میں آرمینیا، آزربائی جان، ترکمانستان، روس وغیرہ شامل ہیں۔

یہاں پر بہت دیر بیٹھنے کے بعد تقریباً رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہم یہاں سے واپس ’رد برگ‘ کی طرف نکلے۔ہم نے واپسی پر وہی راستہ اختیار کیا جہاں سے ہم آئے تھے۔اس طرح تقریباً گیارہ بجے کے قریب ہم ’کردی چھال‘ کے اصلی بازار پہنچے۔دور دراز کا بازار ہونے کے باوجود یہاں ہر طرح کی سہولیات دستیاب نظر آ رہی تھیں۔سیلانی یہاں زیادہ ٹھہر جاتے ہیں۔کیونکہ یہاں کی مقامی چیزیں قابل دید ہیں اور خریدار کا دل موہ لیتی ہیں۔ یہاں کی مٹھائیاں‘ دہی‘ کپڑے دھونے کا صابن اور اچار بہت مشہور ہیں۔مٹھائیوں کے حوالے سے ’شیرینی کاکا‘ کی دکان بہت ہی معروف بلکہ اس حوالے سے ایک تجارتی نام (Brand) تسلیم کی جاتی ہے۔ہم نے اور میں نے ذیابیطس کے باوجود) یہاں سے تھوڑی بہت مٹھائیاں خرید کر کھائیں، جن کا ایک منفرد ذائقہ تھا۔ہم اچار کی ایک بڑی دکان پر گئے۔اچار فروش نے کہا کہ آپ ہر ایک قسم میں سے چکھ کر دیکھ لیں ہم نے اَن گنت اقسام میں دو ایک قسم کے اچار چکھ کر دیکھے، زیتون کا اچار نہایت ہی لذیذ تھا۔

گردش بازار کے بعد ہم نے یہاں کے مقامی اور خوبصورت ریسٹورنٹ ''آرائش'' کے پاس رات کا کھانا کھایا۔ یہ ریسٹورنٹ نہایت ہی دیدہ زیب تھا اور اس ریسٹورنٹ پر ایک خوبصورت لڑکی نہایت ہی شائستہ انداز میں استقبالیہ پر خریداروں کا استقبال کر رہی تھی۔ یہاں کے مقامی لوگ زیادہ تر 'مازندرانی' بولتے ہیں۔ یہاں رہنے والے کچھ مہاجرین 'کُردی' بھی بولتے ہیں۔ لیکن یہ محترمہ ان دونوں میں کوئی بھی زبان نہیں بولتی تھی بلکہ یہ خالص فارسی میں بات کر رہی تھی۔ بعد میں اس خوب رو نے ایک نوعمر لڑکے کو آواز دے کر کچھ کہا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لڑکا ہمارے پاس آیا اور پانی کے ساتھ ساتھ ایک کتابچہ ہمارے سامنے رکھا، جس میں یہاں پر بننے والی منتخب غذاؤں کی فہرست دی گئی تھی۔ ہم عرصہ دراز سے ایک مخصوص کھانے کی تلاش میں تھے اور وہ تھا ''اکبر جوجہ''۔ لیکن دی گئی فہرست میں ''اکبر جوجہ'' درج نہیں تھا۔ پھر بھی ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا ''اکبر جوجہ'' مل سکتا؟ تو انہوں نے کہا بالکل مل جائے گا، ہمارے پاس دستیاب ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ فہرست بنتے وقت کچھ چیزوں کا اندراج کرنا یاد نہیں رہتا۔ اس لئے پوچھنا لازمی بن جاتا ہے بلکہ ہوسکتا ہے پوچھنے پر آپ کی پسندیدہ چیز آپ کو مل جائے۔ اب ہمارے پاس مسئلہ یہ تھا کہ ''اکبر جوجہ'' کیسا ہوگا۔ اسی بیچ یہ منفرد غذا ہمارے سامنے پہنچ گئی۔ جوجہ فارسی میں مرغے کو بولتے ہیں اور اکبر کے معنی بڑے کے ہیں۔ ان معنوں میں میرے ذہن نے جو جوجہ پکایا تھا وہ نہایت ہی بلند پائے کا تھا۔ لیکن یہ کیا کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ کشمیری میں اس طرح کے مرغے کو ''شُلہِ پُوت'' کہتے ہیں جو عام طور پر بیماروں کو کھلایا جاتا ہے۔ یہ مرغا اکبر کیا اصغر کے بھی بچے کا بچہ نکلا۔ میری نظر میں اِس کا وزن تین سو گرام سے چار سو گرام کا ہوسکتا تھا۔ یہ تندوری مرغ کے انداز پر تیار کیا گیا تھا۔ مگر یہ مکمل ایک مرغا پوری طرح سے تیار کیا جاتا ہے۔ یوں ہمارے سامنے تین مرغے لائے گئے، جو

نہایت لذیذ تھے۔انہیں کھانے میں جو لطف آیا وہ تندوری مرغ میں کہاں؟۔شاید اس کی اعلیٰ لذت کے حوالے سے اسے ''اکبر جوجہ'' کا نام دیا گیا ہو' وگرنہ یہ کسی بھی صورت میں یہ بڑا امر غانظر نہیں آ رہا تھا۔کھانا کھانے کے بعد دیر گئے تک اس موضوع کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔محمد خیریان نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ جس باورچی نے اس غذا کو پہلی بار بنایا تھا،اس کا نام ''اکبر'' تھا۔اس لئے اس کے نام پر بعد میں اس مخصوص غذا کا نام ''اکبر جوجہ'' رکھا گیا۔یا اس نے اِسے خود ''اکبر جوجہ'' کا نام دیا۔

ختم شد

☆☆☆

غزلیات:

☆......رفیق رازؔ

تجھ پر ہوئے نثار ہیں اب تک کئی چراغ
اے شب یہ میری آنکھ ہے اب آخری چراغ

آتی ہے روشنی سی ابھی تک کہیں سے دیکھ
زندہ ہے اے ہوا تہہِ داماں کوئی چراغ

لیتا ہے دہر سانس تو تھرا رہے ہیں ہم
ہیں آندھیوں سے خوف زدہ آج بھی چراغ

اب لوٹ ہی چلوں کہ بہت رات ہوگئی
چوکھٹ پہ راہ دیکھتا ہوگا مری، چراغ

اس حجرۂ فقیر کو بھر دے نہ دود سے
ظاہر کرے خدا نہ کرے برہمی چراغ

روشن ہر ایک گوشۂ مخفی کو کردیا
گزرا جہان شب سے کہاں سرسری چراغ

خاموشی ہے وہ روشنی جس کو نہیں زوال
دنیا میں اک سکوت ہی ہے دائمی چراغ

اس نے ہر ایک رنگ میں جل کے دکھا دیا
ہے قمقموں کے شہر میں اولیٰ یہی چراغ

بس فرق ہے یہ آج کی شب ہے شبِ فراق
کمرا وہی ہے، طاق وہی ہے، وہی چراغ

☆☆☆

اک کردار ہوا ہے قید فسانے میں
اس نے عشق پری سے کیا اَن جانے میں

تیرے عہد میں آنکھ کھلی یہ جرم ہے بس
آنکھ لگی تھی غار میں اپنے زمانے میں

بیتے ہوئے دن آجائیں گے خوابوں میں
خطرہ ہے یہ رات کی شاخ ہلانے میں

دریا اپنے وقت پہ سوکھ گیا سارا
دیر لگی ہم کو ہی ناؤ بنانے میں

جنگل میں لاکھوں جنگل پوشیدہ ہیں
جنگل ایک چھپا ہے بیج کے دانے میں

اوروں کے شعروں سے الگ ہیں شعر مرے
فرق بہت ہے کہنے اور فرمانے میں

☆☆☆

☆......رفیق رازؔ

ندی، پیاسا نہیں ہوں شور ہوں تیری روانی کا
کہ میں قاری نہیں، کردار ہوں تیری کہانی کا

بھرم کھولا اسی تیشے نے اس کی بے زبانی کا
کہ یہ سامع ہے اس چٹان کی آتش بیانی کا

میں کر بیٹھا ہوں جاری انگلیوں سے لمس کی نہریں
نظارا کر رہا ہوں جسم کی آتش فشانی کا

زمانے کی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہوں، زندہ ہوں
کہ میں احساسِ لافانی ہوں اپنی رائگانی کا

کروں وہ رنگ کس منہ سے طلب بے رنگ سے آخر
بنے جس رنگ سے اک نقش میری بے گمانی کا

خدا ہوتا ہے اس کا دیکھ تو جس کا نہیں کوئی
جنازہ ہے ہوا کے دوش پر برگِ خزانی کا

ملا ہے کام وہ فرہاد کو ملتا نہ کر پاتا
ملا ہے عہدہ مجھ کو دشت ہی کی باغبانی کا

☆☆☆

اک پل کا ہے قیام سرائے حباب میں
رہتے مگر ہیں ٹھاٹ سے اس قصرِ آب میں

کرنے ہیں ایک ساتھ مسخر یہ خشک و تر
اک پاؤں ہے بھنور میں تو اک ہے رکاب میں

اپنی ہی روشنی سے بہت ڈر رہا ہوں میں
لرزاں ہوں مثلِ شعلہ ہی فانوسِ آب میں

وہ برگ ہوں جو رقص ہوا میں نہ کر سکا
مجھ کو کسی نے قید کیا ہے کتاب میں

تیرے سوال سے ہوئے پیدا کئی سوال
ان میں سے چند بھیج رہا ہوں جواب میں

آزاد کر سکا نہ ابھی تک مجھے کوئی
معنی ہوں مجھ سے حرف ادق ہے عذاب میں

جلوہ تمام قلب پہ روشن ابھی کہاں
منظر ابھی ہے رنگ نظر کے حجاب میں

☆☆☆

☆......پروفیسر شہپرؔ رسول

ہر ملاقات ، ملاقات نہیں ہوتی ہے
بات ہوتی ہے مگر بات نہیں ہوتی ہے
اوڑھ کیا لی ہے سیاہی میں سفیدی کی ردا
دن ہی دن ہے یہاں اب رات نہیں ہوتی ہے
شاعری خوب کرو، عشق میں برباد پھرو
اِس سے کم عزتِ سادات نہیں ہوتی ہے
مدحیہ کوئی قصیدہ لکھو یا ہجو کہو
کوئی تبدیلیٔ حالات نہیں ہوتی ہے
پہلے سچ کہتے ہیں پھر اس پہ ڈٹے رہتے ہیں
لیکن اِس سے گزر اوقات نہیں ہوتی ہے
فکر کو ضبط سے ہم لفظ کیا کرتے ہیں
ہم پہ اشعار کی برسات نہیں ہوتی ہے
طنز تو کرتے ہیں، شکوے نہیں کرتے شہپرؔ
اِس سے عریانیِ جذبات نہیں ہوتی ہے

☆☆☆

بسترِ خاک پہ سونے کا مزہ جانتے ہو
کچھ نہ ہونے کا، نہ کھونے کا مزہ جانتے ہو
اک ذرا رونے سے آنکھوں میں یہ ویرانی ہے
خون میں پلکیں بھگونے کا مزہ جانتے ہو
نہ کوئی نام و نشاں اور نہ گواہی اپنی
اپنے ہوتے بھی نہ ہونے کا مزہ جانتے ہو
آگ میں آگ لگانے کا ہنر دیکھا ہے
ٹھنڈ میں گیلے بچھونے کا مزہ جانتے ہو
اپنے جَل بجھنے کی روداد سنائی ہے کبھی
درد میں لفظ پرونے کا مزہ جانتے ہو
وہ تو ہنس لیتے ہیں شہپرؔ کبھی رونے میں بھی
تم نہ رونے میں بھی رونے کا مزہ جانتے ہو

☆☆☆

☆......احمد رئیس

کیسے جیتے ہیں یہ بیتے ہوئے لمحات کے ساتھ
تجھ کو کیا واسطہ رندانِ خرابات کے ساتھ
اے مری جاں تری زلفوں کو دوں کس سے تشبیہ
تازیانے سے کہ زنجیر کہ ظلمات کے ساتھ
تجھ کو ڈالا ہے غزل میں بڑی فنکاری سے
جزئیات اور کمالات و محاکات کے ساتھ
کون اس طرح ترا ذکر غزل میں کرتا
استعارات و علامات و اشارات کے ساتھ
وہ فقط میرا ہے ہمدم وہ رہے گا میرا
ڈوب جاتا ہے یہ دل ایسے خیالات کے ساتھ
مجھ کو خاموش کیا بزم میں اس نے ورنہ
باب کھلتے تھے مراسم کے ہر اک بات کے ساتھ
میں ترے ساتھ رہوں گا ہے یہ وعدہ، جیسے
دیکھتا آیا ہوں پیوستہ میں دن رات کے ساتھ
طعن و تشنیع و ملامت سرِ بازار قبول
اک تعلق ہے پرانا جو مری ذات کے ساتھ

☆☆☆

زندگی کا جواب لکھتے ہیں
حادثاتِ کتاب لکھتے ہیں
ہو ہواؤں میں جیسے مشت ِ خاک
زیست تجھ کو سراب لکھتے ہیں
ہونٹ شیریں ہیں اور باتوں کو
تیری چنگ و رباب لکھتے ہیں
تیرے حسن و جمال کو شاعر
اور عاشق عذاب لکھتے ہیں
پیرہن سے جھلک رہا ہے اسے
جانِ جاناں شباب لکھتے ہیں
زلف زنجیر ہے، کماں ابرو
آنکھوں کو ہم شراب لکھتے ہیں
جانِ جاں ہم تمہاری قربت کو
اک ادھورا سا خواب لکھتے ہیں
قیمت ِ حسن سے ہیں غافل جو
لب کو برگِ گلاب لکھتے ہیں

☆☆☆

☆......احمد رئیسؔ

خارو پیکان و خدنگ آہو کہ پیمانے ہیں
کتنے منسوب تری آنکھوں سے افسانے ہیں
ساغر جام کہ مینا ہیں تمھاری آنکھیں
تشنہ لب دیکھ ترے شہر کے دیوانے ہیں
بادۂ ناب ترے ہونٹ، نگہ پیمانے
زلف زنجیر و رسن، دام کہ تہہ خانے ہیں
ہونٹ ہیں موجِ شراب اور یہ آنکھیں ساغر
جو ہوں پیوستہ اگر دونوں تو میخانے ہیں
برگ لب یا ہیں مسیحا کہ عقیق و مصری
اب تلک لوگ ترے حسن سے بیگانے ہیں
سنگِ مرمر ہے بدن سرو صنوبر قامت
دل پہ جو زخم لگے دیکھ کے، بتلانے ہیں
آئینہ، زہرہ جبیں ایسے نہ بے پردہ ہو
کیوں کہ گردش میں ترے شہر کے پروانے ہیں
کیا ستائے غمِ دوراں کی یہ تلخی مجھ کو
دل لگانے کے بتا اور کیا جرمانے ہیں
اک غزل میں نہیں ہوتا ہے بیاں حسن رئیسؔ
اب قصیدے تو تجھے ذوقؔ سے لکھوانے ہیں

☆☆☆

مجھ مریضِ غم کی بس زندگی ہے تنہائی
دیکھ لو کہ میرے بن رو رہی ہے تنہائی
ظلمتوں کی راہوں پر زندگی اکیلی ہے
اور دل کے آنگن میں چیختی ہے تنہائی
تیرے حوصلوں نے ہی مجھ کو بھی گرایا ہے
کیوں مجھے بتایا تھا کاغذی ہے تنہائی
اب یہی مداوا ہے ہجر کے پھپھولوں کا
بے کلی کہے دل کی اوڑھنی ہے تنہائی
بیٹھ کر بیاباں میں ہم کلام ہونا ہے
رات کی خموشی میں بولتی ہے تنہائی
حسن کی عبادت میں حادثہ یہ ہونا تھا
آپ کیوں پریشاں ہیں؟ پوچھتی ہے تنہائی
اے مری رفیقِ غم آ مرے قریب آخر
کان میں نہ جانے کیا کہہ رہی ہے تنہائی
اے رئیسؔ نکلے ہو بے اماں سی گلیوں میں
حادثوں کے جنگل میں ڈھونڈتی ہے تنہائی

☆☆☆

☆......راہؔی گل

عشق مرا اور میری جوانی تیرے نام
صبح مری اور شام سہانی تیرے نام
اِک دریا سی میری ہستی بہتی ہے
لہریں ، کنکر سارا پانی تیرے نام
گلیوں گلیوں تجھ کو ڈھونڈا ہر موسم
شام ، سویرا ، رُت مستانی تیرے نام
میں نے اندھیرا چُن تو لیا ہے اپنے لئے
جگنو، تارے، رات کی رانی تیرے نام
ساتھ سُروں کی میں نے چھیڑی ایک غزل
سارے، گا، ما، پا، دا، سا، نی تیرے نام
اِس کو جلا دوں، دفن کروں یا پڑھتا رہوں
ہاتھ لگی ہے ایک کہانی تیرے نام
شہر کی گلیاں ، راہ کا راہیؔ، سب قرباں
اپنی لکھ دی ایک کہانی تیرے نام

☆☆☆

یہ ندیاں ، یہ جھرنے ہوا چاندنی سب
تمہاری بدولت جواں زندگی سب
کہا کب یہ میں نے ہے دھوکہ دِکھاوا
محبت ، عنایت، تری دوستی سب
یہ بادہ، صراحی، یہ مستی کا عالم
ہے پلکوں پہ تیری مری مے کشی سب
ردیف و قوافی زمیں بھی ہے میری
لکھی اُس پہ لیکن تیری شاعری سب
عجب دھن پہ چھیڑی غزل تم نے راہیؔ
ہے سرگم ستارا مدھر راگنی سب

☆☆☆

☆......راہیؔ گُل

کچھ نہ کچھ تو روز لٹانا پڑتا ہے
شہر یہ دل کا ایسے بسانا پڑتا ہے
یوں تو اکیلے کام کوئی ہوتا ہی نہیں
اک دوجے کا ہاتھ بٹانا پڑتا ہے
اکثر دل میں ہوتے ہیں ناسور بھی کچھ
لوگوں سے ہر زخم چھپانا پڑتا ہے
اُن کی نظر میں رشتے کی قیمت نہ رہی
رشتہ اُن سے پھر بھی نبھانا پڑتا ہے
کب سنتا ہے دل یہ اپنا سیدھی بات
اپنے اندر شور مچانا پڑتا ہے
دل کے ہاتھوں اتنے ہیں مجبور میاں
اُن کی گلی میں آنا جانا پڑتا ہے
اک دو دن کی بات جو ہوتی آساں تھا
اُن کو راہیؔ روز بھلانا پڑتا ہے

☆☆☆

حد سے آگے گزر گیا آخر
اس تماشے میں سر گیا آخر
بس محبت کا ایک باقی تھا
یہ نشہ بھی اُتر گیا آخر
میرے پہلو میں اب نہیں رہتا
سوچتا ہوں کدھر گیا آخر
اب کہیں وہ نظر نہیں آتا
اِن ہواؤں سے ڈر گیا آخر
ایک ہی تھا جو بات کرتا تھا
اب وہ راہیؔ بھی مر گیا آخر

☆☆☆

☆......عادلؔ حیات

یادِ ماضی کی بالا دستی ہے
غم سے ارزاں ربابِ ہستی ہے
شاخِ دل پر کھلا ہوا ہے پھول
خوشبوؤں سے فضا میں مستی ہے
کس کو دیکھا کہ آج آنکھوں میں
روشنی چاند کی برستی ہے
دن کے سائے بہت ڈراتے ہیں
رات ناگن سی مجھ کو ڈستی ہے
مجھ کو وعدے پہ ٹال دیتا ہے
کیسی اس کی خدا پرستی ہے
آدمی ہے نہ کوئی آدم ذات
کیا خرابہ ہے، کیسی بستی ہے
یہ بھٹکتی ہوئی نظر عادلؔ
پھر کسی سائے کو ترستی ہے

☆☆☆

ہم ہیں نشے میں، عالمِ عنقا نشے میں ہے
مرکز پہ گھومتی ہوئی دنیا نشے میں ہے
ناداں تو پہلے ہی سے نشے میں تھے چور چور
خود آگہی کے زعم میں دانا نشے میں ہے
باہر کناروں پر تو ہیں طغیانیوں کی بات
تھم تھم کے بہہ رہا ہے جو دریا نشے میں ہے
بس اک نظر ملی تھی فقط اتنا یاد ہے
حالت ہے وجد کی، ترا شیدا نشے میں ہے
پینے کے بعد ہوش میں رہنا ترا نصیب
جو پی نہیں سکا ہے، وہ تنہا نشے میں ہے
عادلؔ سفر میں زیست کے دشواریاں تو ہیں
لیکن ہمارا عزمِ تمنّا نشے میں ہے

☆☆☆

☆......شیخ الطاف عیابؔ

اِس طرح دیکھ رہا ہے کوئی حیرانی سے
جیسے پہچان ہی لے گا مجھے آسانی سے
مجھ سے ملنے کوئی آئے تو یہ کہنا اس سے
لوٹ جائے نہ ملے اپنی پشیمانی سے
رونقیں راس نہیں آئیں مجھے کیا کرتا
مشورہ کر لیا پھر بعد میں ویرانی سے
یاد آتا ہے وہ جلتا ہوا گھر جب مجھ کو
ڈرنے لگتا ہوں چراغوں کی نگہبانی سے
تو سرِ عام بھلے ہنستا رہے کتنا ہی
لوگ پڑھتے ہیں اداسی تری پیشانی
جتنی مشکل سے ملا تھا تمہیں کوئی الطافؔ
تم نے کھویا ہے اُسے اُتنی ہی آسانی سے

☆☆☆

خبر یہ ملی تھی جفا مسئلہ ہے
مگر دیکھتا ہوں انا مسئلہ ہے
میاں عشق تو ہے بلا کا ہے لیکن
وہ جس سے ہے اس کی رضا مسئلہ ہے
تمہیں مل گیا ہے بنا مانگے ہی سب
تمہارے لیے تو دعا مسئلہ ہے
چراغوں کی کوئی شکایت نہ کرنا
ہوا آگ میں تھی ہوا مسئلہ ہے
نہ بے روزگاری نہ غربت نہ نشّہ
ابھی عشق سب سے بڑا مسئلہ ہے

☆☆☆

☆......شیخ الطاف عیاؔب

جتنے چہرے بھی جہاں میں مجھے بیزار ملے
با خدا سارے محبت میں گرفتار ملے
کیا غضب ڈھا گیا اس بار کا سیلاب یہاں
جو تھے اس پار کے باشندے وہ اس پار ملے
اس سے کہنا مرے الفاظ مجھے لوٹا دے
گر کہیں راہ میں وہ ماہرِ گفتار ملے
آپ جنت کے مکیں ہیں سو ذرا دور رہیں
میں گنہ گار ہوں مجھ سے تو گنہ گار ملے
تجھ سے جو عشق کیا ہجر منایا تیرا
اس کے بدلے میں یہ ٹوٹے ہوئے اشعار ملے
سو گیا رات قبیلے کا نگہباں الطافؔ
صبح خیموں کی جگہ لاشوں کے انبار ملے

☆☆☆

دے رہی ہے صدا بہار مجھے
یوں اُداسی میں مت گزار مجھے
پہلے اپنے قریب کر مجھ کو
دھیمے لہجے میں پھر پکار مجھے
میں بدن سے فرار تھا اُس دن
کیسے کرتا وہ آشکار مجھے
مجھ میں باقی رہیں نہ یہ جذبات
ایسی تخلیق سے گزار مجھے
دیکھ برباد کر دیا تجھ کو
اور دے خود پہ اختیار مجھے
اِس قدر حاوی تھی انا مجھ پر
اشک لینے پڑے ادھار مجھے
تجھ کو دیکھا تو آ گیا الطافؔ
آنکھ ہونے پہ اعتبار مجھے

☆☆☆

☆......مصروفہ قادرؔ

زمانے سے بغاوت ہے، نہیں تو
تجھے مجھ سے محبت ہے، نہیں تو
یہ سانسیں اب بھی دیکھو چل رہی ہیں
مجھے تیری ضرورت ہے، نہیں تو
میرا دل ہے کہ بس اب بجھ چکا ہے
ذرا سی بھی کدورت ہے، نہیں تو
بھنور میں ناؤ اب تو پھنس چکی ہے
نکلنے کی بھی صورت ہے، نہیں تو
کہا کس نے میں اس کو پوجتی ہوں
مرے گھر اس کی مورت ہے، نہیں تو
سنا ہے ہاتھ ٹوٹے ہیں وفا کے
کوئی اس میں حقیقت ہے، نہیں تو

☆☆☆

تیری بے رخی اب پرانی ہوئی
کہ بس ختم اب یہ کہانی ہوئی
یہ بالوں میں چاندی جو اتری میاں
تو کافور سمجھو جوانی ہوئی
تمہاری جفاؤں کا انداز دیکھ
وفا شرم سے پانی پانی ہوئی
تھا کیسے دریائے الفت ترا
بتا کیا وہ اس کی روانی ہوئی
یہ چادر اداسی کی ہمدم مرے
تیرے ساتھ کی اب نشانی ہوئی

☆☆☆

☆......مصروفہ قادرؔ

ازل کا کب میں کوئی فیصلہ ہوں
میں بس وہم و گماں کا سلسلہ ہوں
کرے دنیا مری پرواہ کیونکر
تمہارا ، بس تمہارا مسئلہ ہوں
جو تم سے طے کبھی بھی ہو نہ پایا
ہمارے بیچ کا وہ فاصلہ ہوں
چلے جو بھی وہ مجھ کو کوستا ہے
میں اک پُر پیچ و مشکل راستہ ہوں
گھری دنیا ہے کتنے مسئلوں میں
میں خوش ہوں بس تمہاری مبتلا ہوں

☆☆☆

کب وہ مجھ سے سوال کرتا ہے
خوب میرا خیال کرتا ہے
ہم سے ہی جانے کیا عداوت ہے
غیر سے عرض ِحال کرتا ہے
ہجر ہے یا کوئی قیامت ہے
پل کو بھی ایک سال کرتا ہے
دور یہ آفت و وبا کا ہے
جو جیے وہ کمال کرتا ہے

☆☆☆

☆......ممتاز احمد ممتازؔ

زندگی نے مشکلوں کے تیر مارے ہیں بہت
حوصلے لیکن بلندی پر ہمارے ہیں بہت
گو کہ تو نے دشمنی کی حد نہیں چھوڑی کوئی
ہم نے تیری چاہتوں پر خواب وارے ہیں بہت
ساتھ میرا چھوڑ کر تم شادماں ہو بے حساب
ہم مگر مغموم جاناں بن تمھارے ہیں بہت
لوگ جن کا حال سن کر چونک پڑتے ہیں میاں
زندگی میں ہم نے ایسے دن گزارے ہیں بہت
بات کرنے کی یہ زحمت تم گوارا کیوں کرو
تیری آنکھوں کے پری وش، بس اشارے ہیں بہت
آپ سا ممتازؔ ناداں دوسرا کوئی نہیں
تھوڑی چادر ہے مگر پاؤں پسارے ہیں بہت

☆☆☆

شادماں ہے اِس لئے بھی کوئی مارا یاد کا
زندگی کو مل گیا ہے پھر سہارا یاد کا
غم کی لہریں اشک بن کر تھرتھراتی ہیں یہاں
دل کے ڈل میں جب بھی چلتا ہے شکارا یاد کا
گر رہے ہیں زرد ہو کر سبز پتے آس کے
دل کے گلشن میں ہے موسم اب دوبارہ یاد کا
ہونٹ دیکھوں مسکراتے میں کسی کے جب کہیں
میرے اندر اٹھنے لگتا ہے شرارا یاد کا
اپنی آنکھوں کی لٹائی روشنی ہم نے مگر
آج بھی ممتازؔ روشن ہے وہ تارا یاد کا

☆☆☆

نظمیں:

☆......قیصر زماںؔ

عذابِ دانش

مرے وجود سے ہے کائنات
رنگا رنگ
مرے وجود کی گہرائیوں کو مت دیکھو
اسی وجود سے ہر دم
ہوں، بہت بے زار
کبھی اداس سے لمحوں میں
خواب بنتا ہوں
کبھی میں بھیڑ کا حصہ بن جاتا ہوں
مرا وجود مجھے تار تار لگتا ہے
کبھی وجود کی خاطر
میں رو بھی لیتا ہوں
کبھی اداس بیٹھا رہتا ہوں
مرا وجود مجھے روز روز
ڈستا ہے
میں اپنے آپ سے گھبرا کے
ڈر بھی جاتا ہوں
میں اپنی ذات کو اپنا رفیق
جانتا ہوں
مجھے اندھیرا بھی روشن
دکھائی دیتا ہے
مرے وجود کا ہر رنگ ہے طلسماتی
مرا وجود مرے ساتھ ساتھ
چلتا ہے
مجھے وجود کے جادو سے
خوف رہتا ہے
مرا وجود مجھے
سانپ بن کے ڈستا ہے

☆☆☆

☆......قیصر زماں

زوالِ آدم

زوالِ آدم بھی
کیا بلا ہے
چہار سو
حیرتوں کا عجب سلسلہ ہے
اداس لمحوں کی
خود کلامی
عجیب خلقت
خدا کی خاطر
خدا بنا ہے
عجیب حیرتوں کا سلسلہ ہے
زوالِ آدم بھی
اک بلا ہے
کبھی تو اپنی
انا کی خاطر
کبھی تو
اپنے مفاد میں بھی
خدا کی خاطر
خدا بنا ہے
عجیب حیرتوں کا سلسلہ ہے
زوالِ آدم بھی
عجب بلا ہے

☆☆☆

ناسٹال جیا

روز دن کی شورش میں
راہ کی پناہوں میں
کچھ دنوں سے یاد اس کی
اس طرف نہیں آئی
اور کچھ سکوں بھی ہے
ذہن کے دریچے پھر
دھیرے دھیرے کھلتے ہیں
اور گزرے ماضی کے
اس سے منسلک لمحے
ذہن و دل کے دریا میں
شورش و بلا بن کر
اس طرح در آتے ہیں
جیسے کوئی خود آئے
اور ایک پیاسے کے
ہونٹ پر زباں رکھ دے

☆☆☆

لہر بادباں

لہروں پر
کچھ زور نہیں ہے
لہریں تو آتی جاتی ہیں
اب کے برس تو
بوندیں بھی
لہروں کے ساتھ آئی ہیں
شام کی لہریں
صبح کی کرنیں
دونوں مل کر
لہر بادباں بن جاتی ہیں
لہروں پر کچھ زور نہیں ہے
لہریں تو
آتی جاتی ہیں

☆☆☆

☆......غضنفر علی

نیا جامِ جم

ہر اک قریہ، ہر اک قصبہ، ہر اک
کوچہ، ہراک گھر میں
ہر اک انسان کے ہاتھوں نے اپنی
انگلیوں سے جامِ جم اک تھام رکھا ہے
نیا یہ جام، جامِ جم سے بہتر ہے
کہ اس میں زندگی کا
رازِ سربستہ بھی افشاں ہے
مرقعوں کے علاوہ بھی بہت کچھ اس میں پنہاں ہے
نہاں اس جام میں جلوت کے مظہر ہیں
مداوائے شبِ خلوت عیاں ہے
اس کے شیشے سے
علاجِ بے دلی ہے،
تشنہ کامی کی دوا بھی ہے
نجاتِ ہجر کا نسخہ بھی ہے
صورت وصالِ یار کی بھی ہے
ہر اک منظر کا
پس منظر ہے اس میں
اور سب کا پیش منظر بھی
نظر مرکوز ہے اس طرح شیشے میں
مرقعوں پر
کہ کوئی شور، ہنگامہ، کوئی جذبہ، کوئی
احساس، کوئی درد، کوئی آہ، کوئی اشک
ٹس سے مس نہیں کرتا
کسی بھی جسمِ بے حس کو
کسی بھی ذہنِ جامد کو
سبھی مشغول رہتے ہیں
نظر سے، ذہن سے، دل سے، مشاغل
میں
کسی کو کھیل کوئی
کھیل میں مصروف رکھتا ہے
کسی کو رنگ کوئی اپنے اندر گھول لیتا ہے
کسی کے سامنے منظر کوئی
جنت کی کھڑکی کھول دیتا ہے

کوئی ریشم کسی کو باندھ لیتا
اپنے دھاگوں میں
دھنک کچھ پتلیوں کو گوندھ لیتی اپنی
کرنوں میں
کسی کو نور کی نیرنگیاں مسحور کرتی ہیں
کسی کو کچھ عجب رنگینیاں محصور کرتی ہیں
کسی کو لہریاں سُر کی جکڑ لیتیں
کسی کو تتلیاں آ کر پکڑ لیتیں
کوئی جادو کسی کو باندھ لیتا سحر کاری سے
کوئی مبہوت کر دیتا مرقع گل عذاری
سے
سبھی اپنے جہاں میں کھو کے رہ جاتے
سبھی اک دوسرے سے بے تعلق ہو کے
رہ جاتے
بڑوں کو علم رہتا ہے کہ بچّے منہمک ہیں
ایسے منظر میں
کہ جن کے رنگ ان کے ذہن کو بدرنگ
کرتے ہیں
کہ جن کی روشنی کی تیز کرنیں
نوچ لیتی ہیں بدن سے بھولپن ان کا

مگر یہ جان کر بھی کچھ نہیں کرتے
کہ اندیشہ ہے ان کے وقت کے برباد
ہونے کا
کہ خطرہ ہے کوئی منظر نہ آنکھوں سے
نکل جائے
نہ کوئی خوف بچّوں کو کہ کوئی ان کو ٹوکے گا
کسی منظر، کسی پیکر
کسی سرکس، کسی کرتب
کسی جھکّڑ، کسی آندھی
سے روکے گا
میاں ہے منہمک ایسا کہ منکوحہ سے
غافل ہے
نہیں یہ فکر روشن کیا ہے بیگم کے پیالے
میں
شعاعیں کس طرح کی اس میں رقصاں
ہیں
کھلا ہے رنگ کیا کیا آ بگینے میں
نہیں یہ علم کہ کس طرح کی شمعیں
فروزاں ہیں
نہ ہی بیوی کو یہ خدشہ

کہ صاحب کی نگاہیں کون سے منظر پہ
ٹھہری ہیں
نظر میں منعکس ہے رنگ و بو کا کون سا
پیکر
تنی ہے کتنے رنگوں کی دھنک سرتاج
کے آگے
کسی دستک، کسی گھنٹی، کسی صوت وصدا
کا کچھ اثر دل پر نہیں ہوتا
کسی بھی فرد کے احساس پر دستک نہیں
ہوتی
کوئی مہمان آ کر لوٹ جاتا
بھکاری بڑبڑاتا ہے
پڑوسی منہ بناتا ہے
کبھی تو ڈاکیہ بھی ڈاک یوں ہی پھینک
جاتا ہے
نیا یہ جامِ جم جس درجہ اچھا ہے
کہیں اس سے یہ بدتر ہے
یہ رشتہ چھین لیتا ہے
یہ ناطہ نوچ لیتا ہے
زباں حِس کی
یہ گدّی سے پکڑ کر کھینچ لیتا ہے
یہ قدروں کی رگوں کو کاٹ دیتا ہے
لہو کے رنگ کو بدرنگ کر دیتا ہے منٹوں
میں
یہ ساغر آدمی کے ڈھنگ کو
بے ڈھنگ کر دیتا ہے منٹوں میں
یہ ظالم آدمی کو آدمی سے کاٹ دیتا ہے
یہ سالم ذہن کو بھی
پارچوں میں بانٹ دیتا ہے

☆☆☆

☆......سدرہ سحر عمران

ہم ایک جیسے خواہ نہیں بُن سکتے

ہماری رات تم سے طویل تر
تمہارے دن ہماری خواہشوں سے بڑے ہیں
ہم برگد کی ڈالیوں پر تتلیوں کی طرح
خوابوں کا تیرنا دیکھ سکتے تو
اپنی ہنسی میں دھوپ کے سکے
چھپا کر کیوں لاتے
ہماری مائیں ہمارے جھوٹ پر
اپنی سفید چنریوں کے دھاگے سیاہ کرتی رہیں
ہم نے دیواروں سے ایک دوسرے کے دل
نکال کر پھینک دیئے
دیکھو ہماری گھڑیوں میں
محبت کی سوئیاں نہیں گھومتی
وقت پیچھے کو چلنے کو لگتا ہے
مجھے ڈر ہے یہ کسی دوزخ میں نہ جا گرے
میں اپنی آنکھوں پر نائیلون کی کاشت
کر سکتی ہوں
تم ربڑ کے جوتے پہن کر
بے آواز آنا
میں نہیں چاہتی تمہارے اندر کا بُرا وقت
پھر سے جاگ جائے

☆☆☆

ہنسی کی جھوٹن

لوگ......
ہمارے دکھوں پر
کپاس کے پھول رکھتے رکھتے
قہقہے ڈال جاتے ہیں
ہم ان قہقہوں کو
اپنے جوتوں کی
نوکیلی دیوار کے نیچے رکھ کر
دبائیں تو
نفرت کی نیلی نہر
پھوٹ پڑے گی

☆☆☆

☆......سدرہ سحر عمران

بارشیں آگ پر سکھائی جائیں گی

انتظار کی بل کھاتی سیڑھیوں پر
تمہاری یادوں کی چاپ جل رہی ہے
آنکھیں دھواں ہونے سے پہلے پہلے
مجھے روشنی کے ہاتھ پر تسلیم کرو
میں کوئی دیوار گیر تصویر نہیں ہوں
کہ تمہارے لہجے کو
ساکت آنکھوں سے گھورتی رہوں
تتلیاں۔۔۔۔۔۔
میرے بھی خوابوں کا پانچواں حصہ ہیں
میں خوشبوؤں کی کتاب اور جگنو کے کھیل میں
دریا اٹھالائی
اب آنکھیں کون سے موسم میں خالی ہوں گی
آگ سے پوچھو

☆☆☆

پرفیوم

انتظار کی ٹوٹی ہوئی
چپلوں میں
ایک راستہ گندھا ہوا ہے
میں چراغوں کی طشتری میں
آنکھوں کی پتیاں رکھتی ہوں
تو سیاہ تالابوں سے
ہجر کی خوشبو آنے لگتی ہے
(کافور سے ملتی جلتی خوشبو)

☆☆☆

☆......اخلاق آہن

جنگ وتشدد

زمیں کے گیسو ہیں سرخ وقرمز
یہاں پہ بچوں کے زرد لجنند
تفنگ، توپوں کے سرسے یارو
خمارِ وحشت کی گرد جھاڑو
جو رقصِ خاطر کے پامیں بیڑی
اسے بھی کاٹو
تو ننھے چہروں
کہ گل چمن پر
بہار آئے
نکھار آئے

☆☆☆

کوچ

کسی رکابِ تعلق کی جستجو میں یہاں
پھرے ہیں بزمِ طرب، کوچۂ جنوں میں بھی
رہے ہیں صحبتِ شام وسحر کے مسکن میں
ہٹائے خاک نشینوں سے گردِ آوارہ
کٹائے گردنِ خودسر دیارِ راحت میں
دکھائی شوخ طبیعت کی سب گل افشانی
مگر یہ مردہ چمن مُردگی میں یکتا ہے
یہاں فضاؤں میں اک زہر گھلتا رہتا ہے
دِلوں سے نقشِ مُروّت مٹائے جاتے ہیں
کبھی جو ہوتے تھے مردہ پرستِ ہمزاداں
مگر وہ حسنِ محبت بھی سنگ سراب کے
کرو بھی کوچ کہ بیزارِ جاں ہوئے اب تو
مگر ہے ہَول بس اک وحشت وتجرُّد کا
عجیب دورِ تفقد ہے بے اَمانی کا

☆☆☆

☆......طارق علی رضاؔ

نہیں تم سے نہیں ہو پائے گا

نہیں تم سے نہیں ہو پائے گا
چارہ گری کا یہ فیصلہ
جب وقت سوال اٹھائے گا
تیرے واسطے میرے چارہ گر
کتنا محال ہو جائے گا
چارہ گری کا یہ فیصلہ

چاہے کتنی بار کوئی یہاں
یہ کرید لے تیری راکھ کو
کہ دل گداز کے واسطے
وہ نمی نہیں تیری خاک میں
جو ہرا کرے کسی شاخ کو

نہیں تم سے نہیں ہو پائے گا
چارہ گری کا یہ فیصلہ

میرے ہم نفس، میرے ہم نوا
تجھے موسموں کی خبر نہیں
کہ اتر پڑے کسی جسم میں
کسی دشت کی جو کوئی ندا
کوئی موسمِ گلِ ناروا

بے چین سی بھٹکی ہوئی
بے سمت سی کوئی صدا
جو دلوں کو لطف و قرار دے

اسی آرزو، اسی جستجو
اسی آگہی کی تلاش میں
کوئی عمر ساری گزار دے

پر موسموں کے یہ فلسفے
میرے چارہ گر، میرے نکتہ چیں
تیری سرشت سے ہیں پرے

چاہے کتنی بار کوئی یہاں
یہ کرید لے تیری راکھ کو
کہ دل گداز کے واسطے
وہ نمی نہیں تیری خاک میں
جو ہرا کرے کسی شاخ کو

نہیں تم سے نہیں ہو پائے گا
چارہ گری کا یہ فیصلہ

☆☆☆

☆......طارق علی رضاؔ

نقوشِ غبارِ راہ

غبارِ راہ تیرے نقش پا سجائے ہوئے
درونِ خانہ ءدل حسن و جاہ سمائے ہوئے
انگیخت جذبہ ءسفر کو کر رہا ہے پیہم
سفر بدونِ تمنا بجز یقین و وہم

غبارِ راہ تیرے نقش پا سجائے ہوئے
درونِ خانہ ءدل حسن و جاہ سمائے ہوئے
نقوش خانہ ءدل میں اتارتا ہے مجھے
ندائے شوق پہ پھر سے ابھارتا ہے مجھے
ندائے شوق جسے اذن صوت ہو بھی نہیں
خمار عشق نہیں شوق آرزو بھی نہیں
غبارِ راہ تیرے نقش پا سجائے ہوئے
درونِ خانہ ءدل حسن و جاہ سمائے ہوئے
قرینِ دشت وفا سے پکارتا ہے مجھے
نئی جہت کے لیے پھر سنوارتا ہے مجھے
نئی جہت جسے خوف ِ زیانِ جان نہیں
حرمت عشق مقدس کا کچھ دھیان نہیں

غبارِ راہ تیرے نقش پا سجائے ہوئے
درون خانہ دل حسن و جاہ سمائے ہوئے
سکوت شب میں میرے اب ہے مخل باردگر
قرار وعہد وفا پہ ہے مُصر باردگر

" قرار وعہد وفا تجھ سے دربدر کے لئے؟
نہیں ہے میری وفا تجھ آشفتہ سر کے لئے "
غبارِ راہ تیرے نقش پا سجائے ہوئے
درون خانہ ءدل حسن و جاہ سمائے ہوئے

☆☆☆

☆......طارق علی رضاؔ

خامشی

وہ خاموشی
ہے کہ جیسے
ہوا نے میرے آنگن میں
تنفس کے روابط کو
ابھی موقوف رکھا ہے
پھیلا رکھا
ہے اک پردہ
میری ہستی پہ ظلمت کا
سزا کا زاویہ مجھ پر
ابھی موجود رکھا ہے
کراہیں، چیخ، آنسو
اور سحر کی سسکیاں ساری
مقید ہیں سبھی میری
درون جان وحشت میں
حصار جان سے لے کر
پندار جان تک گویا
مہر بہ لب پڑے ہیں
سارے جذبے
خوف و دہشت میں
میرے پیغام کی ترسیل کا ہر تار ٹوٹا ہے
نہ عرض حال ممکن ہے
نہ اذن لب کشائی ہے
یہ کس تقدیر کی مولا
سزا یوں میں نے پائی ہے
یہ کیسی خامشی یارب میرے حصے میں آئی ہے

☆☆☆

☆......سلیم فگارؔ

وعدہ

یہی کہا تھا نا رات تم نے
تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں سے بھری گھٹائیں
کہیں سے آ کر ٹھہر گئی ہیں
یہ سن کے میرے تو دن کے پاؤں پھسل گئے ہیں
وہ گھر کہ ٹوٹا تو کرچیوں سے
لہو بہاتی حسین سوچیں
مشامِ جاں میں کراہتی ہیں
میں حوصلوں کی قبا میں اپنے
تمام گھاؤ چھپا کے جاناں
تمہارے خوابوں کی سیڑھیوں سے
یوں زینہ زینہ اتر رہا ہوں
اداس ہونٹوں پہ مسکراہٹ کے گل سجائے،
دیئے جلائے
چلو مٹاؤں یہ اپنی آنکھوں کی تیرگی کو
ملالِ جاں سے نکل کے آؤ
تمہاری خاطر
میں اپنی ساری وفائیں لے کر
تمہارے جیون میں آ گیا ہوں
یہ میرا وعدہ ہے آج تم سے
کہ وسوسوں کی سیاہ بارش کے خوف قطرے
تمہارا آنچل نہ اب کبھی بھی بھگو سکیں گے

☆☆☆

تذبذب

آدھا دن تو بیت گیا ہے
آنکھیں ملتے
اپنے صحن کے اندر چلتے
گھر سے باہر آتے آتے
دوپہر کا جلتا سورج
اپنی کرنوں کے ریوڑ کو
واپس خود میں ہانک رہا تھا
دروازے پر رک کر میں نے
دل ہی دل میں
سارے کاموں کو دہرایا
میری لسٹ تو آنے والے دن سے بڑی تھی
اور ازل سے طے ہے یہ بس
عمر کی اس گھڑی میں ہمیشہ
اک دن رکھا جاتا ہے
سوچ رہا ہوں
شامِ شفق کو میری جیت کا
ہار بنا کر اترے گی
یا پھر رات کا اندھا کنواں
مجھ کو سالم نگلے گا

☆☆☆

☆......سلیم فگارؔ

بے چہرہ

یہ کیسی بارشیں ہیں
جو مرے دل پر برستی ہیں
یہ کیسے موسموں کے خواب
آنکھوں میں اترتے ہیں
یہ کیسے ملگجے اندھے سویرے
گھر کی ان ٹوٹی منڈیروں پر بکھرتے ہیں
یہ کیسے ادھ موئے سے پھول ہیں
جو سوچ کی شاخوں پہ کھلتے ہیں
کہ جن سے روح کے دالان میں
ہر سو تعفن پھیل جاتا ہے
یہ کیسی رہ گزر ہے
جو میرے پاؤں سے لپٹی ہے
جدا ہوتی نہیں اک پل
یہ کیا حیرت کدہ ہے ذات کا
جو ہر نئے دن ایک الجھن بھیج دیتا ہے
کوئی نادیدہ ہاتھوں سے
گرہ سی اک لگاتا ہے
گرہ میں کھولنا چاہوں
تو میری انگلیوں کے ناخنوں سے خون رِستا ہے
میں جب بھی دیکھتا ہوں آئینہ
تو اک ہیولا سا ابھرتا ہے
ہزاروں عکس بنتے ہیں
مگر چہرہ نہیں بنتا

عمرِ رواں

پچھتاوے کی دھول جھٹک کر
جب غفلت کی اونگھ سے نکلا
تو یاد آیا
پچھلے لمحے دروازے سے دن باندھا تھا
لیکن اب تو
پیر کی جانب دھندلی دھندلی تاریکی ہے
اور سرہانے پر چاند دھرا ہے
میں یہ منظر
خاموشی سے دیکھ رہا ہوں
کیسے اک اک کر کے ساری
برفیلی روپہلی کرنیں قطرہ قطرہ
پگھل رہی ہیں
سر سے تن پر اتر رہی ہیں
دن کے ٹکڑے تارا تارا
رات کی چادر پر بکھرے ہیں

☆☆☆

افسانے:

✍……نور شاہ

میرے لہو کی کہانی

بے ترتیب لفظوں کی دیوار جانے کب سے میرے سامنے کھڑی ہے لیکن اب آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے انداز ہیں۔ان لفظوں کی بے ترتیبی میں ترتیب سی آنے لگی ہے اور میں ان لفظوں میں پوشیدہ بے شمار چہرے دیکھ رہا ہوں۔ بہت سارے چہرے ایسے ہیں جنہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے اس لئے اُن کی پہچان میرے لئے ناممکن ہے۔ ایسے بھی بہت سارے چہرے ہیں جنہیں میں دیکھ چکا ہوں لیکن میرے ذہن کے گوشوں میں روپوش ہو چکے ہیں اور اب اُن کی پہچان ممکن نہیں دیوار پر لفظوں کے روپ میں کچھ ایسے بھی چہرے ہیں جو میرے قریب رہے ہیں یا میں ان کے قریب رہا ہوں۔ ان میں دادا دادی کے چہرے نظر آرہے ہیں۔اپنے پورے حُسن و جمال کی پاکیزگی کے ساتھ…………ایک چہرہ میری اماں کا ہے، خلوص اور محبت سے بھرا بھرا چہرہ، میرے والد کی تصویر میں بھی اُن کی سادگی، شرافت اور نفاست صاف صاف جھلک رہی ہے۔ میرا کوئی اور ہے ہی نہیں۔ نہ بھائی نہ ہی بہن۔ میں اُن کی محبتوں اور شفقتوں سے محروم رہا ہوں۔ میرا اگر کوئی اور اپنا ہوتا تو شاید لفظوں کی صورت میں اُن کے چہرے میرے سامنے رہتے اور پھر جنہیں میں نہیں جانتا یا جن کو میں نے نہیں دیکھا ہے اُن کے تعلق سے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔اُن کی کہانیوں کو قبرستان کی مٹی نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہے اور مٹی اُن کے چہروں کو لفظوں کا روپ نہیں دے سکتی۔اب تو اُن کی کہانیاں، زندگی

کی داستانیں ماضی کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔ ہاں قبرستان کی خاموشیوں میں صرف ایک آواز سنائی دیتی ہے اور وہ آواز میری ہے لیکن میں اس قبرستان کا مکین نہیں ہوں ۔میں تو اپنے مکان اپنے گھر میں رہتا ہوں۔ یہ بڑا بڑا سا کھلا کھلا سا مکان میرے دادا دادی کے وقت میں تعمیر ہوا تھا۔اُن کی وفات کے بعد میرے والدین کی ملکیت کا حصہ بنا۔میرے والدین بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔اس لئے اُن کے بعد یہ مکان، 'یہ گھر' مکان کے ساتھ دو ایکڑ اراضی اور بارہ مرلے پر پھیلا ہوا خاندانی قبرستان......

اب سب کچھ میرا ہے۔اس قبرستان میں اَن گنت قبریں اپنی داستانوں سمیت ماضی کا حصہ بن چکی ہیں ۔قبرستان کی اداس اداس فضاؤں میں تحلیل ہوچکی ہیں لیکن جن کو میں جانتا ہوں جو میرے قریب رہے ہیں،اُن کی کہی ان کہی تو میری سوچوں میں محفوظ ہیں۔میری یادوں کا حصہ ہیں۔اُن کے قدموں کی آہٹ اب بھی میرے گھر کے آنگن میں سنائی دیتی ہے لیکن اس کے باوجود میں اکیلا ہوں، بالکل تنہا ہوں۔ کبھی یہ تنہائی مجھے اچھی لگتی تھی، پیاری لگتی تھی لیکن اب میں اس تنہائی، اس اکیلے پن سے ڈرنے لگا ہوں ۔خوف محسوس ہوتا ہے،لرز سا جاتا ہوں۔گھر کے اتنے سارے کمرے .... خالی خالی سے، اتنی لمبی چوڑی زمین........... بنجر بنجر سی اور پھر قبرستان کی بے حس خاموشی ۔شادی اس سے کرنا نہیں چاہتا کہ ابھی تک کوئی من پسند خوابوں اور خیالوں سے بھی سنوری لڑکی نہیں ملی اور پھر.... میرا کیریئر میرا مستقبل میرے لئے اہمیت کے حامل ہیں!

ایک عجیب اتفاق ہوا۔ایک شام میں نشاط باغ جانے والی شاہراہ پر چہل قدمی کررہا تھا کہ اچانک ایک کار تیز رفتاری کے عالم میں چنار کے درخت سے ٹکرا گئی۔ میں کار کی جانب دوڑا اور راہ گیروں کی مدد سے ایک بزرگ خاتون اور ایک لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوا۔اُن کو ہاسپٹل لے گیا۔اُن کی دیکھ بھال کی۔اُن کو اُن کے ہوٹل چھوڑ آیا اور

قریب قریب ہر صبح و شام اُن سے ملنا میرا معمول بن گیا۔ وہ تھے تو ہندوستانی اور اُن کا بنیادی تعلق اجمیر شریف سے تھا لیکن اب بہت برسوں سے کینڈا میں مقیم تھے۔ سیر و تفریح کے لئے کشمیر آئے تھے۔ یہ حادثہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لایا اور میں اپنی تنہائیاں بانٹنے میں کامیاب ہوا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا اور اس طرح عالیہ کے روپ میں ایک رسیلا بدن مہکتا ہوا سراپا میری زندگی میں آیا۔

اور میں نے عالیہ کے ساتھ کینیڈا جانے کا فیصلہ کرلیا جہاں وہ اپنے والد کا بزنس بڑی خوبی کے ساتھ سنبھال رہی تھی۔ لیکن جب میرے کینیڈا جانے کی بات میرے گھر کے دروازے سے باہر آئی تو میری جائداد خریدنے والوں کی ایک لمبی قطار میرے گھر کے سامنے نظر آنے لگی۔ من ہی من میں یہ سوچ کر کہ میری زمین و جائداد کو کون سنبھالے گا۔ میرے خاندانی قبرستان کی رکھوالی اور دیکھ بھال کون کرے گا۔ اس پس منظر میں اپنی جائداد فروخت کرنے کا من بنالیا....

قبرستان کے گیٹ پر ایک بڑا سا مضبوط تالا چڑھا کر میں نے اپنا مکان فروخت کر ڈالا۔ قبرستان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری نئے مالک مکان نے لے لی، میں نے اُن کے ساتھ قبرستان کو بہتر حالت میں رکھنے کے تعلق سے وضاحت کے ساتھ بات کی اور اُن کی باتوں سے مطمئن ہو کر گیٹ کی چابی اُن کے حوالے کردی۔ میں اس لئے بھی اُن کی باتوں سے مطمئن ہوا کیونکہ ان کی باتیں مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ گفتگو میں نیک جذبہ اور احترام بھی نظر آرہا تھا۔

کینیڈا جا کر میں بزنس میں بے حد مصروف ہو گیا۔ عالیہ کی ذمہ داریاں میرے کندھے پر آگئیں۔ میں نے اس بزنس کو اپنے طریقہ کار سے وسعت دی اور روپیہ پیسہ کمانا میرے زندگی کا ایک اہم مقصد بنتا گیا۔

اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔ رات کافی بھیگ چکی تھی اور میں اچانک

گھبرائے ہوئے انداز میں نیند سے جاگ پڑا۔عالیہ میرے قریب ہی سو رہی تھی۔نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔اچانک میری نظریں ہمارے خواب گاہ کی سامنے والی دیوار سے ٹکرا گئیں۔مجھے لگا جیسے دیوار پر میرے لئے بے شمار بے ترتیب الفاظ بکھرے ہوئے ہیں۔پھر ان بے ترتیب الفاظ نے ترتیب پاتے پاتے انسانی چہروں کی بجائے قبرستان کی قبروں کی صورت اختیار کی اور مجھے لگا جیسے ان قبروں کی تہہ سے بہت ساری آوازیں ایک ساتھ بلند ہو رہی ہیں..........ڈر اور خوف کی آوازیں ایک ساتھ بلند ہو رہی تھیں۔انسانی قدموں سے ابھرنے والی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھی میں واقعی ڈر سا گیا،لرز سا گیا اور پھر ساری کہانی عالیہ کو سنا دی۔

''عالیہ مجھے لگ رہا ہے کہ میرا قبرستان مجھے بلا رہا ہے۔مجھے جانا چاہیئے۔عالیہ نے ڈرتے ڈرتے اجازت دی۔

چار برس بعد میں اپنے وطن کو اپنے قدموں کی آواز سے اپنی آمد کی اطلاع دے رہا تھا۔خوش ہو رہا تھا اور اُداس بھی۔جب خوشی اور اداسی ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں تو ان دیکھی ان جانی تڑپ کا احساس جاگنے لگتا ہے۔یہ احساس لے کر جب میں اپنی بستی سے گزرنے لگا تو حیرانی ہوئی اور پریشانی بھی کہ میرے جانے پہچانے لوگ مجھے نظر انداز کر رہے ہیں،خاموشی سے میرے سامنے سے گزر رہے ہیں۔قبرستان کی جانب اپنے تھکے تھکے اور رُکے رُکے قدم بڑھاتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی شناخت اپنی پہچان اور اپنی خاندانی وراثت سے محروم ہو چکا ہوں۔

میرے لہو کی کہانی بے ترتیب ہو کر ہمیشہ کے لئے قبرستان کی تہہ میں اُتر چکی ہے۔وہاں قبرستان تھا اور نہ ہی قبریں.....

اُن کی جگہ آٹھ منزلہ شاپنگ مال میرے سامنے کھڑا تھا۔!!!!

☆☆☆

سلام بن رزاق......

زندگی افسانہ نہیں

جمیلہ نے اپنے فیصلے پر بہت غور کیا کہ کہیں اس سے کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہونے جارہی ہے۔ ایسی غلطی جس کی پھر کبھی تلافی نہ ہو سکے۔ مگر اسے محسوس ہوا کہ اس کے سامنے اب سوائے اس ایک راستے کے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اگر وہ آج ذرا بھی کمزور پڑی تو پھر عمر بھر یوں ہی گھٹتی اور کڑھتی رہ جائیگی۔ وہ گھٹن جو برسوں سے اس کے گرد کہرے کی طرح دبیز سے دبیز تر ہوتی جارہی تھی اس سے نجات پانے کا اب صرف یہی ایک راستہ تھا۔ اگر چہ اس راستے میں خدشات تھے، بدنامی تھی، اپنوں کی ناراضگی تھی۔ برادری کی انگشت نمائی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں سے بچھڑنے کا غم تھا، لیکن اس کے باوجود وہ راستہ کس قدر دل فریب تھا جیسے گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں کوئی گھنا پیڑ نظر آ گیا ہو۔ ایک دل خوش کن تصور سے اس کا دل دھڑکنے لگا اور سارے جسم میں ایک عجیب مست کر دینے والی کپکپی سی دوڑ گئی۔ اس نے بے خود ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے سامنے اسلم آ کر کھڑا ہو گیا۔ مسکراتا ہوا، اپنے چمکتے سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا باہیں پھیلائے اسے اپنی طرف بلاتا ہوا۔ اف! کتنا دلکش تصور تھا۔ یہ سوچ کر اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی کہ چند گھنٹوں بعد یہ تصور حقیقت میں بدل جانے والا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے ایک مہیب سایا ان کے درمیان حائل ہو گیا۔ اس نے دیکھا۔ یہ کوئی اور نہیں اس کے والد، مولوی

جمال الدین تھے جو خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ان کے ہاتھ میں بڑے دانوں کی تسبیح تھی، وہ جلدی جلدی تسبیح پھیرتے ہوئے زیرِلب کچھ بد بدا بھی رہے تھے۔ان پر نظر پڑتے ہی اسلم کی پھیلی ہوئی بانہیں گر گئیں۔ بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا ہیولا فضا میں معدوم ہو گیا۔

اسے لگا مولوی جمال الدین اس سے کہہ رہے ہوں، ''یہ تم کیا کرنے جا رہی ہو؟ ایک دنیا تمہارے باپ سے ہدایت پاتی ہے اور تم، مولوی جمال الدین کی بیٹی ہو کر ان لوگوں کے راستے پر جا رہی ہو جو سراسر گمراہوں کا راستہ ہے اور جن پر عنقریب خدا کا غضب نازل ہونے والا ہے۔''

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ نائٹ بلب کی سسکتی کراہتی روشنی کمرے میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور اس کے دائیں بائیں اس کی تینوں بہنیں اختری، اکبری اور انوری ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے بے خبری کی نیند سو رہی تھیں۔اس کا چھوٹا بھائی رشید باہر وارانڈے میں سویا تھا۔ ماں گڑی مڑی بنی ایک طرف یوں پڑی تھی کہ کپڑوں کی ایک چھوٹی سی گٹھری معلوم ہو رہی تھی۔تکیہ ہوتے ہوئے بھی اس کا دایاں ہاتھ اس کے سرہانے رکھا تھا۔وہ اسی طرح سوتی تھی جیسے اسے کوئی لمبا سفر درپیش ہو۔سوتی کیا تھی بس ذرا سا ستا لیتی تھی کہ دو گھڑی بعد اٹھ کر پھر سفر پر روانہ ہونا ہے۔اس کی نوزائیدہ بہن ساجدہ ماں کے پہلو میں سوئی چسر چسر کر رہی تھی۔ پتا نہیں ماں کی سوکھی چھاتیوں میں دودھ تھا بھی یا وہ عادتاً انہیں چوسے جا رہی تھی۔ننھا شکیل خود اس کی بغل میں سویا تھا اور نیند میں کسی بات پر مند مند مسکرا رہا تھا۔ ماں کے بازو میں جو جگہ خالی تھی وہ اس کے باپ مولوی جمال الدین کی تھی۔مگر وہ وہاں نہیں تھے۔وہ تو تین دن پہلے اللہ کے راستے میں نکل چکے تھے۔

مولوی جمال الدین ایک خالص مذہبی شخص تھے۔ پانچ وقت کی نماز پڑھنا اور

بے نمازیوں کو نماز کی ترغیب دینا ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو سرتا پا دین کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی پیشانی پر سجدوں کا اتنا بڑا گٹا تھا کہ ان کے چہرے پر سب سے پہلے اسی پر نظر پڑتی تھی اور لوگ عقیدت سے مغلوب ہو جاتے تھے۔ وہ کوئی سند یافتہ مولوی نہیں تھے مگر ایک عرصے سے محلّے کے مدرسے میں بچوں کو قرآن پڑھاتے پڑھاتے لوگ انہیں مولوی صاحب کہنے لگے تھے۔

وہ پہلے ایک فیکٹری میں مشین آپریٹر تھے۔ معقول تنخواہ تھی، رہنے کے لیے چالی میں دو کھولیوں کا مکان تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک فیکٹری میں ہڑتال ہوگئی۔ ہڑتال نے اتنا طول پکڑا کہ آخر فیکٹری میں تالے پڑ گئے۔ تقریباً چار ساڑھے چار سو مزدور بیکار ہو گئے۔ ان میں جمال الدین بھی تھے۔ بیکاری کے ایّام میں جمال الدین نے نماز پڑھنا شروع کی۔ نماز پڑھتے پڑھتے ان میں ایک حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوئی۔ انہوں نے داڑھی بڑھالی۔ پینٹ شرٹ پہننا چھوڑ دیا اور کرتا پاجامہ پہننے اور ٹوپی اوڑھنے لگے۔ پانچوں وقت نماز پڑھنا اور جماعتوں کے ساتھ دعوت پر جانا ان کا معمول بن گیا۔ اسی دوران انہوں نے قرآن کی بیشتر آیتیں حفظ کر لیں۔ تبلیغی دوروں کے سبب ان کی دینی معلومات میں بھی خاصا اضافہ ہو گیا۔ انہیں دنوں محلّے کے مدرسے میں قرآن کا درس دینے والے بنگالی مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ محلّہ کمیٹی نے مولوی صاحب کی جگہ جمال الدین کو درس و تدریس کے لیے رکھ لیا۔ اس طرح شیخ جمال الدین مولوی جمال الدین بن گئے۔ کمیٹی کی جانب سے انہیں تین ہزار روپئے تنخواہ ملتی تھی۔ وہ اپنی پوری تنخواہ بیوی کی ہتھیلی پر لا کر رکھ دیتے اور پھر مہینہ بھر گھر کے اخراجات کی طرف سے بے نیاز ہو جاتے۔ اگر بیوی گھر کے نامساعد حالات کی طرف توجہ دلانا بھی چاہتی تو ان کے شانِ استغنا میں فرق نہ آتا۔ ایک طرف گھر کی مالی حالت دن بدن خستہ ہوتی جا رہی تھی اور دوسری طرف ہر دو تین سال

کے بعد گھر میں ایک نئے مہمان کی آمد آمد شروع ہو جاتی۔ جب چوتھا بچہ وارد و صادر ہوا تو بیوی نے دبی زبان سے آئندہ کے لیے محتاط رہنے کو کہا اور اشارتاً یہ بھی کہہ دیا کہ، ''جمیلہ بڑی ہو رہی ہے۔ اب ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیے۔''

مولوی صاحب کڑکے، ''یہ کیا خرافات بکتی ہو؟ کیا تم لوگوں کا اللہ پر سے یقین اٹھ گیا ہے؟ کسی کی فکر کرنے والے ہم کون؟ قرآن میں صاف لکّھا ہے، ''واللہ خیرالرازقین۔'' جو پیدا کرتا ہے وہ کھلاتا بھی ہے۔ ارے جو مور و ملخ تک کو رزق بہم پہنچاتا ہو کیا اسے ہماری تمہاری فکر نہیں ہوگی۔ یاد رکھو! بچے خدا کی رحمت ہوتے ہیں اور رحمت سے منہ موڑ نا کفرانِ نعمت ہے۔''

مولوی صاحب دم لینے کو رکے پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے قدرے دھیمی آواز میں بولے، ''اور سنو! شوہر بیوی کا مجازی خدا ہے۔ مجازی خدا کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔''

ان کی موٹی موٹی دلیلوں کے بوجھ تلے بیچاری بیوی کا کمزور سا احتجاج بیمار کی سسکی کی مانند دم توڑ گیا۔ اس طرح بیوی کے احتجاج اور احتراز کے باوجود پانچواں بچہ روتا بسورتا عالمِ ظہور میں آ گیا۔

یہی وہ دن تھے جب جمیلہ کپڑا لینے لگی تھی۔ وہ ان دنوں آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ پہلے کپڑے پر شلوار میں لگے لال لال خون کے دھبے دیکھ کر جمیلہ بہت گھبرائی تھی۔ وہ اسکول سے چھوٹ کر ہانپتی کانپتی گھر آئی اور بستہ ایک طرف پھینک کر ماں کی گود میں سر ڈالے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے یوں گریہ کرتے دیکھ کر ماں بھی گھبرا گئی تھی۔ ماں کے بار بار پوچھنے پر جب اس نے ہچکیوں کے درمیان بتایا کہ اس کے پیشاب کے راستے سے خون آ رہا ہے اور وہ اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تب ماں نے اسے چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا، ''ارے توبہ! تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ پگلی! اب تو بڑی ہو گئی ہے۔ چل اٹھ، منہ ہاتھ دھو، تھوڑا سا ٹھنڈا دودھ

پی لے، سب ٹھیک ہو جائیگا۔''

رات کو جب مولوی جمال الدین کھانا کھا رہے تھے تو جمیلہ کی ماں نے موقع دیکھ کر پنکھا جھلتے ہوئے دبی زبان میں کہا،

''سنیے! جمیلہ بڑی ہوگئی ہے، آج ہی اس نے کپڑا لیا ہے۔''

مولوی صاحب نے منہ چلاتے ہوئے انھیں گھور کر دیکھا۔ اور بولے، ''اتنی جلدی؟''

''جلدی کہاں۔۔۔؟ اگلے مہینے وہ تیرہ پورے کر کے چودہویں میں قدم رکھے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ اب اسے گھر میں بٹھالو۔ جتنا پڑھنا تھا پڑھ چکی۔''

انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔

جمیلہ کی ماں نے سوچا تھا وہ اس خبر سے خوش ہوں گے۔ مگر بجائے خوشی کا اظہار کرنے کے جب انہوں نے ایسا طالبانی حکم صادر کیا تو انہیں بھی طیش آ گیا اور انہوں نے اسی دوٹوک لہجے میں کہا،

''آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ اسے پڑھنے کا کتنا تو شوق ہے۔ ہر سال کلاس میں اوّل آتی ہے۔ سب اس کی تعریف کرتے ہیں اور ایک آپ ہیں کہ اس پر علم کے دروازے بند کر دینا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی یہ بات ہرگز نہیں مانوں گی۔ میں اسے پڑھاؤں گی جہاں تک وہ پڑھنا چاہتی ہے۔''

بیوی کے بگڑے تیور دیکھ کر مولوی جمال الدین قدرے سٹپٹائے۔ ان کی تنی ہوئی بھوئیں جھک گئیں۔ مگر اپنی مردانہ ہیکڑی کو برقرار رکھتے ہوئے بولے،

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ پہلے اس کے لیے برقعہ کا اہتمام کرو۔ یوں صبح شام اسے گلی محلے سے ننگے سر گزرتے دیکھ کر ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔''

ماں نے جمیلہ کے لیے ایک نیا برقعہ خریدا اور جمیلہ نے برقعہ اوڑھنا شروع کر دیا۔ ابتدا میں برقعہ پہن کر چلنے میں اسے بڑی دقت ہوتی تھی۔ کئی بار الجھ کر گرتے

گرتے بچی۔ دوایک بار ماں سے شکایت بھی کی مگر ماں نے صاف کہہ دیا۔

''نا بابا، اگر برقعہ نہیں اوڑھوگی تو تمہارے ابّو تمہاری پڑھائی بند کرا دیں گے۔''

مجبوراً اسے برقعہ کو برداشت کرنا پڑا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ برقعہ کی کچھ ایسی عادی ہوگئی کہ برقعہ اس کے لباس کا ایک جز بن گیا۔

جمیلہ نے میٹرک فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ اسکول کمیٹی نے اسے اسکالرشپ دے کر آگے پڑھانا چاہا مگر مولوی صاحب نے جمیلہ کو کالج بھیجنے سے صاف انکار کر دیا۔ کمیٹی کے کچھ ممبروں نے انہیں سمجھانا چاہا مگر بے سود۔

جمیلہ جب تک اسکول جاتی تھی اسے گھر کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ اتنا تو جانتی تھی کہ اس کی ماں گھر کا خرچ بڑی مشکل سے پورا کرتی ہے مگر اس کے لیے خود اسے کبھی فکرمند نہیں ہونا پڑا تھا کیونکہ ساری فکریں اس کی ماں جھیل لیتی تھی۔ اسے اپنی ماں کو دیکھ کر اونچی عمارتوں پر لگی برق موصل کی وہ فولادی چھڑی یاد آجاتی تھی جو کڑکتی بجلیوں کا سارا زور اپنے اندر جذب کر کے عمارت کو تباہ ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔ مگر جب اسکول سے فارغ ہوکر وہ گھر میں بیٹھ گئی تو اب وہ ساری چھوٹی چھوٹی پریشانیاں ایک ایک کر کے جونکوں کی طرح اس سے چمٹنے لگیں۔ گھر کی خستہ حالت اور ماں کی روز بروز ڈھلتی صحت دیکھ کر جمیلہ کو بیحد فکر لاحق ہوگئی۔ اس پر جب ماں چھٹی دفعہ امید سے ہوئی تو اس نے دل ہی دل میں اپنے باپ مولوی جمال الدین کو بہت کوسا۔

اسی دوران اس نے چپکے چپکے ایک پرائیویٹ ادارے سے نرسری کا ایک سال کا مراسلاتی کورس کرلیا۔ آگے چل کر اسی کورس کے سبب اسے بڑی راحت ملی۔ محلے میں ایک نیا اسکول کھل رہا تھا۔ پڑوس کی آسو خالہ کے شوہر کمیٹی کے ممبر تھے۔ ان کی سفارش پر وہاں پرائمری سیکشن میں جمیلہ کو ٹیچر کی نوکری مل گئی۔ جمیلہ نے جب اپنی پہلی تنخواہ ساڑھے چار ہزار روپئے لاکر اپنی ماں کی ہتھیلی پر رکھے تو ایک حیرت ناک خوشی سے

اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔اس نے جمیلہ کو گلے لگالیا اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔مولوی صاحب نے یہاں بھی نوکری کی مخالفت کی مگر جمیلہ کی ماں نے سمجھایا، ’’ساڑھے چار ہزار روپئے ہر ماہ گھر میں آیا کریں گے، کیا برا ہے؟ کچھ آپ کا ہی بوجھ ہلکا ہوگا اور پھر نوکری کرنے کے لیے اسے کہاں کالے کوسوں دور جانا ہے۔ یہیں محلے کے محلے میں دس قدم پر تو اسکول ہے۔‘‘

جمیلہ کو نوکری کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔مولوی صاحب نے تو اب گھر آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔گھر کی فکر انہیں پہلے بھی نہیں تھی مگر اب وہ زیادہ آزادی اور بے فکری کے ساتھ ’دعوت‘ کے کاموں میں جُٹ گئے۔سارا سارا دن مدرسہ اور مسجد میں گزار دیتے۔نمازیوں کو حدیثیں سناتے اور دین کی باتیں سمجھاتے۔صرف ہفتے عشرے میں کبھی کبھی رات کو گھر آتے۔وہ بھی وظیفہ زوجیت ادا کرنے کے لیے۔ ورنہ اب ان کی اکثر راتیں بھی مسجد ہی کی نذر ہونے لگی تھیں۔گھر کی ذمہ داری اب جمیلہ پر آپڑی تھی۔بیچاری ماں تو اتنی تھک گئی تھی کہ باتیں کرنے میں بھی ہانپنے لگتی تھی مگر اس حال میں بھی ڈیڑھ سال پہلے ساتواں بچہ پیدا ہو گیا تھا۔تب پڑوس کی آسو خالہ کے سمجھانے بجھانے اور ہمت دلانے پر جمیلہ کی ماں نے ساتویں زچگی کے دوران ہی آپریشن کرالیا تھا۔شروع میں تو ماں نے یہ بات مولوی صاحب سے چھپائی مگر آخر ایک دن انہیں معلوم ہو گیا۔بہت خفا ہوئے۔کئی روز تک گھر نہیں آئے۔بول چال بند کردی۔جمیلہ کی ماں نے بھی پرواہ نہیں کی۔اسی بہانے انہیں آئے دن کی نوچا کھوچی سے نجات مل گئی تھی، یہی کیا کم تھا۔مگر کب تک؟ ایک رات مولوی صاحب یہ کہتے ہوئے ان کے لحاف میں گھس گئے کہ ’’کیا تم نہیں جانتیں اپنے نفس کو مارنا رہبانیت ہے اور رہبانیت اسلام میں حرام ہے۔‘‘

جمیلہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی ماں میں اب کچھ بچا نہیں تھا۔ڈھیلے ڈھالے کپڑوں

کے نیچے بس مٹھی بھر ہڈیوں پر سوکھی روکھی چمڑی مڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور گال پچک گئے تھے۔ ماں پوری طرح نچڑ گئی تھی پھر بھی اس کا باپ اسے برابر نچوڑے جا رہا تھا۔ وہ سوچتی کیا وہ ماں کو آخری قطرے تک نچوڑ کر ہی دم لیں گے۔ کبھی کبھی اس کے جی میں آتا کہ بزرگی کا لحاظ کئے بغیر وہ باپ کو ایسی کھری کھری سنائے کہ ظاہر پرستی کا وہ لبادہ جو انہوں نے اوڑھ رکھا ہے تار تار ہو جائے۔ مگر وہ صرف خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ یہ سب سوچ سوچ کر جب اس کا دم گھٹنے لگتا تو وہ آنکھیں بند کر کے اسلم کے تصور میں کھو جاتی۔ اسلم کا تصور اس کے لیے ایک ایسا جادو کا ڈبہ تھا جس میں اس کے کئی رنگین خواب بند تھے۔ اسلم اسی کی اسکول میں اسکاؤٹ ٹیچر تھا۔ لمبا قد، سانولا رنگ، معمولی ناک نقشہ مگر ہونٹوں پر ہمیشہ ایک دل آویز مسکراہٹ۔ اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ پچھلے سال یومِ والدین کے جلسے میں جمیلہ نے ننھی ننھی بچیوں کا ایک کورس گیت تیار کیا تھا۔ 'لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔۔۔ زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری' جب چھوٹی چھوٹی بچیاں سفید فراک اور گلابی اسکارف باندھے، ہاتھوں میں جلتی موم بتیاں تھامے اندھیرے میں ڈوبے اسٹیج پر نظم کے اس شعر پر پہنچیں کہ 'دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے، ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے' تو اسٹیج یکلخت روشنی میں نہا گیا۔ یہ منظر ناظرین کو اتنا بھایا کہ دیر تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ ہیڈ مسٹریس نے جمیلہ کی منہ بھر کر تعریف کی اور اسٹاف نے بھی خوب سراہا۔ دوسرے دن وہ اپنے آف پریڈ میں ٹیچرس روم میں بیٹھی کوئی چارٹ تیار کر رہی تھی کہ اسلم اندر آیا۔ اس نے سب سے پہلے اسے کل کے کامیاب کورس گیت پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا،

''آپ کا کورس گیت تو جلسے کی جان تھا۔''

اس نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور گردن جھکا کر

اپنے کام میں منہمک ہوگئی۔ مگر اس کا دھیان اسلم کی طرف ہی تھا۔ وہ رومال سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ چند لمحوں تک کمرے میں سناٹا چھایا رہا پھر اسلم کی آواز کمرے میں ابھری، ''جمیلہ صاحبہ! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' جمیلہ نے چونک کر گردن اٹھائی۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ اسلم دیوار پر لگے کیلنڈر کی طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ اس نے جمیلہ کی طرف مڑے بغیر کہا،

'اگر میری ماں یا بہن ہوتی تو میں انہیں کے ذریعے یہ بات کہلواتا۔۔۔''

وہ لمحے بھر کو رکا پھر بولا۔۔۔''کیا آپ میری شریکِ زندگی بننا پسند کریں گی؟'' اسلم کی مسکراتی آنکھوں میں ایک غم آلود متانت تیر رہی تھی۔ اس وقت جمیلہ کو اسلم پر بہت پیار آیا تھا۔ اس کا جی چاہا۔ وہ اٹھے، کچھ بولے نہیں بس اس کے گال پر چٹ سے ایک بوسا ثبت کر دے۔ مگر وہ ایسا کچھ نہیں کر سکی۔ نظریں جھکائے دھڑکتے دل کے ساتھ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ قدرے توقف کے بعد اسلم نے پھر کہا، ''میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔''

جمیلہ نے آہستہ آہستہ اپنی جھکی ہوئی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اسلم سراپا التماس بنا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جمیلہ صرف اتنا کہہ سکی۔

''آپ ہمارے گھر آئیے نا۔۔۔'' اور فوراً پلکیں جھکا لیں۔

''سنا ہے آپ کے والد صاحب بہت سخت ہیں۔''

''میری ماں بہت اچھی ہیں۔'' جمیلہ نے بے ساختہ کہا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ جمیلہ کی اس ادا نے اسلم کے رگ و پے میں بجلی سے دوڑا دی۔ اس کا رواں رواں کھل اٹھا۔ اس نے جھک کر صرف اتنا کہا، ''شکریہ۔'' اور کسی شرابی کی طرح مستی سے جھومتا ہوا اسٹاف روم سے باہر نکل گیا۔ اس طرح چند لمحوں میں محبت کی وہ ساری منزلیں طے ہوگئیں جو بعض اوقات برسوں کی مسافت میں بھی سر نہیں

ہوتیں۔پچھلی عید پر اسلم ان کے گھر عید ملنے کے بہانے آیا۔جمیلہ نے ماں سے اشارتاً اسلم کے بارے میں بتادیا تھا۔اسلم کو دیکھ کر ماں تو نہال ہوگئی مگر مولوی جمال الدین ٹال گئے۔شاہد اب ہر ماہ ساڑھے چار ہزار روپئے کی رقم سے دست بردار ہو جانا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔

چند روز بعد جب اسلم نے جمیلہ سے اس کے والد کا عندیہ معلوم کرنا چاہا تو جمیلہ نے سر جھکا لیا۔اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اسلم اب جمیلہ کی خاموشی کی زبان بھی سمجھنے لگا تھا اور یہ تو اس کے آنسو تھے جو اس کا کلیجہ چیر کر نکلے تھے۔اس نے آہستہ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔انگلی سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا پیار سے بولا۔

''جمی! تم ایک بہادر لڑکی ہو، آنسو بہا کر کمزور مت بنو۔کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئیگی۔میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔۔۔''

اسلم نے 'میں ہوں نا تمہارے ساتھ' والا فقرہ آنکھیں جھپکا کر ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ کچھ اس اعتماد سے کہا کہ اس کے دل کا سارا غبار کائی کی طرح چھٹ گیا اور وہ روتے روتے مسکرا کر بے اختیار اس کے گلے لگ گئی۔

''آہ! کتنا سکون تھا اس کی بانہوں میں'۔جب اس نے اس کی چوڑی چھاتی پر اپنا سر ٹکایا تو اسے لگا یہ دنیا ایک معمولی گیند ہے جسے وہ جب چاہے ٹھوکر سے اڑا سکتی ہے۔''اسلم اس کے کان میں پھسپھسا رہا تھا۔

''تم فکر مت کرو۔پونے میں میرے رشتے کے ایک چچا رہتے ہیں۔ایک آدھ مہینے اور انتظار کر کے دیکھتے ہیں۔اگر تمہارے ابا کے دماغ کی برف نہیں پگھلی تو اگلے مہینے میں خود اپنے چچا کو لے کر تمہارے گھر آدھمکوں گا تمہارا ہاتھ مانگنے۔۔۔''

''اگر وہ تب بھی نہ مانے تو۔۔۔؟''

''تو کیا۔۔۔ پھر میں بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو پرتھوی راج چوہان نے جئے چند کے ساتھ کیا تھا۔''

اسلم نے آخری جملہ بالکل کسی فلمی اسٹائل میں ادا کیا اور جمیلہ روتے روتے اچانک ہنس پڑی۔

''تم ورمالا لیے دروازے پر میرا انتظار کروگی نا۔۔۔؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے یوراج!'' جمیلہ نے شرما کر اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔

ابھی اس بات کو ہفتہ بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک دن مولوی صاحب نے اطلاع دی وہ چار مہینے کے لیے تبلیغی دورے پر جارہے ہیں۔ تین چلے پورے کرکے لوٹیں گے۔

ماں نے احتجاج کیا، ''چار مہینے تک ان کا اور بچوں کا کیا ہوگا؟''

مولوی صاحب نے دلیل دی، ''تم دنیا کے لیے اتنی فکرمند ہو، عاقبت کی فکر نہیں کرتیں جہاں اس دنیا کے اعمال کا حساب کتاب ہونا ہے۔ دین کے کام میں تھوڑی بہت قربانی تو دینی پڑتی ہے۔ مدرسے والے ہر مہینہ کچھ روپئے لاکر دیں گے۔ پھر جمیلہ بٹیا بھی تو ہے۔ جو دین کی فکر کرتے ہیں خود اللہ ان کی فکر کرتا ہے۔''

جب جمیلہ نے اسلم کو یہ خبر دی تو وہ بھی سناٹے میں آ گیا۔ اسے پہلے تو مولوی صاحب پر شدید غصہ آیا مگر جمیلہ کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے غصے کو پی گیا اور ایک پھیکی ہنسی ہنستا ہوا بولا۔

''اب تو پرتھوی راج چوہان کا کردار ادا کرنا ہی پڑیگا۔''

جمیلہ متردد لہجے میں بولی، ''اسلم آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ میں رات بھر سو نہیں سکی ہوں۔''

اسلم نے جمیلہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اور نہایت پیار سے بولا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں جمی! ہمارے پاس اب بس ایک ہی راستہ رہ گیا

ہے۔ پرتھوی راج چوہان والا۔''

''پتا نہیں آپ پر یہ پرتھوی راج چوہان کا بھوت کیوں سوار ہو گیا ہے۔''

جمیلہ منہ بنا کر بولی،

''دیکھو جمی! مجھے لگتا ہے تمہارے والدین کے راستے پر اتنا آگے نکل گئے ہیں کہ گھر کا راستہ ہی بھول گئے ہیں۔ اس لیے اپنا راستہ اب ہمیں خود تلاش کرنا ہوگا۔''

جمیلہ کچھ نہیں بولی۔ اس کا چہرہ سراپا سوال بنا ہوا تھا۔

'میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ سن کر گھبرا تو نہیں جاؤ گی؟'' اسلم نے پوچھا۔

''آپ ہیں نا میرے ساتھ۔۔۔''

''تمہیں مجھ پر بھروسا ہے نا۔۔۔؟''

''اپنے سے زیادہ۔۔۔''

تو پھر سنو! ہم کل ہی صبح ایشیاڈ بس سے پونے چلتے ہیں۔ میں چچا کو اطلاع دے دوں گا۔ وہ سب انتظام کر دیں گے۔ وہاں پہنچ کر ہم نکاح کر لیں گے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' جمیلہ کے منہ سے حیرت اور خوف سے ہلکی سے چیخ نکل گئی۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔''

''امّی یہ برداشت نہیں کر سکیں گی۔'' جمیلہ نے لرزتی آواز میں کہا،

''پہلے پوری بات تو سنو! نکاح کے بعد ہم شام تک لوٹ آئیں گے۔ فی الحال امّی کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ دھیرے دھیرے انہیں اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دینا۔ ویسے بھی وہ ہماری شادی کے خلاف تو ہیں نہیں۔''

''نہیں اسلم!'' یہ سب مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔''

''دیکھو جمی! یہ سب پیش بندی کے طور پر ہے۔ تم جانتی ہو تمہارے والد ہمیں

شادی کی اجازت نہیں دیں گے مگر جب انہیں معلوم ہوگا کہ ہمارا نکاح ہو چکا ہے تو اس نکاح کو تسلیم کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ تم قانوناً بالغ ہو۔'' اسلم بولتے بولتے پل بھر کو رکا، جمیلہ کو غور سے دیکھا۔ پھر گویا ہوا، ''جمی! میں تمہارے تذبذب کو سمجھ سکتا ہوں۔ تم اپنی امّی اور بھائی بہنوں کے لیے فکر مند ہونا؟ ہونا بھی چاہیے، مگر ایک بات یاد رکھو، آج جو ذمہ داری تمہاری ہے، شادی کے بعد وہ ذمہ داری ہم دونوں کی ہوگی۔''

''اسلم۔۔۔!'' کچھ کہنے کے لیے جمیلہ کے ہونٹ وا ہوئے، مگر حیرت اور خوشی سے اس کی آواز رندھ گئی۔ اس نے اسلم کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو چھلک رہے تھے۔ اسلم نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور آہستہ سے اس کی پیشانی چوم لی۔

صبح سات بجے ایشاڈ بس اڈے پر ملنا طے پایا۔ اس نے ماں سے کہہ دیا کہ وہ چند سہیلیوں کے ساتھ پکنک پر جا رہی ہے۔ شام تک لوٹ آئیگی۔ ماں نے خوشی خوشی اجازت دے دی۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگ بھی جاتی تو کوئی ڈراونا خواب اسے جھنجھوڑ کر جگا دیتا۔ کبھی اسے لگتا وہ ایک اندھی سرنگ میں چل رہی ہے، چل رہی ہے اور سرنگ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ یا اللہ! اس سرنگ سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے بھی یا نہیں؟ تبھی اسے اپنے سے آگے کوئی شخص مشعل لیے ہوئے چلتا نظر آتا۔ وہ اندھیرے میں بھی اسے پہچان لیتی۔ وہ اسلم کے سوا کون ہوسکتا ہے۔ وہ اسے آواز دیتی ہے۔ 'اسلم۔۔۔ اسلم۔۔۔' اسلم اس کی طرف مڑتا ہے۔ مگر یہ کیا؟ ہیبت سے اس کے پاؤں زمین میں گڑ جاتے ہیں کیونکہ وہ اسلم نہیں اس کے باپ مولوی جمال الدین تھے جن کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

کبھی وہ سوچتی۔ یہ شادی اگر شادی کی طرح ہو رہی ہوتی تو کیسا ہنگامہ رہتا۔ گھر

مہمانوں سے بھر جاتا۔ ہلدی، ابٹن اور مہندی کی رسمیں ادا ہوتیں۔ ڈھولک کی تھاپ پر گیت گائے جاتے، رتجگے ہوتے، عطر اور پھولوں کی خوشبو سے فضا مہک رہی ہوتی، بہنیں چہک رہی ہوتیں اور ماں واری واری جاتی۔ اور ابّو ـ ـ ـ باپ کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر کانپ کر رہ گئی۔ وہ دہاڑ رہے تھے۔

''بند کرو یہ خرافات ـ ـ ـ''

وہ رات بھر اسی طرح خواب اور بیداری کے درمیان ڈوبتی ابھرتی رہی۔

''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' اچانک اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔

یقیناً یہ فجر کی اذان تھی۔ جلدی جلدی منہ دھویا۔ وضو کیا اور مصلّی بچھا کر نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ اس کی بہنیں، بھائی اور ماں اسی طرح بے خبر سو رہے تھے۔

اس نے نماز ختم کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ معمول کے مطابق وہ زیرِ لب دعا مانگنے لگی، ''ربِّ اغفر وارحم وانت خیر الراحمین'' اے میرے پروردگار! ہمارے قصور معاف کر اور ہمارے حال پر رحم فرما اور تو سب رحم کرنے والوں سے بہتر ہے۔''

دعا مانگتے مانگتے اچانک اس پر کپکپی سی طاری ہوگئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ سینے میں ایک تیز بگولا سا اٹھا۔ حلق میں ایک زخمی پرندہ پھڑ پھڑایا۔ قریب تھا کہ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگتی، اس نے اپنے دوپٹے کا پلو پوری قوت سے اپنے منہ میں ٹھونس لیا۔ دو تین ہچکیاں پلو میں جذب ہو گئیں۔ فرطِ جذبات سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھی، مٹکے سے پانی لیا اور غٹ غٹ پورا گلاس حلق سے اتار گئی۔ دھیرے دھیرے سانسیں معمول پر آ گئیں۔ اتنے میں اس کی ماں کی آواز آئی، ''جمیلہ، چائے بنا دوں؟ ایک کپ چائے پیتی جا ـ ـ ـ''

اس نے جلدی سے کہا، ''نہیں ماں! میں کینٹین میں پی لوں گی۔ دیر ہو رہی ہے،

تم آرام کرو۔‘‘

’’سنبھال کر جانا بیٹا۔۔۔‘‘

’’تم فکر مت کرو ماں۔۔۔اللہ حافظ۔۔۔‘‘

جمیلہ نے برقع اوڑھا اور اپنا شولڈر بیگ لے کر باہر نکل گئی۔ چند قدم پر ہی اسے آٹو مل گیا۔ اس نے آٹو میں بیٹھتے ہوئے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ پونے سات ہو رہے تھے۔ سوا سات بجے کی بس تھی۔ وہ پندرہ بیس منٹ میں بس اڈّے پر پہنچ جائیگی، وہ عام طور پر محلے سے باہر نکلنے کے بعد اپنا نقاب اٹھا دیا کرتی تھی مگر اب کی احتیاطاً اس نے نقاب نہیں اٹھایا۔ آٹو جوں ہی ڈپو میں داخل ہوا اس کی نظر اسلم پر پڑ گئی۔ وہ کاندھے سے ایک جھولا لٹکائے، ہاتھ میں اخبار لیے اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آٹو والے کو پیسے دیے اور آٹو سے اتر گئی۔ اس نے اپنا نقاب الٹ دیا۔ اسلم لپک کر اس کے پاس آیا، ’’جمی! تم نے آج کا اخبار دیکھا؟‘‘

وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔

’’نہیں۔۔۔کیوں؟‘‘

’’آؤ میرے ساتھ۔۔۔‘‘ وہ کینٹین کی طرف بڑھ گیا۔ جمیلہ نے دوبارہ چہرے پر نقاب ڈال لیا اور اس کے پیچھے چلنے لگی۔ اسلم کو پریشان دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہو گئی۔ اس کے دل میں سینکڑوں وسوسے کلبلانے لگے۔ کینٹین میں پہنچ کر انہوں نے کونے کی ایک میز منتخب کی۔ اور جب آمنے سامنے بیٹھ گئے تب اسلم نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا،

’’جمی! ہمیں اپنا پروگرام ملتوی کرنا پڑیگا۔‘‘

’’کیوں۔۔۔؟‘‘ جمیلہ کا وسوسہ خوف کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔

’’سرحد پر، مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔‘‘

''یا اللہ۔۔۔''جمیلہ پر جیسے بجلی گر پڑی۔

''ہمّت سے کام لو۔''اسلم نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ سے کس نے کہا؟''برقع میں جمیلہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

''اخبار میں چھپا ہے، وہ جماعت کے ساتھ سرحد کے پاس سے گزر رہے تھے کہ سکیوریٹی والوں نے سرحد پار کرنے کے شبہ میں انہیں گرفتار کرلیا۔ باز پرس کے لیے انہیں قریب کی چوکی میں لے گئے ہیں۔''

جمیلہ رونے لگی۔

''جمی! سنبھالو اپنے آپ کو، وہ اکیلے نہیں ہیں پوری جماعت ان کے ساتھ ہے۔شُبہ میں گرفتار کیا ہے۔۔۔کل پرسوں تک خبر آجائے گی کہ چھوڑ دیے گئے۔''

جمیلہ کچھ نہیں بولی۔مگر برقع کے اندر اس کا بدن لرز رہا تھا۔رہ رہ کر ایک آدھ سسکی بھی نکل جاتی تھی۔

''جمیلہ! اس طرح ہمت ہاروگی تو گھر والوں کا کیا ہوگا۔چلو میں تمہیں آٹو میں بٹھا دیتا ہوں۔تم گھر پہنچو۔ایک آدھ گھنٹے کے بعد میں بھی پہنچتا ہوں۔ میں اسکول کمیٹی کے چیئرمن انصاری صاحب سے بھی بات کروں گا۔کچھ نہ کچھ راستہ نکل آئیگا۔ یہ اکیلے مولوی صاحب کا نہیں پوری جماعت کا مسئلہ ہے۔لو، تھوڑی چائے پی لو۔پھر چلتے ہیں۔''

قارئینِ کرام! یہاں تک پہنچنے کے بعد افسانہ نگار، افسانے کو ایک پُر امید نوٹ پر ختم کرنا چاہتا تھا کہ جمیلہ گھر آگئی۔اسلم نے اس سے وعدہ کیا کہ حالات معمول پر آتے ہی دونوں شادی کرلیں گے۔جمیلہ کو اسلم پر پورا یقین ہے کہ وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کریگا۔

مگر قارئینِ کرام! زندگی افسانہ نہیں ہے۔افسانہ نگار کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ

افسانے کو جہاں چاہے ختم کردے یا جس طرف چاہے موڑ دے، مگر زندگی کے تیز و تند دھارے پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ افسانہ نگار کا بھی نہیں۔ بعض اوقات زندگی کا بہاؤ اس قدر تیز ہوتا ہے کہ اس کا قلم بھی ایک حقیر تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔

ڈیڑھ مہینے تک حراست میں رکھنے کے بعد پولس نے مولوی جمال الدین کو رہا کر دیا کیونکہ پولس ان کے خلاف کوئی ثبوت مہیا نہیں کرسکی۔ رہائی کے بعد وہ ایک لٹے پٹے مسافر کی طرح پریشان حال، شکستہ خاطر گھر لوٹ آئے مگر گرفتاری کی ذلّت اور رسوائی نے انہیں توڑ کر رکھ دیا۔ آتے ہی ایسے بیمار ہوئے کہ پندرہ دن میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ صدمے سے جمیلہ کی ماں کو فالج ہو گیا اور وہ بستر سے لگ گئی۔ چھوٹا بھائی رشید ایس ایس سی میں فیل ہو گیا۔ پھر پتا نہیں کیسے وہ جیب کتروں کی ایک ٹولی کے ہتھے چڑھ گیا اور ٹرینوں اور بسوں میں لوگوں کے پاکٹ مارنے لگا۔ ایک دن پکڑا گیا اور چلڈرنس ہوم بھیج دیا گیا۔ اسلم جمیلہ کا کب تک انتظار کرتا؟ اس نے پونے میں اپنے چچا کی لڑکی سے شادی کر لی اور وہیں کسی اسکول میں ملازم ہو گیا۔ جمیلہ کی ایک بہن اختری جو کالج میں پڑھ رہی تھی، ایک دن کالج گئی اور پھر واپس ہی نہیں آئی۔ پتا چلا کہ وہ گلی کے ایک آوارہ چھوکرے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ باقی دونوں بہنیں بھی اپنی اپنی جماعتوں میں فیل ہو کر گھر بیٹھ گئیں۔

تین سال ہو گئے، فالج زدہ ماں چارپائی پر پڑی موت کا انتظار کر رہی ہے مگر موت ہے کہ دہلیز پر کھڑی اسے گھورتی رہتی ہے مگر اندر نہیں آتی۔ پہلے ماں جمیلہ کو دیکھ دیکھ کر روتی رہتی تھی مگر اب اس کی آنکھیں خشک جھیلوں کی مانند ویران ہو گئی ہیں۔ بس خالی خالی نظروں سے جمیلہ کو آتے جاتے ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی ہے۔ جمیلہ کے بالوں میں چاندی کے تاروں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ سال بھر پہلے صبح بال بناتے بناتے جب بالوں

میں اسے پہلا چاندی کا تار نظر آیا تھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ اس رات بہت روئی تھی۔ دوسرے دن اس نے بڑی احتیاط سے چاندی کے تار کو نوچ ڈالا۔ مگر اب تو اس کے بالوں میں کئی تار نکل آئے ہیں۔ اس نے انہیں نوچنا چھوڑ دیا ہے۔ پہلے جب اسے اسلم کی یاد آتی تھی تو راتوں کو تکیے میں منہ کھبو کر چپکے چپکے روتی تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے دل میں اسلم کی تصویر کے نقوش دھندلے پڑنے لگے۔ اور اب تو ماضی کا ہر نقش اس کے دل سے مٹ چکا ہے۔ کیا آپ جمیلہ سے واقف ہیں؟ آپ کے گھر سے دو تین گھر چھوڑ کر ہی تو رہتی ہے وہ۔ آپ نے اسے ضرور دیکھا ہوگا مگر پہچان نہیں پائے ہوں گے کیونکہ وہ آج بھی برقع اوڑھتی ہے اور اس کے چہرے پر نقاب پڑا رہتا ہے۔

☆☆☆

سلیم سرفراز

حریف

لاش انتم سنسکار کے لیے بالکل تیار ہوگئی۔ میں ذہنی اور جسمانی طور پر بری طرح تھکان محسوس کرتا ہوا برآمدے میں رکھی ہوئی ایک کرسی پر ڈھے سا گیا۔کبھی کبھی بڑا سے بڑا حادثہ یکلخت اتنی خاموشی اور آسانی سے ہوجاتا ہے کہ انسانی سوچ ہی مفلوج ہوجاتی ہے دیر تک پیش آنے والی حقیقت پر اعتبار ہی نہیں آتا اور جب آتا ہے تو سراپا وجود ہی احتجاج بن کر رہ جاتا ہے۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے وہاں موجود افراد کے چہروں کا جائزہ لیا جن سے حسب توقع گہری افسردگی اور پژمردگی ٹپک رہی تھی مجھے یقین تھا کہ ان کے بشرے سے ظاہر ہونے والا غم وہ مصنوعی لبادہ نہیں جو بالعموم کسی بھی میت پر بے دلی سے اوڑھ لیا جاتا ہے آدمی جتنا بھی شقی القلب کیوں نہ ہو، وہ کسی عزیز، بہت ہی عزیز ہستی کی موت پر دل گرفتہ ہو ہی جاتا ہے۔ اس جواں سال شخص کی موت جس نے اپنے حسن اخلاق اور نیک سیرت سے ایک خلقت کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا، یوں ہی سرسری طور پر لی جانے والی بات نہ تھی۔

دنیا تو ہمیشہ سے اسکوائش کی دیوار رہی ہے جس پر جو گیند جتنی شدت سے ماری جائے، اتنی ہی شدت سے واپس لوٹا دی جاتی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے اخلاق وایثار کا جواب برعکس صورت میں ملتا، آج وہ فرشتہ صفت انسان کتنے ہی دلوں کو غم زدہ کرتا ہوا ایک حادثے میں مرگیا۔ ہاں! اس کی موت ایک حادثے میں ہی

ہوئی تھی لیکن اس حادثے کی اصل نوعیت سے صرف میں واقف تھا یا شاید کچھ حد تک موہن کمار۔

انسان کی تغیر پذیر فطرت کے متعلق سوچتے ہوئے میں نے گہرے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

تقریباً دو سال قبل اسی شہر کے ایک سرکاری آفس میں میری تقرری ہوئی تھی۔ ملازمت تو مل گئی لیکن رہائش کا مسئلہ ہنوز غور طلب تھا۔ گزشتہ ایک ہفتے سے تو میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا لیکن اس صورت حال کو اب مزید طول نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ ہوٹل کے اخراجات میری جیب سے تجاوز کرتے جا رہے تھے۔ میں اس روز ایک چھوٹے سے کیفے میں میز پر چائے کی پیالی لیے ہوئے اسی فکر میں غلطاں تھا کہ ایک مانوس سی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ارے رضوان! تم یہاں کیسے؟"

میں نے چونک کر سر اٹھایا اور اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر میرے رگ و پے میں سرشاری کی تیز لہر دوڑ گئی، وہ اوم پرکاش تھا۔ وہی معصوم اور خوبصورت چہرہ، آنکھوں میں وہی خلوص کی چمک اور ہونٹوں پر وہی بیریا نرم سی مسکراہٹ جو پانچ سال قبل بھی اس کی شخصیت کے لازمی اجزا تھے۔ کالج کے زمانے میں وہ میرا روم میٹ رہا تھا اور میں اس کے خلوص و محبت سے اس قدر عاجز تھا کہ اس سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا لیکن اس وقت اس کی آمد میرے لیے بے حد تقویت کا باعث تھی۔ میرے آفر دینے سے پہلے ہی وہ سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

"اور سناؤ! سب خیر و عافیت ہے نا؟"

"ہاں اوم پرکاش! سب ٹھیک ہے۔ دراصل مجھے اس شہر میں ملازمت ملی ہے پچھلے ہفتے ہی جوائن کیا ہے لیکن تم.......؟"

میں تو تین سال سے یہیں ایک نجی کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر کے عہدے پر فائز ہوں۔تمہاری رہائش کا کوئی بندوبست ہوا یا نہیں؟"

میں نے تعجب سے اس کی جانب دیکھا۔ہوسٹل میں ایک ساتھ رہتے ہوئے میں نے بارہا حیرانی سے سوچا تھا کہ یہ شخص دوسرے کو درپیش مسئلہ یا پریشانی سے کس طرح آگاہ ہو جاتا ہے اور پھر بظاہر لاپرواہی لیکن کتنی دل جمعی سے اس کے تدارک کی کوشش کرتا ہے۔لگتا ہے اب بھی اس میں وہی خوبی برقرار تھی۔کوئی اور وقت ہوتا تو پہلے کی طرح پس وپیش سے کام لیتا لیکن اس وقت اس اجنبی شہر میں وہ فرشتۂ رحمت بن کر وارد ہوا تھا۔

"ابھی کہاں؟ابھی تو ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں "

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔۔

"تو پھر چلو!ہوٹل سے اپنا سامان لے لو'

اس نے اٹھتے ہوئے کہا......میں چکرا کر بولا

"لیکن کہاں؟اور پھر پہلے چائے وائے تو پی لو "

"چائے گھر چل کر ہی پیئں گے۔اب چلو بھی "

اور اس طرح اس کے دو کمروں پر مشتمل خوبصورت سے فلیٹ کا ایک کمرہ میرے لیے مختص کر دیا گیا۔ایک بار پھر اس کے ساتھ رہنے کا لطف اٹھاتے ہوئے میں نے اس کے کردار واطوار کا ازسرنو مشاہدہ کیا اور یہ دیکھ کر قدرے حیران ہوا کہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے باوجود اس کی شریف النفسی اور خوش اطواری میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ ان میں کچھ اور پختگی آ گئی تھی۔آس پاس کے سارے لوگ اس کی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی کے گرویدہ تھے۔میں نے کبھی اس کی زبان سے کسی کے متعلق برائی کا ایک لفظ نہیں سنا۔وہ ایک ایسا آئینہ تھا جس میں ساری دنیا خوبصورت نظر آتی

تھی۔تلاش بسیار کے باوجود مجھے کوئی ایسا فرد نہیں ملا جس سے اسے نفرت تو کیا ہلکی سی شکایت بھی ہو۔وہ بیحد ناپسندیدہ شخصیت میں بھی محبت کرنے لائق کوئی نہ کوئی مثبت پہلو دریافت کر لیتا تھا۔حصول تعلیم کے بعد عرصۂ بیکاری میں اور پھر ملازم ہونے کے بعد بھی مجھے بیشتر لوگوں سے سابقہ پڑا تھا اوران سے جو تلخ تجربات ہوئے تھے ان کے تناظر میں اوم پرکاش کا جو ہر ایک کے تئیں انتہائی خلوص ومحبت کا ایک سا رویہ تھا وہ میرے لیے نا قابل فہم تھا۔میری دانست میں محبت اور نفرت بیک وقت دونوں ہی انسان کے فطری جذبے ہیں اوران سے کوئی بھی مبرا نہیں ہوسکتا۔کوئی بھی شخص صرف اورصرف محبت کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتا۔اسے کبھی کبھی، تھوڑی سی ہی سہی نفرت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔اگراسی دوران اس کی شخصیت پر چڑھی ہوئی وہ پرت نہ اترتی تو میں اسے کوئی اور ہی مخلوق تصور کرنے پر آمادہ ہونے لگا تھا۔

میرے آبائی شہر میں والدین کی پسند سے میری منگنی ہوگئی۔جلد ہی مجھے سرکاری مکان تفویض ہونے والا تھا جس کے بعد ہی شادی کا ارادہ تھا۔اوم پرکاش نے نہایت گرم جوشی سے مجھے مبارکبادی دی تو میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ اب وہ بھی شادی کرلے۔

"مجھے برہمچاری رہنے کا کوئی شوق نہیں۔میں نے لڑکی پسند کرلی ہے۔تمہاری طرح منگنی ونگنی کی رسموں میں نہیں پڑوں گا۔سیدھے سادے انداز میں کورٹ میرج ہوگی۔"

وہ بے حد خوش مزاجی سے بولا۔مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس نے لڑکی پسند کرلی اور مجھے بتایا تک نہیں، میں نے تجسس سے استفسار کیا۔

"کون ہے وہ لڑکی؟"

"میرے ہی آفس میں کام کرتی ہے شاردا۔دیکھو گے تو حسن کے لیے نئی تشبیہ تلاش کرتے رہو گے!!!"

اس کے لہجے میں پہلی بار وہ خمار نظر آیا جو صرف صنف مخالف کی محبت کے نشے

سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ میں نے خوشی سے سوچا۔ چلو یہ بشر بھی جنت سے نکالا گیا۔

ایک دن وہ دفتر سے لوٹا تو خلاف معمول اس کا مزاج کچھ برہم تھا۔ یہ میرے لیے تعجب خیز بات تھی۔ اس سے قبل میں نے اسے کبھی ہلکے سے غصے میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ ساون کے شفاف بادل کی طرح دھلا دھلا اجلا تبسم کھیلتا رہتا تھا۔ بہت کریدنے پر وہ برافروختگی سے بولا۔

"میرے آفس میں ایک نئے آدمی کا تقرر ہوا ہے، موہن کمار کا "

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"اسے غلط طریقے سے سفارش پر لیا گیا ہے۔ وہ منیجر کے کسی دوست کا بالکل نا اہل لڑکا ہے۔ جانتے ہو اس کے لیے ایک نیا عہدہ بھی تشکیل دیا گیا ہے۔ ڈپٹی منیجر کا جو میرے عہدے کے مساوی ہے "

اس کے لہجے میں بیحد تلخی تھی۔ بات سچ مچ ناگوار گزرنے والی تھی لیکن صرف اسی بنیاد پر اس قدر مشتعل ہونا اوم پرکاش کی فطرت کے منافی تھا۔

" بھئی! ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے موجودہ دور میں سفارش ہی سب سے بڑی اہلیت ہے۔ تمہارے جیسے شخص کو اس واقعے پر اتنا چراغ پا ہوتے دیکھ کر حیرت ہے، تم تو ہر آدمی کا استقبال فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے کرتے ہو"

اس نے کچھ چونک کر مجھے دیکھا آہستہ آہستہ اس کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑے قدرے ٹھہر کر اس نے مضمحل لہجے میں کہا۔

" پتہ نہیں کیوں مجھے وہ آدمی ذرا بھی پسند نہیں آیا۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں عجیب سی نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے "۔

اس کی شخصیت کا یہ مخفی روپ دیکھ کر جانے کیوں مجھے یک گونہ تسکین ہوئی ایسا لگا جیسے کسی پتنگ کی ڈور چھوٹتے چھوٹتے ہاتھ میں آ گئی ہو۔

لیکن اس کے بعد تو ایسا لگنے لگا کہ اوم پرکاش کے دل ودماغ پر موہن کمار کے تئیں شدید نفرت نے تسلط جما لیا ہو۔ ہر گزرنے والا دن اس نفرت میں اضافہ ہی کرتا جا رہا تھا۔ دفتر سے لوٹتے ہی وہ تلخ وترش لہجے میں اس کے خلاف اپنے تاثر کا اظہار کرتا۔ اس کی شکل صورت، اس کی صلاحیت، اس کے چال چلن پر جارحانہ تنقید کرتا، اس کے ہر فعل میں تنقیص کے نئے پہلو نکالتا، آہستہ آہستہ اس کی تمام خوش مزاجی اور خوش اخلاقی ناپید ہوتی جا رہی تھی اور اس کی جگہ ایک مستقل چڑ چڑا پن لیتا جا رہا تھا۔ میں تعجب اور افسوس کے ساتھ اس میں پیدا ہونے والے اس تغیر کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ موہن کمار سے ملے بغیر ہی مجھے یقین تھا کہ وہ بلاشبہ انتہائی قابل نفریں شخص ہے جس نے خلوص ومحبت کے اس گہرے بادل میں بے شمار سوراخ کر دیئے ہیں۔ اس روز تو یہ بادل بالکل ہی پھٹ پڑے۔

اوم پرکاش بے حد مشتعل نظر آ رہا تھا۔ غصے کی زیادتی کے سبب اس کے سرخ وسپید چہرے کی جلد بری طرح مرتعش ہو رہی تھی۔ آنکھوں سے تیز وتند شرارے پھوٹ رہے تھے۔ یکایک وہ اضطراری کیفیت میں بڑبڑایا!!!

"میں اسے مار ڈالوں گا۔ جان سے مار ڈالوں گا۔"

اس کے لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ میرے رگ وپے میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے کچھ خوف زدہ ہو کر اس کی جانب دیکھا جو کرسی پر بیٹھا ایک ٹک پختہ اور سپاٹ فرش کو گھور رہا تھا۔

"کسے مار ڈالو گے؟ کیا ہوا ہے آخر؟"

میں نے اس کے شانے کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

اس نے اپنی وحشت زدہ ویران نگاہیں اٹھائیں اور دیر تک دیوانوں کی طرح مجھے تکتا رہا۔ کچھ لمحے بعد اس کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔

"میں موہن کمار کو مار ڈالوں گا۔وہ کمینہ شاردا کے پیچھے پڑا ہے۔مجھے یقین ہے کہ معصوم شارداس کی کمینگی کا شکار ہو جائے گی"

"تم پاگل ہو گئے ہو"

میں اس کی بیوقوفی بھری باتوں سے بری طرح جھنجھلا اٹھا۔

"شاردا اگر تم سے محبت کرتی ہے تو وہ تمہاری ہی رہے گی اور پھر وہ کوئی ناسمجھ بچی نہیں کہ کسی کے بہکاوے میں آجائے تم اپنے آپ پر قابو رکھو۔اس خبیث موہن کمار نے تو تمہاری شخصیت کو قتل کر ڈالا ہے۔تم نے کبھی غور کیا ہے کہ تمہاری ساری خوش مزاجی اور خوش اخلاقی مفقود ہو چکی ہے۔تم ایک خطرناک فرسٹریشن میں مبتلا ہو گئے ہو۔اگر تم پہلے والا اوم پرکاش بننا چاہتے ہو تو میری مانو یہ نوکری چھوڑ دو"۔

وہ سر جھکائے میری باتیں سنتا رہا اور پھر بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔میں اس کی ذہنی کیفیت سے خاصا متفکر ہوا تھا۔میرے خیال میں اس چکرویو سے نکلنے کا واحد راستہ یہی تھا کہ اوم پرکاش یہ ملازمت جلد از جلد چھوڑ دے۔موہن کمار سے دور ہوتے ہی اس کے وجود پر حاوی تمام نفرت دھیرے دھیرے ختم ہو جائے گی اور وہ ایک بار پھر اپنے محور پر لوٹ آئے گا۔

لیکن دوسرے ہی روز وہ جانکاہ حادثہ پیش آ گیا جس کا میں نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔میں شام گئے گھر پر اس کا منتظر تھا۔خلاف توقع اس نے کافی دیر کر دی تھی۔اس کے ذہنی انتشار سے واقف ہونے کی بنا پر میں کچھ مضطرب بھی تھا۔معاً فون کی گھنٹی بجی، اس یقین کے ساتھ کہ دوسری طرف اوم پرکاش ہی ہوگا، میں نے رسیور اٹھالیا میرا نام سن کر دوسری جانب سے بالکل غیر مانوس سی آواز آئی۔

"اوم پرکاش بہت ہی سیریس حالت میں ایس ڈی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں وہ فوراً آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میرے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ کچھ دیر تک میں اواک سا کھڑا رہا اور پھر تیزی سے ہسپتال کی طرف بھاگا۔ اوم پرکاش مرگ و زیست میں مبتلا ICU میں موجود تھا۔ کچھ ہی دیر قبل اسے ہلکا سا ہوش آیا تھا اور اس نے فوری طور پر مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر میری چیخ نکل گئی اس کے تمام جسم اور سر پر پٹیاں بندھی تھیں جو اس کے سیاہی مائل خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔ صرف اس کا چہرہ کھلا تھا جس پر بے پناہ کرب کے آثار تھے۔ میری آواز سن کر اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور آنکھوں کے اشارے سے ہی مجھے اور پاس بلایا۔ میں اس کے چہرے پر تقریباً جھک سا گیا تو اس کی بے حد نحیف اور مدھم سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"تم میری طرف سے موہن کمار سے معافی مانگ لینا۔ اس سے کہنا کہ مجھے معاف کر دے ورنہ میری آتما کو چین نہیں ملے گا۔"

"اس سے معافی کیوں؟ کس لیے...؟"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

"اور تمہارے ساتھ یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟"

اس نے سخت جدوجہد کے بعد اپنی بے اعتدال سانسوں پر قابو پایا اور نقاہت بھری آواز میں گویا ہوا۔

" آفس میں کام زیادہ تھا۔ تھوڑی دیر ہوگئی۔ میں کمپنی کی کار خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے گھر کی طرف چل پڑا۔ شہر کی بھیڑ بھاڑ سے بچنے کے لیے میں نے جی ٹی روڈ چھوڑ کر بائی پاس کی سڑک پکڑ لی، سڑک بالکل سنسان تھی، اچانک کچھ دوری پر ایک شخص کو جاتے ہوئے دیکھ کر میں چونکا۔ مخصوص انداز میں اپنے ہاتھوں کو جھلاتے ہوئے چلنے والا شخص بلاشبہ موہن کمار تھا، اسے یوں تنہا پا کر میرے ذہن میں ایک

فیصلہ کن خیال آیا۔ میں نے ایکسیلیٹر پر پورا دباؤ ڈالا اور میری کار بجلی کی طرح اس کی جانب لپکی۔ اس سے پہلے کہ اسے خطرے کا کچھ احساس ہوتا، میں نے کار اس پر چڑھا دی"

" کیا؟! یہ تم نے کیا کر ڈالا؟"

میں غم و غصے سے بے ساختہ چیخ اٹھا۔ میری چیخ سے بے نیاز اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

" لیکن وہ تو چھلاوہ تھا حیرت انگیز طور پر وہ کار کی زد سے اتنی صفائی سے بچ نکلا کہ میں گنگ سا دیکھتا رہ گیا۔ اسی لمحہ میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر بے قابو ہو گئے اور کار اسی رفتار سے قریب کے ایک درخت سے ٹکرائی اور پھر مجھے ہوش نہ رہا "

اتنا کہنے کے بعد اوم پرکاش بری طرح ہانپنے لگا۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں تو میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑا۔ اکھڑتی سانسوں کے درمیان اس کی آواز نے میرا تعاقب کیا۔

" موہن کمار سے معافی مانگ لینا "

ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی اوم پرکاش نے آخری ہچکی لے لی تھی۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور اداس نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ میت اٹھانے کی تیاری ہونے لگی تھی۔ ایک گوشے میں چند افراد میں گھری ایک حسین لڑکی نے مجھے متوجہ کیا، وہ بے حد مغموم اور افسردہ سی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں یوں سرخ ہو رہی تھیں جیسے وہ دیر تک روتی رہی ہو کبھی کبھی اس کے قریب موجود کوئی شخص دلاسہ دینے والے انداز میں اس کی پشت کو سہلاتا اور کچھ کہتا۔ بغیر کسی تعارف کے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ شاردا ہے اور اس کے نزدیک اس کے دفتر کے ساتھی ہیں میں دھیرے سے اٹھا اور مضمحل قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔ شاردا کے

پژمردہ چہرے کو تکتے ہوئے میں نے استفسار کیا۔

"میرے خیال میں آپ لوگ اوم پرکاش کے دفتری ساتھی ہیں۔... اور آپ شاید شاردا دیوی ہیں؟"

اپنا نام سن کر شاردا چونکی، اس نے بغور مجھے دیکھا اور اثبات میں سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

" آپ لوگوں میں موہن کمار صاحب ہیں یا نہیں؟"

میں نے اس شخص کے آنے کی کوئی توقع نہ ہوتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔انہوں نے ایک دوسرے کو تکا اور پھر خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"شاید وہ نہیں آئے۔کیا آپ میں سے کوئی مجھے ان کی رہائش گاہ کا پتہ بتا سکتا ہے؟اوم پرکاش کی آخری وصیت کی تکمیل کے لیے میرا ان سے ملنا نہایت ضروری ہے "

" آپ کس موہن کمار کی بابت پوچھ رہے ہیں؟"

ان میں سے ایک درمیانی عمر والا شخص بولا۔

"ارے بھئی ! میں اس موہن کمار کی بات کر رہا ہوں جو آپ کی کمپنی میں ڈپٹی منیجر کے عہدے پر فائز ہیں۔شاردا دیوی تو اسے اچھی طرح جانتی ہیں"۔

شاردا نے قدرے استعجاب سے میری طرف دیکھا اور پھر دھیمے لیکن پر یقین لہجے میں بولی۔

" لگتا ہے کہ آپ کو کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ہماری کمپنی میں ڈپٹی منیجر کا کوئی عہدہ نہیں اور نہ ہی موہن کمار نام کا کوئی آدمی وہاں کام کرتا ہے"

میں نے بے یقینی سے ایک ایک فرد کے چہرے کو دیکھا لیکن سبھی کی آنکھوں میں شاردا کے بیان کی تائید پا کر حیرت کے گہرے سمندر میں غرق ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

......ناصر ضمیر

ممکناتِ دشتِ حیراں

"خدا! تم ہو اور میں پھر بھی اداس ہوں!

اس کے ذہن میں یہ خیال کوندا اور۔۔۔۔۔۔"

اور پھر یوں ہوا کہ اس نے اپنی پرانی زنگ آلودہ سائیکل پر بیس پچاس پیڈل مارے اور گھر پہنچ گیا۔

لکڑی کے بنے دو کمروں والے بوسیدہ گھر میں داخل ہوتے ہی جب اس نے اپنی ماں کے کراہنے کی آواز سنی تو اس کی جان میں جان آئی کہ "ماں کی سانسیں ابھی چل رہی ہیں۔" اس کی ماں مارفا ایگور میلی رضائی میں دبکی پڑی تھی۔ اس پر جگہ جگہ تن سے اترے پرانے چیتھڑوں کے پیوند لگے تھے۔ وہ بجائے ماں کے، اپنے کمرے کی طرف مڑا۔ کمرہ کیا دراصل ایک بڑے سے کمرے کو درمیان میں لکڑی کے پھٹوں سے تقسیم کیا گیا تھا، ایک باورچی خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، جس کے ایک طرف دیوار سے لگا لکڑی کا پرانا تختہ تھا جس پر اس کی ماں پڑی رہتی تھی اور دوسرے میں وہ سوتا تھا۔ اپنے کمرے میں جاتے ہی اس نے جلدی سے گلے سے مفلر اتارا، ٹوپی بستر پر پھینک دی، جیب سے سستی بنا فلٹر والی سگریٹ نکالی، دو تین کش لیے اور کھڑکی کے شیشے پر جمی بھاپ کو بائیں بازو کی کہنی سے صاف کیا۔ ایک نظر آسمان کی اور دیکھا جو گہرے، کالے بادلوں سے گرا ہوا تھا۔

"آج رات ضرور برفباری ہوگی۔"

وہ اپنے ساتھ بڑبڑایا۔۔۔"۔ بارشیں بھی تو چند روز سے لگاتار ہو رہی ہیں...... پر...... پر اگر برف پڑی تو............"

"یوگونا۔۔۔یوگونا"

وہ کچھ چونک سا گیا اس کی ماں اسے آواز دے رہی تھی۔اور پھر درد سے کراہنے لگی۔

"ہاں ماں کچھ چاہیے"

"نہیں...... کچھ کھا لے بیٹا اور پھر آرام کر لے، سردی بھی بہت ہے"

"ہاں ماں"

یوگونا نے ماں کو جواب دیا اور سوچنے لگا۔

"ماں کتنے عرصے سے بیمار ہے اور درد سے کراہتی رہتی ہے اور میں بدنصیب کچھ نہیں کر پاتا...... کچھ بھی تو نہیں کر پاتا ہوں،...... بھلا کروں گا بھی کیا میرے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں کہ ماں کا اچھے سے علاج کرا سکوں"، اس کی آنکھوں میں ہلکا سا پانی تیرنے لگا۔

"یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے بھلا، مصیبتوں اور غموں کی نا ختم ہونے والی داستان ....میری ماں ، میری ماں کو کبھی بھی سکون کا یا خوشی کا ایک لمحہ بھی نصیب نہ ہوا "۔یوگونا کو یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ماں پچھلی دفعہ کب مسکرائی تھی۔اب وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ آلام و مصائب بھری زندگی کے اس کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں شامل ہو چکا تھا۔کسی گام کوئی راحت، کوئی خوشی نہیں ایک ٹھنڈی آہ۔

" کیا اسے خبر نہیں

یوگونا پھر من ہی من سوچنے لگا۔

"پر...... پر ماں تو کہتی ہے اسے سب کی خبر رہتی ہے۔سب کی......

"تو کیا اسے میرے اور میری ماں کے بارے میں سب علم ہے۔کیا وہ واقعی جانتا ہے،ہم کن آلام ومصائب سے گزر رہے ہیں۔؟"

یوگونا کے ذہن میں کئی سوالات جنم لیتے رہے پر وہ اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے من ہی من پھر سوچنے لگا۔

"وہ خدا ہے اور خدا کو سب پتا ہے،وہ سب کے حالات اور تکالیف سے واقف ہے۔"

"ارے......ارے میں......میں تو ماں کی طرح سوچنے لگا۔"

"اور فرض کرتے ہیں کہ اسے نہیں پتا۔۔۔تو کیا ہوا میں اسے بتادوں گا......

بتاؤں گا کہ ہم کس جہنم میں جینے کے لیے مجبور ہیں۔"

یوگونا نے اپنے سرد ہاتھ آپس میں رگڑے پھر پھونک سے انہیں گرم کرنے کی کوشش کی۔کاغذ قلم لے کر ایک چھوٹے سے بے حد پرانے بیڈ پر بیٹھ گیا اور لکھنے لگا۔

"اے خدا......!!

میں یوگونا

سورتاولا شمال مغربی روس کے ایک چھوٹے سے شہر نما قصبے کا ایک غریب لڑکا......بہت غریب، میں کیل بنانے والے کارخانے میں کام کرتا ہوں، میں اس وقت جن ہاتھوں سے تمہیں خط لکھ رہا ہوں وہ کم عمری میں ہی کھردرے ہوگیے ہیں۔میں نے بچپن سے ہی مصیبتیں دیکھی ہیں۔

میں اور میری ماں اس لکڑی کے بوسیدہ سے گھر میں رہتے ہیں۔میری ماں کچھ عرصے سے بیمار ہے، بہت بیمار......دن رات درد سے کراہتی رہتی ہے۔ماں کا مطلب سمجھتے ہونا......ماں......مجھے اس دنیا میں لانے والی میری ماں۔ہاں......وہ بہت بیمار ہے مگر میں بدنصیب اس کا علاج بھی نہیں کراسکتا ۔تمام عمر میری ماں نے

مجھے اکیلے ہی پالا۔ کیونکہ تم نے میرے باپ کو میرے پیدا ہونے کے کچھ دنوں بعد ہی ہم سے چھین لیا تھا۔ ماں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے محنت مزدوری کر کے مجھے پالا۔ لوگوں کے گھروں میں برتن، کپڑے دھوتی رہی , گھوڑوں کے اصطبل تک صاف کرتی رہی۔ مجھے پڑھاتی رہی۔۔۔۔۔۔ میری پڑھائی ابھی مکمل بھی نہ ہو پائی تھی کہ ماں بیمار ہوئی اور ایسے بستر سے لگ گئی کہ پھر اٹھ نہ پائی۔

میں نے پڑھائی چھوڑ کر کیل بنانے والے کارخانے میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اب کچھ برسوں سے وہیں پر محنت مزدوری کر رہا ہوں پر اتنا کما نہیں پاتا کہ اپنی ماں کا علاج کرا سکوں، اپنی بدنصیبی پر غصہ آتا ہے، بے حد غصہ......اور راز کی بات بتاؤں! کبھی کبھی تم پر بھی، لیکن ماں ٹوکتی ہے کہتی ہے۔

"ایسا نہیں کہتے"۔

وہ چاہتی ہے کہ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑوں، سر جھکاؤں تاکہ تم خوش ہو جاؤ خوش! میں جانتا ہوں خدا! تم اس وقت میری ماں کی معصومیت پر مسکرا رہے ہو گے اور میں جب ماں سے کہتا ہوں۔ اتنی بڑی دنیا میں خدا صرف تمہاری کیسے سنے گا اور اسے اتنی فرصت کہاں ہے تو وہ روٹھ جاتی ہے کہتی ہے میں۔۔۔ کم ظرف ناشکرا اور جھوٹا ہوں۔

اور......اور خدا کو ماننے والے سب سچّے ...... پر میں اسے کیسے سمجھاؤں، کیسے بتاؤں، کہ خدا خدا ہوتا ہے...... عظیم اور قدرت والا، ہم سب سے بڑا...... یہاں تک کہ ہماری سوچ سے بھی بڑا اور اگر خدا بڑا ہے، عظیم ہے، تو اسے اپنی عظمت اور اپنی خدائی کا مان تو رکھنا چاہیے نا اپنے بے آسرا بندوں کا خیال بھی......اور میرا خیال بھی......میرے بھی کچھ خواب ہیں , کچھ ارمان ہیں، چند ضرورتیں, چند بے ضرر سی

خواہشات......

جانتے ہو خدا۔ میرا ایک پسندیدہ قلمکار ہے میرا من پسند مصنف ارے وہی جسے پہلے سزا موت سنائی گئی تھی اور پھر موت کی سزا سات سال کی قید میں بدل دی گئی۔ اسے سائبریا کے انتہائی یخ بستہ علاقے میں ایسے قید خانے میں رکھا گیا جہاں گندگی اور غلاظت کے ڈھیر تھے۔ سانس تک لینا مشکل تھا اور یوں اس نے اپنی حیات کے بدترین سات سال وہاں گزارے۔ پتا نہیں دنیا میں اکثر عظیم لوگوں کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟۔ میں روز اس کی کتاب نکڑ کے بک اسٹال کی شلف پر دیکھتا ہوں، پر اسے خرید نہیں سکتا۔ کیونکہ میرے پاس اس کو خریدنے کے پیسے نہیں ہیں۔ اس کتاب کو دیکھتے وقت اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں، اندر ہی اندر انگلیوں سے خالی جیب کو ٹٹولتا ہوں اور پھر مٹھی کس کے بند کرتا ہوں، اپنی بے بسی پر خون کے آنسو پی جاتا ہوں، ضبط کرتا ہوں اور تمام دنیا کے نام نہاد نظاموں پر ایک بھرپور لعنت بھیجتا ہوں اور گھر لوٹ آتا ہوں۔

اف یہ خواب، یہ ارمان اور ان کی فہرست کتنی لمبی ہے، کتنی طویل ہے۔ شاید...... پر میں اب تھک گیا ہوں، دن بھر کی کمر توڑ مزدوری نے مجھے تھکا دیا ہے...... اسی لیے آج اتنا ہی۔

میں یہ خط کل سویرے پوسٹ کروں گا۔ مجھے نہیں پتا یہ خط تم تک کیسے پہنچے گا، پہنچے گا بھی یا نہیں...... مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ میں اسے کس پتے پر پوسٹ کروں ہاں پر ماں اکثر کہتی ہے۔

"تم ہر جگہ رہتے ہو"۔ اسی لیے......

یوگونا پہلے ہی بہت تھکا ہوا تھا، اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور وہ یوں ہی جوتے پہنے، بھوکے پیٹ سو گیا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اس کے

جسم پر کمبل تھا، پر اسے یہ یاد نہیں آیا کہ اس نے کمبل کب اوڑھا تھا۔

وہ اٹھا اور اس نے کھڑکی کا شیشہ صاف کیا، دیکھا باہر ہلکی سی برف پڑی تھی۔تھوڑی دیر بعد وہ کارخانے کی طرف جا رہا تھا۔ پر پہلے اس نے رات کو لکھا ہوا خط پوسٹ بکس میں ڈال دیا۔لفافے پر لکھا تھا......!!

"خدا کے نام خط"

دو تین روز معمول کے مطابق ہی گزرے۔ایک شام جب یوگونا کام سے واپس لوٹا تو اس کی ماں مارفا ایگور نے اسے بتایا کہ پوسٹ آفس سے اس کے لیے ایک پارسل آیا ہے۔

اس کی ماں حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یوگونا سے پوچھنے لگی۔

"ہمارے نام ابھی تک کسی کا خط تک نہیں آیا ہے پھر یہ پارسل بھلا کوئی کیوں بھیجے گا ......نہ ہماری جان پہچان، نہ دوست احباب، نہ ہم غریبوں کے رشتے دار ......پھر کون؟" یوگونا خود پریشان ہوا اور جب اس نے بیڈ سے پارسل اٹھایا، اسے کھول کر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے اس کا بوسیدہ مکان زلزلے کی زد میں آ گیا ہو، اسے یوں لگا کہ جیسے اس کے کان سننے کی طاقت کھو بیٹھے ہیں، چاروں اور سکوت چھایا ہوا ہے وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی پسندیدہ کتاب " کارامازوف برادران "اس کے سامنے ہے۔ وہی کتاب جسے وہ ہر روز نکڑ کے بک اسٹال کی شلف پر دیکھتا تھا، وہ کتاب آج اس کے ہاتھوں میں تھی......وہ حیرت وانبساط کی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھا۔ بغور دیکھنے پر پتا چلا کہ پارسل کے ساتھ ایک خط بھی ہے۔ یوگونا نے کانپتے ہاتھوں سے خط کھولا......لکھا تھا۔

"پیارے یوگونا

تمہارا خط ملا۔

مجھے بہت افسوس ہے۔

میں تمہارے اور تمہاری ماں کے بارے میں سب جانتا ہوں۔ پر یقین جانو میرے بچے یہ دنیا چلانے کے لیے ضروری ہے کہ ہر خواہش ہر ضرورت کے لیے انسان کو کٹھن راہوں سے گزارا جائے۔ ورنہ یہ زندگی بے کیف، بیرنگ و بے معنی ہو جائے گی۔ کشمکش اور جدو جہد ہی زندگی کا دوسرا نام ہے"۔

" پیارے یوگونا اپنا اور اپنی ماں کا خیال رکھو۔ اور جو بھی ہے، جتنا بھی ہے، اسی میں خوش رہنے کی کوشش کرو، ورنہ مزید دکھ پہنچے گا اور مایوس رہو گے۔ جو بالکل بھی اچھی بات نہیں۔ مجھے پتا ہے میرے بچے تم ایک اچھے بچے ہو۔

میرے پیارے یوگونا"

یوگونا کچھ سمجھ نہیں پایا اور اس نے لرزتے ہاتھوں سے خط بیڈ پر رکھا اور کتاب کو دیکھنے لگا پھر مسرت سے کتاب پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

اس کا جی چاہا کہ وہ جلدی سے جائے اور یہ سارا قصہ اپنی ماں کو سنائے پر اسے لگا کہ اس کی ماں اس کی بات کا یقین نہیں کرے گی۔ بلکہ دنیا کا کوئی بھی شخص اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا اسی لیے اس نے اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے جلدی جلدی کاغذ اور قلم اٹھایا اور خدا کو تشکر نامہ لکھنے لگا۔

"اے خدا

میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں......

اب جب آپ میری بات خط کے ذریعے سن ہی رہے ہیں تو سنیے مجھے کچھ پیسے دے دیجیے، تاکہ میں اپنی ماں کا علاج کرا سکوں اور وہ جلدی سے ٹھیک ہو جائے۔

اور ہاں ایک راز کی بات بھی آپ کو بتانی ہے سمجھ نہیں آتا کیسے بتاؤں......

وہ...... وہ......ایلینا ہے نا......میں......میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں......

ایلینا......وہ......وہ یہیں ہمارے ہی شہر کی ہے اور آرٹ کالج میں پڑھتی ہے۔

وہ بے حد حسین ہے, بے حد خوبصورت، اس کی بڑی بڑی کانچی آنکھیں مجھے میرے مستقبل کا پیغام دیتی ہیں۔ مجھے میری منزل ان گہری آنکھوں میں نظر آتی ہے ،ایلینا کو دیکھ کر مجھے لگتا ہے، وہی میری زندگی کا مرکز ہے وہی میری زندگی کا محور۔

بس سمجھ جاؤ خدا......!!

ایلینا ہی میری محبت ہے۔لیکن ایک مشکل ہے میں اس کو چاہتا ہوں وہ یہ نہیں جانتی، پتا نہیں وہ مجھے جانتی بھی ہے یا نہیں، مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے مجھے کبھی نوٹس کیا بھی ہے کہ......میں جب اسے دیکھتا ہوں۔میرا دل بیلوں اچھلتا ہے۔مجھ پر بوکھلاہٹ سوار ہو جاتی ہے۔ایک عجیب اور دلچسپ کی بات ہے جس کا ذکر آپ سے لازمی ہے۔جب چھٹی کے وقت ایلینا کالج سے نکلتی ہے تو عین اسی وقت میرے سائیکل کی چین بھی اتر جاتی ہے، میں سائیکل سے اتر کر چین کو کسنا شروع کرتا تو سائیکل پر جھکتے ہوئے ہی چور نظروں سے ایلینا کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ہر بار پتا نہیں کیوں میرے سائیکل کی چین......پر......پر اب میں اس آنکھ مچولی سے تھک گیا ہوں ۔ پلیز خدا کچھ ایسا کرو کہ اسے میری محبت کا پتہ چلے اور وہ بھی......

بس میرا یہ کام بن جائے ہمیشہ تمہارا احسان مند رہوں گا۔

باقی آئندہ

شکریہ خدا

تمہارا

یوگونا "

خط ختم کرتے ہی یوگونا اونگنے لگا اور تھوڑی دیر میں ہی اوندھے منہ سو گیا۔

اگلی صبح جاگا تو اس نے دیکھا وہ کمبل اوڑھے تھا لیکن اسے پھر یاد نہیں آیا کہ اس نے کمبل کب اوڑھا تھا۔

کام پر جانے سے پہلے اس نے خط کو خوشی خوشی پوسٹ کر دیا۔

اسی روز شام کو یوگونا کی زندگی میں بہت بڑا طوفان آیا۔

وہ شام کو جب گھر لوٹا اسے ماحول میں ایک نامعلوم سنّاٹا محسوس ہوا۔ کانوں میں ماں کے کراہنے کی آواز نہ آئی۔ اس نے باورچی خانے کے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا ہی گیا۔ ماں کو معمول کے خلاف سوتے دیکھ اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔ چیتھڑوں کی پیوند نما ملگجی رضائی کا ایک سرا زمین پر آرہا تھا، جب وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ماں کے ماتھے کو چھوا۔ وہ جھک کر اس کی نبض ٹٹولنے لگا مگر وہ نجانے کب دم توڑ چکی تھی۔ وہ بدحواسی کے عالم میں پورے کمرے میں گھومنے لگا اور زار و قطار رونے لگا ۔ آج وہ ایک ایسے صدمے سے دوچار ہوا تھا جس کا اسے پہلے کبھی کوئی اندازہ نہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ساری دنیا اجڑ گئی ہو۔

پھر وہ کئی دنوں تک افسردہ، یوں ہی پہروں بیٹھا رہتا۔ کام کا ہوش نہ کھانے پینے کی سُدھ۔ بس خاموش آنسو بہاتا رہتا۔ اس دوران اس نے خدا کے نام کئے خط لکھے۔ جن میں اپنی بھرپور ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ پر کسی بھی خط کا کوئی جواب نہ آیا ۔

پھر ایک دن ......!!

یوں ہوا کہ وہ یوں ہی بے سدھ پڑا تھا کچھ جاگا ہوا کچھ نیند میں ۔ یوگونا کو برف لگے جوتے، بلیک پینٹ، براؤن کوٹ، ایک خوبصورت کوٹ میں ملبوس ایلینا......

ایلینا وہ نیم بیہوشی کے عالم میں بڑبڑایا......

ایلینا مسکرا رہی تھی۔

تم!

ت...... ت......تم اور یہاں۔ک......کہ......کیسے

ایلینا کی مسکراہٹ اور گہری ہوگ ء۔

تم سوتے ہوئے کتنے پیارے لگتے ہو۔وہ معصومیت سے بولی۔

"او ایلینا......ایلینا تم میری زندگی ہو، میری کل حیات۔ یہ کانچی آنکھیں۔اف مجھے جینے نہیں دیتیں۔کیا کروں......کیا کروں۔تم سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ماں کے چلے جانے کے بعد میں اکیلا پڑ گیا ہوں ایک دم تنہا...... بالکل تنہا......

مجھے سنبھالو ایلینا ورنہ میں حالات کی آندھی میں بکھر جاؤں گا،ریزہ ریزہ ہوجاؤں گا۔اس کی آنکھوں سے متواتر خاموش آنسوں بہہ رہے تھے۔وہ اپنے بیڈ سے اترا اور ایلینا کی طرف باہیں پسارے یوں لپکا جیسے وہ کوئی سہما ہوا بچّہ ہو جو دنیا کی بھیڑ سے گھبرا کر ماں کی طرف بڑھتا ہے......"اییش " اچانک اس کا سر سامنے کی دیوار سے ٹکرا گیا۔منہ سے بے ساختہ سسکی نکلی۔سب دھندلا دھندلا تھا۔وہ ایک ہاتھ سے سر کو سہلانے لگا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے آنسوں صاف کرنے لگا۔جب یوگانا کو ذرا سا ہوش آیا تو اسے محسوس ہوا کمرا خالی ہے ایلینا کہیں نہیں تھی۔۔وہ بے حد حیران ہوا۔

" کیا میں پاگل ہونے لگا ہوں،کیا میرا دماغی توازن کھونے لگا ہے؟۔"

نہیں...... یہ ایک خواب تھا صرف ایک خواب......تھوڑی دیر بعد یوگونا اپنے گھر میں کسی اجنبی کے ساتھ......

"جی فرمایے"

"جی میں نکولائے تموفل ہوں۔یہاں نکڑ کے بک اسٹال میں کام کرتا ہوں۔"

اجنبی شخص نے اپنا تعارف دیا۔

"ہاں فرمائیں، میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں"۔

یوگونا بالکل نارمل انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"جی مجھے مارفا ایگور سے ملنا ہے انھوں نے مجھے یہاں کا پتا دیا تھا"۔

نکولائے تموفل نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور کہنے لگا۔

"دراصل دو تین ماہ قبل ایک دن، جب میں بک اسٹال پر نئی کتابوں کی فہرست بنا رہا تھا ایک ادھیڑ عمر کی عورت میرے پاس آئی جس کا چہرا دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ بہت بیمار ہے۔ وہ ٹھیک سے کھڑی بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔اس نے مجھ سے کہا کہ۔۔۔" مجھے فیدرو دوستوسکی کی کتاب چاہیے" وہ کتاب بہت دنوں سے بک شلف پر پڑی تھی۔اس کی قیمت معلوم کر کے جب اس نے کتاب کی قیمت ادا کی......تو پیسے لیتے ہوئے مجھے یہ صاف محسوس ہوا کہ یہ رقم بہت دنوں سے جمع کی گئی ہے، چھوٹے بڑے پرانے ملگجی نوٹ اور سکّے۔کتاب لے جانے کے بعد وہ واپس پلٹی اور مجھ سے کہنے لگیں۔

"جی۔۔ میں مارفا ایگور ہوں یہیں اسی شہر میں تھوڑی ہی دور رہتی ہوں ۔کیا آپ میرا ایک کام کریں گے؟"

وہ مشکل سے بول پا رہی تھی۔

"جی فرمائیں"

" کیا آپ اس مصنف کی مزید کتابیں مجھے رعایتی داموں پر دے سکتے ہیں۔وہ کیا ہے کہ میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں"

"جی نہیں میڈم مارفا......

"اوّل تو اس قلمکار کی مزید کتابیں اس وقت ہمارے پاس موجود نہیں ہیں، دوم ان کو رعائتی داموں پر دینا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ ہاں البتہ ہماری بیشتر کتابیں ایک پرانے پبلشنگ ہاؤس شوربے ورلیگ سے آتی ہیں۔ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔آپ اپنا

پتہ مجھے دے دیجیے اگر وہ مان گئے تو......"

"میں آج ان کو یہی بتانے آیا ہوں۔ کہ وہ لوگ رعایتی داموں پر کتابیں دینا مان گئے ہیں۔" نکولائے تموفل نے پوری تفصیل بتا دی۔

تب یوگونا نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا......

"جی وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں چند مہینے قبل وہ اس دنیا سے......"۔

نکولائے تموفل نے بے حد دکھ اور افسوس کا اظہار کیا اور چلا گیا۔نکولائے تموفل کی بات سن کر یوگونا کو ایک بہت بڑا دھچکا لگا بہت بڑا صدمہ اور سوچنے لگا

"تو کیا وہ کتاب..................اور وہ خط..................

وہ بے حد مایوس دل برداشتہ ہوا۔وہ خود سے بڑبڑانے لگا۔

"میں کتنا بیوقوف ہوں کتنا بڑا احمق..........

"خدا کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ سب کی فرمائشیں پوری کرتا رہے............

یوگونا کو دھیرے دھیرے غصہ آنا شروع ہو گیا۔

وہ بہت بڑا اور عظمت والا اور ہم چھوٹے غریب لوگ............"۔اب اس کا غصہ اور بڑ گیا اور اس نے کمرے کی توڑ پھوڑ شروع کر دی اور چلانے لگا

"میں نے کہا تھا ماں سے............کہا تھا............خدا، خدا ہوتا ہے، ہم جیسوں کی اسے ضرورت نہیں اور نا ہی اس کے لیے ہماری کوئی اہمیت ہے............لیکن ماں کو اس پر بھروسہ تھا خدا سے کیا شکایت، میری ہی ماں نے مجھے دھوکے میں رکھا۔

"سنتی ہو ماں............میں سچّا تھا سچّا............سن رہی ہو ماں......"

۔"تم نے ایسا کیوں کیا ماں............تم نے ایسا کیوں کیا؟"۔یوگونا گھر کے سامان کی توڑ پھوڑ کے بعد تھک گیا، گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کے ساتھ خود بھی کہیں گر پڑا اور روتے روتے اس کی نظر سامنے فرش پر پڑی وہ چونک گیا اپنی آنکھیں ملنے

لگا، وہ............وہ...........فرش...........کانپتے ہوئے بڑبڑایا وہ وہاں فرش پر جہاں کچھ دیر قبل اس نے ایلینا کو بیٹھے ہوئے دیکھا تھا وہیں پر..........یہ کیسے ممکن ہے، یہ کیسے............

فرش پر برف اور کیچڑ لگے جوتوں کے نشان موجود تھے...........تو کیا ایلینا یہاں...... یہاں سچ میں آئی تھی۔۔۔نہیں شاید نہیں تو پھر یہ نشان ،اف میں پاگل ہوگیا...........ہاں......ہاں میں پاگل ہوگیا ہوں۔میرے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں ہیں...........سب ایک جھول ہے یہ سب ایک جھول ہے......سب کچھ الجھا ہوا ہے سب کچھ..........خدا ،محبت ،ماں ،کتاب خط اف..........یوگونا نے آٹھ کر لکڑی کے پھٹوں کی بنی دیوار پر پہلے زورزور سے مکے مارنے لگا اور پھراس پر سر پٹکنے لگا، ساتھ ساتھ چلا رہا تھا تبھی میں سوچوں ماں کے چلے جانے کے بعد میرے کسی خط کا جواب کیوں نہیں آیا۔۔کیوں نہیں آیا

یوگونا حواس باختہ اور ہلکان ہوکر بے تحاشا رورو کر بیہوش ہوکر گر پڑا۔

پتا نہیں کتنا وقت گزرا...........نیم بے ہوشی کی حالت میں ادھ کھلی آنکھوں سے یوگونا دروازے کی اور دیکھ رہا تھا جہاں کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا اور زور زور سے آوازیں بھی

"مسٹر یوگونا مسٹر یوگونا"

" کیا گھر میں کوئی ہے ؟میں ڈاکیہ مسٹر یوگونا کے نام کا خط آیا ہے۔"................

☆☆☆

تبصرہ کتب:

(1)

نام کتاب: اکیسویں صدی میں اردو ناول

مرتب : منظور حسین

مبصر : ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

پیش نظر کتاب ’’اکیسویں صدی میں اردو ناول‘‘ نوجوان ریسرچ اسکالر منظور حسین کی اولین کوشش ہے جس میں موصوف نے اردو ناول کے سمت ورفتار کا ایک ادبی خاکہ پیش کیا ہے اور کتاب مذکورہ میں اردو ناول اور اس کے سمت و رفتار کے حوالے ایسے مضامیں شامل کیے ہیں جو معاصر ناول کے تغیر وتبدل اور اس فن کی تفہیم کے لیے بے حد معاون ہیں۔ کتاب میں درجہ زیل مضامین اردو ناول کی عصری صورتحال سمجھنے کے لیے شامل کیے گئے ہیں۔

اکیسویں صدی میں اردو ناول: مزاج ومعیار (پروفیسر قدوس جاوید)، جس دن سے ...عصری بحران کا آئینہ (پروفیسر قدوس جاوید)، آتش دان سنگھرش کی داستان (پروفیسر علی احمد فاطمی)، عبدالصمد کے نئے ناول کا معروضی تجزیہ...کرونا اور کشکول (پروفیسر علی احمد فاطمی)، عشق کا کثیر تہذیبی ڈسکورس، چاند ہم سے باتیں کرتا ہے (پروفیسر صغیر افراہیم)، آخری سواریاں کے سوار (پروفیسر غضنفر)، اندھیرا پگ ،عورت بطور ہیرو (پروفیسر مولا بخش)، لیمنٹیڈ گرل کی انفرادیت: موضوع اور ٹلنیک (پروفیسر سید احمد شمیم)، اردو ناول میں پنجابی تڑکا ہے جسی ، (پروفیسر اسلم جمشید پوری)، روحزن: شیطی قوتوں کی بازآمد (پروفیسر انتخاب احمد)، مشرف عالم

ذوقی کے نئے ناول میں عصری حسیت (پروفیسر ریاض احمد)' ناول دہشت زادی.. بنٹری مرثیہ (ڈاکٹر ریاض توحیدی)' شفق سوپوری کا ناولٹ 'نیلما' (ڈاکٹر مشتاق احمد وانی)' لے سانس بھی آہستہ کا تنقیدی جائزہ (ڈاکٹر رضوانہ شمسی)' ''آسماں سے آگے' کی گرہ کشائی (ڈاکٹر لیاقت نیر)' ہندو مسلم اتحاد اور دیہی تہذیب و ثقافت کا علمبردار ناول 'دھنورا' (ڈاکٹر شاداب علیم)' مانجھی (نورالحسنین)' ترنم ریاض کا ناول 'برف آشنا پرندے' (سید محمد اشرف)' اماوس میں خواب ...(نورین علی حق)' ناول ہجور آما تجرید سے پرے ایک قدم (خلیل ماموں)' شموئل احمد کے تین ناول تجزیاتی مطالعہ (محمد غالب نشتر)' کئی چاند تھے سرآسماں' ایک دستاویزی بیانیہ (اسلم مصباحی)' اللہ میاں کا کارخانہ یا تہذیب کے برزخ...(خوشتر زریں ملک)' صدیق عالم کا ناول 'چینی کوٹھی' (فیصل اقبال اعوان)' فریم اسٹوری کے تناظر میں 'ایک خنجر پانی میں' (محمد حنیف)' تخم خوں ۔۔دلت ڈسکورس کا نمائندہ ناول (جمیل حیات)' اکیسویں صدی کے نامور ناول نگار کشمیری لال ذاکر کے ناولوں میں عورتوں کے جنسی ونفسیاتی مسائل (ڈاکٹر جہاں نظیر)۔

کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر رضوانہ شمسی نے لکھا ہے۔ بیک کور پر پروفیسر قدوس جاوید کے تاثرات موجود ہیں اور مقدمہ مرتب نے تحریر کیا ہے جس میں شامل کتاب مضامین پر گفتگو اور کتاب کی ضرورت پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ کتاب سے متعلق پروفیسر علی احمد فاطمی' پروفیسر اسلم جمشید پوری' شموئل احمد' نورالحسنین' ڈاکٹر ثروت خان' ڈاکٹر صادقہ نواب سحر' صغیر رحمانی' احمد صغیر کے تاثرات بھی موجود ہیں۔

ابتدا میں پروفیسر جاوید قدوس کا قریباً پچاس صفحات پر مشتمل مضمون ''اکیسویں صدی میں اردو ناول: مزاج و معیار'' تحقیق و تجزیے کا اعلیٰ نمونہ ہے کیونکہ اس میں

ناول کے فن پر تھیوریٹکل انداز سے گفتگو کرتے ہوئے اکیسویں صدی نے بیشتر اہم ناولوں کا جائزہ بھی پیش ہوا ہے، جس سے ان دو دہائیوں میں شائع شدہ ناولوں اور ناول نگاری کا فنی وفکری اور تکنیکی وموضوعاتی منظرنامہ سامنے آتا ہے۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے مضمون میں معروف فکشن نگار نورالحسنین کے ناول ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' کے موضوعاتی تفہیم کا ماہرانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔اور ناول کی فنی خوبی کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' میں نورالحسنین نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ناول کا فن، جملے اور واقعات کو گڑھنے کا فن نہیں ہے بلکہ یہ ایک پختہ کار تخلیقی شعور رکھنے والے فکشن نگار کا شعوری اور منصوبہ بند عمل ہے۔'' (ص:۱۷۶۔۱۷۷)

پروفیسر غضنفر نے سید محمد اشرف کے مشہور ناول ''آخری سواریاں'' کا جائزہ اپنے مخصوص استفہامیہ اسلوب سے شروع کیا ہے اور پھر ناول کا جائزہ لینے کے دوران سید محمد اشرف کی فکشن نگاری کا یوں احاطہ کیا ہے:

''اشرف کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی روداد سنانے میں بھی کہانی کے ہنر کو نہیں بھولتے۔انہیں کہانی کا ہنر اچھی طرح آتا ہے اور اس فن پر انہیں دسترس بھی حاصل ہے۔کہانی کا ہنر یہ ہے کہ اپنی روداد زمانے کی روداد بن جائے اور زمانے کی روداد اپنی روداد لگنے لگے یعنی آپ بیتی جگ بیتی بن جائے اور جگ بیتی آپ بیتی۔۔۔اشرف کو یہ جادو چلانا آتا ہے۔'' (ص:۱۸۴۔۱۸۵)

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے بشیر مالیر کوٹلوی کے ناول ''جسی'' کا دلچسپ جائزہ لیا ہے۔ناول کی خوبیوں کا احاطہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ زمانے بعد پنجاب سے کوئی ایسا ناول منظر عام پر آیا ہے، جس نے اردو ناول میں پنجاب کی خوشبو بکھیر دی ہے۔تانیثیت کا ایسا رنگ

ہے جس میں عورت بے بسی کی آگ میں جلتی ہوئی زندگی بسر کرتی ہے لیکن آخری لمحات میں بغاوت کا آتش فشاں بن جاتی ہے۔'' (ص:۲۳۸)

پروفیسر ریاض احمد کا مضمون ''مشرف عالم ذوقی کے نئے ناول میں عصری حسیت'' مشرف عالم کی ناول نگاری کے فنی مسائل اور موضوعاتی جہات پر عمدہ روشنی ڈال رہا ہے۔ موصوف برصغیر کی بدلتی ہوئی سیاسی وسماجی اور معاشی صورتحال کے پیش نظر تخلیق شدہ اردو ناولوں میں ذوقی کی ناول نگاری سے متعلق لکھتے ہیں:

''ایسے ہی ناولوں میں مشرف عالم ذوقی کے نئے ناول 'پو کے مان کی دنیا' 'لے سانس بھی آہستہ' 'آتشہ رفتہ کا سراغ' 'نالۂ شب گیر اور 'مرگ انبوہ' وغیرہ رکھے جاسکتے ہیں۔ دراصل مشرف عالم ذوقی کے ناول کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وتاریخ اور عصری سیاسی وسماجی منظرنامے کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔'' (ص:۲۷۷)

ڈاکٹر شفق سوپوری کے ناول ''نیلما'' کا جائزہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے پیش کیا ہے۔ اس ناول کی خوبیوں سے متعلق موصوف لکھتے ہیں:

''فنی اعتبار سے اگر دیکھیں تو ناول ''نیلما'' میں کہانی کی روانی' واقعات کی منطقی ترتیب' کرداروں کی حرکات وسکنات اور ان کی بات چیت اپنی اپنی جگہ پر ناول کو کامیاب بناتے نظر آتے ہیں۔ بیانیہ انداز میں لکھا گیا یہ ناول قاری کی دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔'' (ص:۲۸۵)

ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' (مشرف عالم ذوقی) کی موضوعاتی جہت پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر رضوانہ شمسی لکھتی ہیں:

''لے سانس بھی آہستہ' ایک صدی پر محیط ہے اور اس میں گلوبلائزیشن سے لے کر مارکیٹ اکانومی اور جاگیردارانہ نظام کی کمزور ہوتی ہوئی بنیادوں کو بھی دیکھا جاسکتا

ہے۔'' (۲۹۵)

احمد صغیر کے ناول کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر لیاقت نیر لکھتے ہیں کہ ''بہر حال احمد صغیر کے ناول 'آسماں سے آگے' میں جو رنگارنگی اور بھر پور تاثر ہے وہ اس کے معاصرین میں دکھائی نہیں دیتا۔تکنیک کی سطح پر بھی بیانیہ سے لے کر تمثیل نگاری تک جتنے تجربے انہوں نے کئے ہیں وہ ان کی فنکاری کا ثبوت ہے۔'' (۳۰۰)

کتاب میں جہاں پروفیسر اسلم جمشید پوری کے ایک اہم ناول ''دھنورا'' کا عمدہ جائزہ ڈاکٹر شاداب علیم نے لیا ہے۔ وہیں پروفیسر غضنفر کے ناول ''مانجھی'' کے اختصاصی جہات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد غالب نشتر نے شموئل احمد کے تین ناولوں ''ندی''،''مہاماری'' اور ''گرداب'' کا مربوط تجزیہ پیش کیا ہے۔ تینوں ناولوں کے فنی، تکنیکی اور موضوعاتی پہلوؤں پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔محمد حنیف خان کا تجزیہ ناول ''ایک خنجر پانی میں'' (پروفیسر خالد جاوید) بھی عمدہ ہے۔ناول سے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک خنجر پانی میں' اپنی جدید تکنیک' فنی خوبیوں اور خامیوں کی عصریت کو پیش کرنے میں کامیاب ہے۔'' (ص: ۵۲۲)

مجموعی طور پر کتاب ''اکیسویں صدی میں اردو ناول'' میں شامل مضامین اردو ناول کے عصری منظرنامے پر مفصل گفتگو کرتے نظر آتے ہیں اور اردو ناول کے سمت ورفتار کا ایک ادبی خاکہ پیش کرتے ہیں' جو کہ کتاب کی اہمیت کو بڑھا رہا ہے۔منظور احمد کی یہ ادبی کاوش قابل ستائش ہے اور چونکہ وہ خود بھی تحقیقی مراحل سے گزر رہے ہیں۔ اس لیے ان کا حسن انتخاب بھی کامیاب نظر آتا ہے۔پبلشر واشاعت: قاسمی کتب خانہ جموں...۲۰۲۲ء۔ قیمت: ۵۹۵۔

☆☆☆

(2)

نام کتاب : ادبی مطالعے
مصنف : ڈاکٹر ریحان حسن
مبصر : ڈاکٹر اشرف لون

ڈاکٹر ریحان حسن ادبی دنیا میں اب جانا پہچانا نام ہے۔انہوں نے کم مدت میں ادبی دنیا میں اپنی ایک منفرد شناخت بنائی ہے۔لیکن ایسا نہیں کہ وہ کسی جلد بازی میں ہیں بلکہ انہوں نے جس موضوع پر لکھا ہے بڑی عرق ریزی اور محنت سے لکھا ہے۔اس کتاب سے پہلے ان کی دو کتابیں بعنوان ''ممتاز مفتی : حیات اور ادبی خدمات'' اور ''تحقیق و تفہیم'' منظر عام پر آ چکی ہیں۔ان میں سے پہلی کتاب نے بڑے بڑے نقادوں و محققوں سے داد و تحسین حاصل کی ہے اور یقیناً ممتاز مفتی پر ان کا کام بڑا وقیع اور لائق تحسین ہے۔ یہاں میرا موضوع ڈاکٹر ریحان حسن کی کتاب ''ادبی مطالعے'' ہے جو ان کے مقالات پر مشتمل ہے جو انہوں نے مختلف مواقع پر لکھے ہیں۔

کتاب کے پہلے مضمون میں ڈاکٹر ریحان حسن نے میر کی انسان دوستی کو موضوع بنایا ہے۔اس مضمون میں مصنف نے میر کے کلام سے حوالہ دے کر ان کی انسان دوستی پر بات کی ہے۔مصنف نے میرؔ کے اشعار کو بطور حوالہ استعمال کیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

کعبہ پہنچا تو کیا ہوا اے شیخ
سعی کر ٹک پہنچ کسی دل تک

مصنف کے مطابق میرؔ کے نزدیک 'سچا انسان وہی ہے جس میں انسانیت ہو کیونکہ تمام مذاہب کی پہلی تعلیم انسانیت ہے۔

کتاب کا دوسرا باب ہے" غالب اور جنگ آزادی"۔اس مضمون میں ڈاکٹر ریحان نے ۱۸۵۷ء کے دوران میں غالب کی لکھی تحریروں بالخصوص ان کے خطوط اور 'دستنبو' کو موضوع بحث بنایا ہے۔مصنف کا ماننا ہے کہ غالب نے فطرت انسانی سے مجبور ہوکر ہندوستانیوں کے قتل کی حمایت اور انگریزوں کی خوشامد کی۔اوراس کی بڑی وجہ دراصل ان کے وظیفے کی بحالی تھی نہ کہ ان کی انگریزوں کے ساتھ محبت۔مصنف کے مطابق غالب کی ان تحریروں سے ہمیں تاریخ کا ایک اہم باب سمجھنے میں ہمیں مدد ملتی ہےاور ساتھ ہی غالب کی ان تحریروں نے اردو نثر کے ارتقا میں نمایاں رول ادا کیا۔

"غالب کی ایک معرکہ آرا غزل" میں مصنف نے غالب کی ایک غزل 'جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا' کا جس خوبصورتی سے تجزیہ کیا ہے اس سے ان کی تنقیدی صلاحیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ڈاکٹر ریحان نے نہ صرف اس غزل کے موضوع سے بحث کی بلکہ اس کا مطالعہ ہئیتی تنقید کے تناظر میں بھی کیا۔غالب کی غزل گوئی کے متعلق مصنف نے بجا فرمایا ہے:

"غالب کے کلام کی اصل خوبی حسن تخیل اور طرز ادا کی جدت اور انوکھا پن ہے جو ہمیں اکثر و بیشتر متعجب
کرنے پر قادر ہے۔"

"مراثی انیس و دبیر میں ذکر اطفال کربلا" بھی ایک اہم مضمون ہے۔مندرجہ ذیل شعر سے انیس کے زور کلام کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

کس عمر میں ہستی کا چمن چھوڑ رہے تھے
گودی کے پلے خاک پہ دم توڑ رہے تھے

مصنف نے بڑی دیدہ ریزی سے انیس و دبیر کے مرثیوں سے ذکر اطفال کربلا والے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ مصنف کا ماننا ہے کہ انیس و دبیر کو بچوں کی نفسیات پر غیر معمولی گرفت تھی اور یہ کہ جس خوبصورتی سے انسانی جذبات و کیفیات کو اپنے مرثیوں میں پیش کیا ہے اس کی مثال کسی دوسرے مرثیہ نگار کے یہاں ناپید ہے۔

زخموں سے چور چور ہے زہرا کا یادگار
جس چھاتی پر میں سوئی تھی اس پر ہے تو سوار

''انیسویں صدی کا مجدد سر سید احمد خان'' اس کتاب کا ایک اہم مضمون ہے جس میں مصنف نے سرسید کے قوم اور اردو ادب پر احسانات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ مصنف کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''بلاشبہ سرسید ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کے وہ پہلے مسیحا ہیں جنھوں نے مسلمانوں پر مصیبتیں نازل ہونے کے اسباب اور ان کے سدباب پر غور کیا۔'' اور یہ کہ سرسید نے نہ صرف اپنے مضامین سے مسلمانوں میں جدید تعلیم پر زور دیا بلکہ اس سلسلے میں عملی اقدام کر کے کالج اور متعدد انجمنیں بنائیں۔

''مولانا ابوالکلام آزاد کا پیغام امن و آتشی'' والے باب میں ڈاکٹر ریحان نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے مولانا کے یہاں کس طرح احترام آدم انسانیت ہر تحریر میں موجود ہے۔ اور یہ کہ مولانا نے اپنی تحریروں میں اسلام کو ہمیشہ بطور ایک امن و عدل پسند مذہب کے طور پر پیش کیا اور ہمیشہ ہندو مسلم بھائی چارے کی بات کی۔

''منٹو : منفرد افسانہ نگار'' والے باب میں ڈاکٹر ریحان حسن نے منٹو کے افسانوں کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا ہے۔ منٹو کا نہ صرف اردو بلکہ دنیائے ادب کے بڑے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے اور اپنے تجزیہ میں مصنف نے اس بات کو ثابت کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ لیکن مصنف کا یہ کہنا کہ 'منٹو کا اسلوب ان سے

نہ پہلے برتا گیا نہ ان کی وفات کے بعد' کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ ہر بڑا فنکار اپنا اسلوب اپنے ساتھ لاتا ہے اور ایک کامیاب اُسلوب کی نقل نہیں کی جاسکتی۔

''قرۃ العین حیدر اور جزئیات نگاری'' میں مصنف نے ناول کے حوالے سے عینی کی جزئیات نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ مصنف کا یہ کہنا بجا ہے کہ عینی کو جس طرح کا کمال منظر نگاری یا جزئیات نگاری میں حاصل ہے' اس کی نظیر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے'۔ مصنف نے ایک جگہ طوائف کے لیے 'بازاری عورت' کا لفظ استعمال کیا ہے جو کسی بھی صورت میں ٹھیک نہیں بالخصوص تانیثاؤں کے لیے یہ لفظ قطعی ناقابل قبول ہوسکتا ہے۔

''مجاز اور اردو شعرا'' والے باب میں ڈاکٹر ریحان حسن نے مجاز کے شاعرانہ مرتبے سے متعلق دیگر اردو شعرا کے تاثرات اور نظمیں نقل کی ہیں۔ ان شعرا میں جگر مراد آبادی، علی سردار جعفری، جوش ملیح آبادی، راہی معصوم رضا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مصنف کے نزدیک مجاز کی شاعری کی ایک بڑی خوبی یہ کہ انھوں نے زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور یہ کہ مجازؔ اپنی تمام بے اعتدالیوں کے باوجود تہذیب اور زبان کے معاملے میں بے حد محتاط رہے۔

''شکیل بدایونی: بحیثیت نعت گو'' بھی اس کتاب کا ایک اہم باب ہیں۔ شکیل بدایونی نے نظمیں اور غزلیں بھی لکھی ہیں لیکن آج شکیل بدایونی کو زیادہ تر لوگ بحیثیت ایک فلمی نغمہ نگار کے ہی جانتے ہیں لیکن ریحان حسن نے اس مضمون میں یہ ثابت کر کے دکھایا ہے کہ شکیل نے نہ صرف بہترین فلمی نغمے کہے ہیں بلکہ نعت گوئی میں بھی ان کا ایک اہم مقام ہے۔

وقف تھے قدسی ازل سے جن کی طاعت کے لیے
آئے ہیں وہ دنیا میں دنیا کی ہدایت کے لیے

اس کے علاوہ اس کتاب کے اہم مضامین میں 'مولانا آزاد کی صحافت، صاحب طرز صحافی! عرفان صدیقی، تجربات و حوادث کا شاعر ساحر لدھیانوی، پروفیسر محمد حسن کے تنقیدی نظریات، ریختی کل اور آج وغیرہ شامل ہیں، جن سے ڈاکٹر ریحان حسن کی تنقیدی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر ریحان حسن نے اس کتاب میں شاعری، صحافت، افسانہ وغیرہ جیسے مختلف موضوعات پر لکھ کر اپنے تنقیدی و تحقیقی شعور کا پتا دیا ہے لیکن شاعری، افسانہ وغیرہ کو مختلف ابواب میں تقسیم کرنا چاہیے تھا تاکہ مضامین میں ایک طرح کا ربط پیدا ہوجاتا۔ ڈاکٹر ریحان حسن اپنی ہر بات تحقیق کی روشنی میں کہتے ہیں اور اپنے دلائل کو مضبوطی عطا کرنے کے لیے بڑے نقادوں و مصنفوں کا حوالہ بھی بخوبی دیتے ہیں۔ وہ اپنی بات کو آسان زبان میں کہنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ امید قوی ہے کہ یہ کتاب اردو ادب کے بڑے ادیبوں و شاعروں پر نئے سرے سے غور کرنے کی ترغیب دے گی۔

☆☆☆

(3)

نام کتاب	:	نئی سحر (ناول)
مصنف	:	زینت فردوس
مبصر	:	ڈاکٹر محمد یاسین گنائی (پلوامہ، کشمیر)

جموں و کشمیر میں ناول نگاری پر تحقیق و تنقید کی شکل میں بہت کام ہو چکا ہے لیکن زینتؔ کے زیرِ نظر ناول کا ذکر کسی بھی محقق یا ناقد نے نہیں کیا ہے اور اس کی بڑی وجہ

ناول کی عدم دستیابی ہے۔ میرے پاس ناول کا جو نسخہ موجود ہے، وہ زینت کی بیٹی شگفتہ جی نے ذاتی لائبریری سے کچھ دنوں کے لئے فراہم کیا تھا۔ ایک طرف اس ناول کی اشاعت سوم کا تقاضہ ہے، تو دوسری طرف اس کی اہمیت کو اُجاگر کی ضرورت ہے۔ اسی چیز نے مجھے ناول پر چند کلمات لکھنے پر مجبور کیا۔

ناول کا آغاز اگر چہ بی اے کے رزلٹ سے ہوتا ہے جہاں اشوک کو پہلی پوزشن اور جمیلہ کو دوسری پوزشن حاصل ہوتی ہے اور یہی سلسلہ یونیورسٹی میں بھی جاری رہتا ہے۔ لیکن اصل کہانی زینب بیگم سے شروع ہوتی ہے جو الہ آباد کی رہنے والی ہوتی ہے لیکن ان کا نوکر لالچ میں آکر ان کے شوہر کا قتل کرتا ہے۔ جان بچانے کی خاطر زینب بیگم اپنی بیٹی جمیلہ کے ساتھ ہجرت کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ناول میں جمیلہ کے بچپن سے جوانی تک کا سفر جس شہر میں طے ہوتا ہے، ناول میں اس شہر کا ذکر نہیں ملتا ہے، البتہ کالج اور یونیورسٹی کے ماحول سے کچھ کچھ محسوس ہوتا ہے جیسے ہم جموں یونیورسٹی میں گھوم رہے ہوں۔ ناول کے زیادہ تر حصّے میں ممبی نظر آتا ہے۔ اشوک جیسا ہونہار اور نیک لڑکا اپنی دوست جمیلہ کی شادی اپنے دوست زاہد سے کراتا ہے۔ شادی کے بعد دونوں ممبی چلے جاتے ہیں جہاں زاہد کا باپ خالد حسین بھی رہتا ہے۔ زاہد کا خیال ہوتا ہے کہ ان کا والد تجارت میں خرد برد کرتا ہے جس کے سبب باپ بیٹے میں دوری ہوتی ہے، لیکن خالد حسین آخر کار زاہد سے ملنے آتا ہے جہاں ہونہار بہو کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ خوشی زیادہ دیر قائم نہیں رہتی ہے اور خالد حسین کا انتقال زاہد کی غیر موجودگی میں ہوتا ہے۔ زاہد اور ان کے والد کی کشمکش کو ایک ہی سین میں دکھایا گیا ہے اور اس دوران زاہد اپنے بل بوتے پر جمیلہ سے شادی کرتا ہے لیکن خالد حسین کا کردار ایک ساعت کا ہی سہی لیکن ان کے دل میں بیٹے کی محبت عشق کی انتہا تک ہوتی ہے۔ جمیلہ کے ہاں ایک خوبصورت بیٹی شکیلہ پیدا ہوتی ہے۔ شکیلہ کی سالگرہ کے موقع

پر اشوک بھی ممبی چلا آتا ہے اور یہاں زاہد اور جمیلہ کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ یہاں تک ناول میں صرف ہندو مسلم اتحاد دوستی کی حدتک دکھایا گیا ہے۔ایک کثیر مذہبی ملک میں اس قسم کی دوستی اور ہمدردی کے حوالے سے تمام مذاہب کے مفکرین نے زور دیا ہے۔گرونانک نے اپنے گرنتھوں میں جگہ جگہ قومی یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد اور انصاف کی تعلیم عام کی ہے اور ان کے ایک شعر میں جمیلہ اور مدن کے ہندو مسلم اتحاد کی بخوبی عکاسی ملتی ہے۔

اول اللہ نور آپائے قدرت دے سب بندے
ایک نور سے سب جگ ایجا کون بھلا کون مندے

یہ ناول ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ ساتھ احسانات چکانے کا ناول بھی نظر آتا ہے۔جمیلہ کی ماں نے ایک غریب اور یتیم بچے اشوک پر احسان کیا تھا اور اس کے بدلے اشوک نے جمیلہ کی شادی اپنے ہونہار دوست زاہد سے کروائی۔دونوں نے اس کے بدلے میں اب اشوک کی شادی ایک خوبصورت وخوب سیرت لڑکی رانی سے کروائی۔جس دن اشوک کو لڑکی والے دیکھنے آرہے تھے،عین اسی دن جمیلہ حادثے کا شکار ہوتی ہے۔حادثے کی اصل وجہ اشوک جیسے بھائی کی شادی میں خوشی کی انتہا نہ رہنا تھا اور جلدی جلدی کام کے سبب وہ پھسل جاتی ہے۔مصنفہ نے جمیلہ اور اشوک کو ہندو مسلم اتحاد کی دو آنکھوں کی شکل میں پیش کیا ہے اور یہ اتحاد ہندوستان کے لاکھوں ہندو مسلم،سکھ عیسائی بھائیوں اور بہنوں کے دلوں میں ملتا ہے۔یہ دو کردار پورے ملک کے اُن ہندو مسلم دوستوں کی عکاسی کرتے ہیں جو ملک کو مذہبی اختلافات سے نکال کر انسانیت کی تعلیم سے آگاہ کرتے ہیں۔

اس ناول میں ہندو مسلم اتحاد کی دونوں آنکھیں یعنی جمیلہ اور اشوک میں کسی بھی موڑ پر نفاق پیدا نہیں ہوتا ہے۔خیر جمیلہ کو اشوک اپنا خون دیتا ہے یوں ایک مسلمان

لڑکی کی رگوں میں ہندو لڑکے کا خون ڈوڑنے لگتا ہے اور زینتؔ بھی یہی پیغام دینا چاہتی ہے کہ انسانیت سب کو اپنا اپنا مذہب سکھاتی ہے اور انسانیت میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ ایک دوسرے کے مذہب سے نفرت کرو اور ایک دوسرے کے دشمن بنو۔ اشوک اور رانی کی شادی ہوتی ہے اور ان کے ہاں ایک بیٹا انوپ پیدا ہوتا ہے لیکن شادی کے کچھ ہی دن بعد سمندری موٹر کے حادثے میں دونوں جمیلہ اور زاہد کا انتقال ہوتا ہے۔ یوں اشوک کو بدلہ چکانے اور دیانت داری ثابت کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ نہ صرف ان کی بیٹی شکیلہ کی پرورش ناز ونعام سے کرتا ہے بلکہ ایک باپ کی طرح اس کی دولت کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ اب شکیلہ مسلم ہونے کے باوجود اشوک کے ساتھ ایک ہندو گھرانے میں رہتی ہے، جہاں ان کو پڑھانے کیلئے ایک مولوی صاحب کو رکھا جاتا ہے اور عبادت کیلئے ایک مسجد بنوائی جاتی ہے۔ یوں اشوک کا گھر ہندو مسلم اور سکھ تینوں مذاہب کی ایکتا کی زندہ مثال بنتا ہے

زیرِ نظر ناول میں ہندو مسلم اتحاد کی ایسی ایسی مثالیں پیش کی گئی ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ زینتؔ نے جگہ جگہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اتحاد کی تمام تر راہیں قوتِ برداشت میں مضمر ہیں۔ جب تک اور جہاں تک انسان قوت برداشت کا مظاہرہ کرتا رہے گا تب تک کامیابی اس کے دامن میں لکھی ہے۔ مسلمانوں کو حضورؐ کا واقعہ یاد کرنے کی ضرورت ہے جب مکہ کی غیر مسلم بوڑھی عورت روزانہ آپؐ پر گندگی پھینکتی تھی اور اس پر غصّہ کرنے کے بجائے حضورؐ اس کی تیمارداری کرنے جاتے ہیں ۔ یوں ایک کافر عورت کا دل حضورؐ کی قوت برداشت اور درسِ انسانیت کے سبب بدل جاتا ہے۔ آج اکیسویں صدی میں ہر انسان میں اس چیز کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ کہانی میں آگے کیا ہوتا ہے تو وقت گزرتا گیا اور شکیلہ کی شادی کی فکر نے اشوک اور رانی کو پریشان کردیا، کیونکہ ایک ہندو گھرانے میں پلنے والی لڑکی کو مسلم گھرانے

ہندو ہی ماننے لگتے ہیں۔لوگوں کو یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ اشوک کے گھر میں رہنے کے باوجود شکیلہ آج بھی ایک مسلم لڑکی ہی ہے۔اس قسم کی ذہنی کشمکش کو زینت فردوس نے یوں بیان کیا ہے:

''ہندو گھرانے میں پلی ہوئی لڑکی مسلمان کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ ناممکن ہے۔نہ نماز کا پتہ، نہ روزے کا علم، نہ ہی قرآنِ پاک سے روشناسی۔صرف کلمہ طیبہ پڑھنے سے تھوڑی ہی مسلمان ہوسکتی ہے۔اس لڑکی کو کون گھر میں لائے۔روزِ قیامت کو خدائے برتر کو ہم کون سا منہ دکھائیں گے؟ خدایا ہمیں معاف کرنا؟''۔(نئی سحر،ص:46)

اس قسم کے نظریات وخیالات اُن والدین کے ہیں، جو ہندو گھرانے میں پلی بڑی لڑکی کو آنکھ بند کر کے غیر مسلم قرار دینے کا فتویٰ لگاتے ہیں لیکن زینت نے ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔کیا مسلم گھرانوں میں پلنے والی بیٹیاں کلمہ طیبہ کے علاوہ کچھ اور جانتی ہیں؟ کیا ہمارے معاشرے میں بیٹیوں کو اسلامی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی انتظام ہے؟ کیا والدین اپنے بیٹیوں کے ساتھ ساتھ گھر کی خواتین کی اسلامی تعلیم میں جستجو کرتے ہیں؟اس قسم کے درجنوں سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ ہندو گھرانے میں مسلمان لڑکی کی تعلیم وتربیت ہونا، اُس ہندوستان کی عظمت کی دلیل ہے جہاں بقول سندیش تیواری ''باہمی تعاون اور مشترکہ ثقافت کا ایک اہم عنصر ہندو مسلم بھائی چارہ مانا جاتا ہے۔یہ ہندو مسلم اتحاد دراصل ہندوستانی ثقافت کی روح کے اختلاط اور اس ملاپ کے دوہرے عمل میں تشکیل دی گئی ہے۔یہ ثقافت کے مفاہمت کے تصور کا مرکزی نقطہ ہے۔(دی وائس، ہند مسلم اتحاد: ملک کی شناخت ہے،سندیش تیواری،کانپور)

اس مسئلے کا حل خود شکیلہ ہی نکالتی ہے اور اپنی پسند کے لڑکے جاوید کا ذکر ایک خط کے ذریعے کرتی ہیں۔دونوں عشق میں گرفتار ہوتے ہیں اور جلدی ہی دونوں کی شادی

ہوتی ہے۔دونوں نیلم سنیما میں ’’ہمارا دیش ہمارا گاؤں‘‘ نامی فلم دیکھتے ہیں اور اپنے دوستوں کو ہوٹل میں دعوت بھی دیتے ہیں۔ ہو

ہندو مسلم اتحاد پر ناول لکھتے وقت زینت کی حاضر دماغی فلم کے نام سے بھی عیاں ہوتی ہے اور اتحاد جیسے اہم موضوع پر ’’ہمارا دیش ہمارا گاؤں‘‘ سے اچھی کوئی فلم نہیں ہوسکتی تھی۔کیونکہ ملک کا دوتہائی (2/3) حصّہ گاؤں میں بستا ہے اور اصل ہندوستان کی روح گاؤں میں ہی بستی ہے۔اس نکتہ کو متعدد رہنمائے قوم نے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ شہروں میں جدید تعلیم اور تمام تر سہولیات ہونے کے باوجود انتشار اور فسادات زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں اور اس کے برعکس گاؤں میں سیدھی سادھی زندگی گزارنے والے لوگ ہندو مسلم اتحاد کو مذہب کا اولین فرض سمجھ کر نبھاتے ہیں۔

شکیلہ کی شادی کے کچھ ہی دنوں بعد اشوک کی بیوی رانی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے مگر زچگی کے دوران رانی کا انتقال ہوجاتا ہے یوں انوپ دنیا میں آتے ہی یتیم ہوجاتا ہے۔خون کا رشتہ اور خون کا احساس اس سین میں بھی دہرایا گیا ہے کیونکہ رانی کی جان بچانے کی خاطر شکیلہ خون دیتی ہے جس کی والدہ کی جان بچانے کی خاطر اشوک نے ایک بار خون دیا تھا۔اس ناول کا پلاٹ نہایت گھٹا ہوا ہے۔انوپ کو شکیلہ اور جاوید اپنے بچے کی طرح پالتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم کیلئے لندن بھیجا جاتا ہے۔انوپ لندن میں تعلیم کے بجائے عیاشی،شراب اور غوریوں کے جال میں پھنس جاتا ہے ۔ادھر شکیلہ کے ہاں شکیل پیدا ہوتا ہے لیکن انوپ کو شکیل سے پیدائشی نفرت ہوجاتی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان تینوں کو جائیداد کا قابض سمجھ رہا تھا۔لندن کی ہوا نے انوپ کو اس حد تک خراب کیا تھا کہ جب اشوک وہاں ملنے جاتا ہے تو ہوٹل میں ان کے ساتھ ایک لڑکی کو عریاں دیکھ کر پریشان ہوجاتا ہے کہ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ جب انوپ شراب کے نشے میں شکیل،جاوید اور شکیلہ کے خلاف بولتا ہے اور ان کے

الگ مذہب کی باتیں کرتا ہے تو اس پر اشوک مذہب پر یوں وضاحت دیتا ہے:

''مذہب کیا ہوتا ہے کبھی اس پر غور بھی کیا ہے کہ مذہب کسے کہتے ہیں۔آہ! میرے بیٹے کاش تم یہ سمجھتے کہ مذہب کس چیز کا نام ہے۔اگر تم دھیان دو تو میں کہوں گا کہ مذہب صرف انسانی اخلاق ہے، ہمدردی ہے، پیار ہے خلوص، محبت چاہت اور اُنس ہے۔جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے برتا جاتا ہے۔سب سے بڑا انسان انہی چیزوں کو سب سے زیادہ عمل میں لاتا ہے''۔(نئی سحر، ص:116)

انوپ ایک طرف بدمعاش ہوتا ہے اور اسی سبب جگہ جگہ جنسی لذت و تسکین کے واقعات ملتے ہیں۔لیکن ناول کی غرض وغایت کے حوالے سے انوپ کا کردار ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے والے اُن کرداروں جیسا ہے جو خود کو مصلح قوم بتاتے ہیں لیکن ان کا کام صرف ہندو مسلم اتحاد و اخلاص اور ملک کا امن چین خراب کرنا ہوتا ہے۔یہ نااتفاقی بڑھانے اور فسادات کی آگ بھڑکانے میں لگے رہتے ہیں اور انوپ بھی یہی کام کرتا ہے اور ہر موقع پر اشوک کے گھر میں قائم ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کو برباد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔انوپ کو راہ راست پر لانے کیلئے اشوک بڑھاپے کے باوجود بھی انوپ کی گرل فرنڈ کو ہوٹل میں جنسی تسکین سے آزماتا ہے۔لیکن اس کے باوجود بھی انوپ کے دل میں شکیلہ، جاوید اور شکیل کیلئے نفرت کم ہونے کا نام نہیں لیتی ہے۔ممی آنے کے بعد انوپ کی شادی لالہ کرشن داس کی بیٹی شیلا سے ہوتی ہے لیکن شادی کے باوجود انوپ بیوی کے بجائے آوارہ لڑکیوں اور شراب کے نشے میں دن رات گزارتا ہے۔نہ صرف بیوی کو مارتا رہتا ہے بلکہ گھر تک تارا بائی کو لاتا رہتا ہے۔جاوید بطور تحفہ فردوس مل انوپ کے نام کرتا ہے مگر چند ہی روز میں انوپ اس کو فروخت کرتا ہے۔سہاگ رات والی رات انوپ کے غائب رہنے کے غم میں ایک نونویلی دلہن کے جذبات یوں سامنے آتے ہیں:

’’میں آپ کی دھرپ پتنی ہوں۔آپ کی داسی۔۔آپ مجھ سے خفا ہیں پر کیوں؟ میں ہمیشہ خدمت کروں گی صرف خدمت۔‘‘ (نئی سحر،ص: 141)

ایک طرف انوپ کی حرکات وسکنات سے تمام گھر والے پریشان ہوتے ہیں،تو دوسری طرف شکیل بی اے میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرتا ہے۔وہ اشوک اور جاوید کے مشورے پر کاروبار میں دلچسپی لیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے کاروبار میں مثبت رجحان دیکھنے کو ملتا ہے اور تمام ملازم ومزدوران سے خوش رہتے ہیں۔دوسری طرف انوپ اس کے کام سے جل بُن کر شکیل کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بناتا ہے۔انوپ کے رویہ کو دیکھتے ہوئے شکیلہ، جاوید اور شکیل گھر سے چوری چوری نکل جاتے ہیں اور تمام جائیداد اپنی مرضی سے انوپ کے نام کرتے ہیں۔اشوک گھر کے حالات، بہو کے زخمی بدن اور انوپ کی جہالت سے تڑپ اُٹھتا ہے۔ناول کا اختتام اگرچہ آسمانی آفت کی شکل میں ہوتا ہے اور ایسا بیا نک واقعہ ہی انوپ کو راہ راست پر لاسکتا تھا۔انوپ ہوٹل میں تارا بائی سے عشق لڑا رہا تھا کہ بجلی کی زوردار کڑک سے وہ جل کر راکھ بن جاتی ہے۔اور انوپ بھاگتے بھاگتے گھر پہنچ جاتا ہے اور اس حادثے سے اس کی آنکھیں کھل جاتی ہے۔جب اشوک شکیلہ کی جدائی میں حد درجہ بیمار ہوتا ہے تو مجبوراً اخبارات، ریڈیو اور دیگر ذرائع کی مدد سے تینوں کی تلاش شروع ہوتی ہے۔آخر کار سب لوگ بھاگتے بھاگتے اشوک کے پاس پہنچ جاتے ہیں لیکن اشوک کا بچنا ناممکن ہو چکا تھا اور آخر پر اشوک ہندو مسلم اور سکھ اتحاد و بھائی چارے پر خوبصورت الفاظ میں نصیحت کرتا ہے:

’’بیٹی شکیلہ تم تلات کرو‘۔۔۔شیلا کہاں ہے؟‘‘ شیلا ادھر بابا آپ کے چرنوں میں‘‘ شیلا نے جواباً کہا۔نہیں تم چرنوں کے نہیں آنکھوں پر بٹھانے کے قابل ہو۔۔مجھے۔۔معاف۔۔۔کرنا‘‘’’میرا وقت پورا ہورہا ہے۔‘‘’’جلدی کرو بیٹی

پارٹ پڑھو۔''شیر سنگھ!''ہاتھ دو۔۔یار۔۔ہاں ٹھیک۔۔۔ہے''۔۔واہے گرو کہو۔۔بچوں کا۔۔خیال۔۔رکھنا۔۔''

(نئی سحر،ص:185)

اس ناول کو خاندانی ناول یا کرداری ناول نہیں کہہ سکتے مگر پوری کہانی ایک ہی گھر کے اندر مکمل ہوتی ہے، جہاں تمام کردار ہندو مسلم اور سکھ بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔میری رائے میں اس کو علامتی ناول کہنا بجا ہے کیونکہ اس میں اشوک، جمیلہ،شکیلہ،شیر سنگھ،انوپ وغیرہ مختلف مذاہب کی علامتیں معلوم ہوتی ہیں۔ناول میں ہندو مسلم اور سکھ تینوں مذاہب کے کردار نظر آتے ہیں جن میں ''خالہ جان یعنی جمیلہ کی ماں

(زینب بیگم)،اشوک اس ناول کا مرکزی کردار ہے،جس کی پرورش جمیلہ کی ماں کرتی ہے اور ہندو ہونے کے باوجود بھی اس کو اپنے بیٹے جیسا پیار ملتا ہے۔بدلے میں اشوک ایک باشعور و باضمیر انسان کی طرح جمیلہ کو بہن کی طرح سمجھتا ہے اور اس کی شادی کی فکر میں پریشان رہتا ہے۔اشوک اپنے جگری دوست زاہد کے ساتھ جمیلہ کی شادی کرتا ہے اور دونوں خوشی خوشی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔

ضمنی کرداروں میں کالج کا طالب علم اسلم بھی نظر آتا ہے۔زاہد کے والد خالد حسین کا کردار صرف ایک سین میں نظر آتا ہے۔جمیلہ اور زاہد کی بیٹی شکیلہ ہوتی ہے جس کو سب پیار سے روبی بلاتے ہیں۔اشوک کی بیوی رانی اور ان کا بیٹا انوپ بھی ناول کے اہم کردار ہوتے ہیں۔بلکہ انوپ ناول کے آخری حصہ میں ایک ویلن کا کردار ادا کرتا ہے۔جمیلہ کی بیٹی شکیلہ کی شادی جاوید سے ہوتی ہے دونوں نیک دل اور محنتی انسان ہوتے ہیں، دونوں خوشی خوشی اشوک کے ساتھ رہتے ہیں اور مل کر یتیم بچے انوپ کی پرورش کرتے ہیں۔لندن میں انوپ کی گرل فرنڈ روزی ایک فحاش اور

بازاروں لڑکی کا کردار ادا کرتی ہے، جو پیسوں کے خاطر پہلے انوپ اور پھر اشوک کو اپنی ہوس کا شکار بناتی ہے۔شکیلہ اور جاوید کا بیٹا شکیل ایک ہونہار اور نرم مزاج شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔مزدوروں اور گھر کے افراد کے ساتھ ان کا اُٹھنا بیٹھنا قارئین کو ضرور متاثر کرتا ہے۔انوپ کی بیوی شیلا ایک ایسی بیوی کا کردار ادا کرتی ہے کہ اس پر کتنے بھی مظالم کیے جائیں لیکن شوہر کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔ایک ہمدرد دوست کے روپ میں شیر سنگھ کا کردار ملتا ہے اور اشوک اپنے غم ان سے بانٹنے ضرور جاتا ہے۔ان کرداروں کے ساتھ کچھ نوکر چاکر بھی اپنا ضمنی کردار ادا کرتے ہیں۔یوں کردار نگاری کے لحاظ سے ایک کامیاب ناول نظر آتا ہے اور ہر کردار متحرک نظر آتا ہے۔ناول کو مکالمہ نگاری کے لحاظ سے بھی ایک کامیاب ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔زینت نے معیاری زبان کا استعمال کیا ہے اور جگہ جگہ اشوک اور جمیلہ، اشوک اور خالہ، اشوک اور زاہد، زاہد اور جمیلہ، اشوک اور رانی، اشوک اور شکیلہ، شکیلہ اور جاوید، اشوک اور شیر سنگھ، اشوک اور انوپ، شکیل اور انوپ کے درمیان خوبصورت الفاظ میں مکالمے پیش کئے ہیں اور یہ گفتگو جذبات واحساسات کے ساتھ سنجیدگی اور نصیحت سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔

ناول ''نئی سحر'' میں جگہ جگہ منظر نگاری کے منفرد ودلکش نمونے ملتے ہیں۔کالج کا ماحول ہو یا ہوٹل میں عیاشی کا منظر، اشوک اور شیلا کا خوبصورت قدرتی مناظر کو ملول آنکھوں سے دیکھنا ہو یا، زاہد اور جمیلہ کا پانی میں بوٹ کی سواری کرنا ہو یا شادی کی تیاری میں ممی کے ماحول کی جھلک ہو یا شہزادوں اور شہزادیوں کی سالگرہ کے وقت تیاریوں کے مناظر ہو۔تمام مناظر قارئین کو اپنی طرف کھینچتے چلے جاتے ہیں۔اشوک کا کردار سیکولر ہندوستان کی ایک زندہ مثال ہے اور اس ناول میں ہندو مسلم ایک خاندان کی طرح رہتے ہیں اور اس کا ایک منظر مصنفہ نے یوں بیان کیا ہے:

''صبح شکیلہ قرآن شریف کی تلاوت کررہی تھی۔شیلا اپنے کمرے میں رامائن کا پاٹ کررہی تھی، برآمدے میں اشوک خاموش اور اُمید کے ساتھ دونوں آوازیں سن رہا تھا۔اس کے چہرے پر شفق کھل رہی تھی۔۔۔اشوک جب بھی یہ دونوں آوازیں سنتا جیسے وہ دنیا میں جنت کی بہاریں دیکھا کرتا۔وہ آنکھیں بند کئے ہوئے دل ہی دل میں ناچ اُٹھتا کہ اس کے ایک ہی آنگن میں دو مقدس آوازوں کا سنگم ہورہا ہے۔''(نئ سحر،ص:164)

اس ناول میں آزادی کے بعد کا ہندوستان دکھایا گیا ہے اورالہ آباد جس کو ہندو مسلم بھائی چارے کا سنگم مانا جاتا ہے، وہ شہر اس ناول کے ابتدائی حصّہ میں نظر آتا ہے۔ناول کے کچھ حصّے میں لندن کی آب وہوا کا ذکر بھی ملتا ہے۔مشرقی ومغربی تہذیب کا تصادم بھی دکھایا گیا ہے لیکن ناول کا اصل مکاں ممبی یعنی خوابوں کا شہر نظر آتا ہے جہاں جمیلہ اور زاہد، اشوک اور رانی ،شکیلہ اور جاوید، انوپ اور شیلا رہتے ہیں۔

چونکہ ''نئ سحر'' زینت کا پہلا ناول ہے،لہٰذا اس ناول میں زبان وبیان کی غلطیاں خوب ملتی ہیں اور املا کی غلطیاں بھی خوب ہیں۔ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ زینت فردوس کشمیر کے مقابلے میں دبستان لکھنو کے قلمکاروں سے متاثر رہی ہے اور اسی وجہ ہے عشق وعاشقی کے تذکروں میں بے حیائی وعریانی کا کھل کا ذکر کیا ہے۔

زینت کا ناول ''نئ سحر'' ہندو مسلم اتحاد اور سیکولر ہندوستان کی عکاسی کے لحاظ سے ایک عمدہ ناول ہے۔اس میں زیادہ تر کردار جوڑیوں کی شکل میں ملتے ہیں اور وہ زبان اپنی اپنی اوقات کے مطابق ہی استعمال کرتے ہیں۔مصنفہ کا مقصد قارئین کو باور کرنا تھا کہ انسان اپنے اپنے مذہب کو اپنانے کے باوجود بھی ، دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ خوشی خوشی رہ سکتا ہے۔تمام مذاہب کا پیغام انسانیت کی بقا ہے اور کوئی

بھی مذہب لڑائی اور فتنہ وفساد کو عام کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ الغرض اس ناول کو پڑھنا چاہیے اور مصنفہ کے مدعا ومقصد تک پہنچے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن دو اشاعتوں کے باوجود بھی ناول بازار اور لائبریریوں سے غائب ہو چکا ہے۔ زینت کی بیٹی شگفتہ اپنی والدہ کی تمام تصانیف کو اشاعت نو کیلئے کوشاں نظر آتی ہیں لیکن کسی ادارے یا ناشر کی مالی مدد کے سبب ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔

یہ ناول 185 صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت محض 200 روپے ہے اور اردو بک سوسائٹی، نئی دہلی نے شائع کیا تھا۔

☆☆☆